رئیس احمد جعفری

شخصی خاکوں کا مجموعہ

رئیس احمد جعفری

رئیس احمد جعفری اکیڈمی

کراچی

اشاعت ثانی ۱۹۸۷ء
اشاعت اول ۱۹۴۸ء
کتابت مظفر گجراتی
سرورق بشیر موجد
مطبع عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد نمبر ۱۔ کراچی
قیمت Rs. 125/-

رئیس احمد جعفری اکیڈمی
ای۔۵ معمار ٹیرس
گلشن اقبال ۱۔ کراچی

انتساب

چشمِ بصیرت کے نام

دید و شنید

جنھیں میں نے دیکھا
جن سے میں ملا
جن کو میں نے پرکھا

فہرست مضامین

(۱) مجاہدین صف شکن

بہ ترتیب حروف تہجی

(۲) علمائے کرام

(۳) صوفیۂ عظام

(۴) رہنمایانِ ملّت

(۵) کانگرس کے عہد و معبود

(۶) کمیونسٹ پارٹی کے رہنما

(۷) اربابِ آئین و قانون

(۸) ماہرینِ تعلیمات

(۹) اصحابِ ادب

(۱۰) شعرائے عصر

(۱۱) حکمائے حاذق

(۱۲) ممالکِ غیر کے سفراء

(۱۳) اُمرائے ذی وقار

(۱۴) کھلنڈرے

(۱۵) دخترانِ ملّت

حرفے چند

میرے والد مرحوم مولانا رئیس احمد جعفری کا انتقال ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا
یہ ایسا سانحہ تھا جس نے ہمارے خاندان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہم سب بھائی بہن
اتنے کم سن تھے کہ ہمارے لیے اس سانحے کی سنگینی کا اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہماری
والدہ محترمہ (بیگم آفتاب جعفری) نے اس صورت حال کا جس ثابت قدمی سے مقابلہ کیا،
اس کی مثالیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ انھوں نے ہم بھائی بہنوں کی تعلیم و
تربیت کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ ہم نے کبھی یہ محسوس نہ کیا کہ ہمارے سروں سے
ہمارے والد کا مہربان سایہ اُٹھ گیا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ اٹھارہ برسوں
میں ایک لمحے کے لیے بھی مولانا رئیس احمد جعفری ہم سے جدا نہیں ہوئے۔

والدہ محترمہ نے ایک طرف تو ہم بچوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور دوسری طرف
اپنے نامور شوہر کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لیے رئیس احمد جعفری اکیڈیمی قائم کی
جس کی وہ تاحیات صدر نشین ہیں۔ اس اکیڈیمی کے خاص خاص مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- مولانا جعفری مرحوم کی تصانیف کو عام ناشروں کے استحصال سے بچایا
جائے جو بلا اجازت، غیر قانونی طور پر ان کتابوں کو شائع کر رہے ہیں۔

۲- مولانا کی تصانیف کے نئے ایڈیشن شائع کیے جائیں۔

۳- مولانا کی غیر مدون تحریریں، خصوصاً اخبارات و رسائل میں شائع شدہ
مقالات کو کتابی صورت میں منظر عام پر لایا جائے۔

۴- مولانا کی ایک جامع سوانح عمری شائع کی جائے۔

۵۔ مولانا کے علمی و ادبی کاموں کا مبسوط جائزہ شائع کیا جائے۔

۶۔ مولانا کی یاد میں ایک اعلیٰ درجے کی ریسرچ لائبریری قائم کی جائے۔

۷۔ ہر سال مولانا کی برسی کے موقع پر ایک علمی سیمینار منعقد کیا جائے۔

۸۔ مولانا کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ صورت میں بعض ناشرین کے پاس موجود ہیں، انھیں حاصل کر کے شائع کیا جائے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے والدہ محترمہ نے سترہ سال قبل ہی کام شروع کر دیا تھا۔ مندرجہ ذیل دو کتابیں بہت پہلے شائع کی جا چکی ہیں:

۱۔ رئیس احمد جعفری ۔ شخصیت اور فن

۲۔ کاروانِ گم گشتہ

اول الذکر کتاب برصغیر کے نامور علماء اور ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ ہے جو مولانا رئیس احمد جعفری کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ دوسری کتاب میں تحریک پاکستان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ مولانا اس تحریک کے عینی شاہد تھے، اس لیے انھوں نے اپنی یادوں اور یادداشتوں کے سہارے ایک بے مثال تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب کے مختلف اجزا اخباروں میں شائع ہوئے تھے جنھیں والدہ محترمہ نے مرتب کیا۔ پہلی کتاب بھی انھیں کی مرتبہ ہے۔

گزشتہ دو برسوں سے اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مولانا کی برسی کے موقع پر ایک علمی اجلاس منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ان جلسوں کی مناسبت سے ایک علمی مجلہ بیادگار رئیس احمد جعفری شائع کیا جاتا ہے۔ اب تک اس نوعیت کے دو مجلے شائع کیے جا چکے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اکیڈمی کی طرف سے مولانا کی تصانیف کی رفتارِ اشاعت بہت سست رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے وسائل محدود تھے۔ دوسرے یہ کہ والدہ محترمہ تنہا یہ کام انجام دے رہی تھیں۔ اب میں خدا کے فضل سے اُن کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوں۔ اس لیے

توقع ہے کہ یہ کام آگے بڑھے گا۔

زیرِ نظر کتاب "دید و شنید" اکیڈمی کی تیسری پیشکش ہے۔ یہ کتاب، ادبی حلقوں میں مانگ کے باوجود، ایک عرصے سے نایاب تھی۔ یہ نہ صرف مولانا کے باغ و بہار اسلوب کی نمایندگی کرتی ہے، بلکہ اردو کی اُن چند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جنھیں شخصی خاکہ نگاری کا سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بظاہر تو ایک سو آٹھ اہم شخصیات کا تذکرہ ہے، لیکن دراصل یہ ایک عہد کی تہذیبی، سیاسی اور علمی و ادبی تاریخ ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب کے لیے میری فرمائش پر فاضلانہ دیباچہ لکھا ہے، جس کے لیے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

یکم جنوری ۱۹۸۷ء رفیع احمد جعفری

ڈاکٹر تحسین فراقی

دیباچہ

رئیس احمد جعفری علم و ادب کے خارزار کے بے تکان راہی تھے۔ اُردو ادب میں ان جیسے کثیر التحریر بزرگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پھر ان کی تحریروں کا تنوع بھی حیران کُن ہے۔ سوانح نگاری، شخصیہ نگاری، تاریخ نگاری، ترجمہ، ناول، اقبالیات اور متعدد دیگر موضوعات پر ان کا قلم رواں رہا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی باضابطہ تصنیف "سیرتِ محمد علی" کے ذریعے عبدالماجد دریا بادی جیسے ادیبِ شہیر کو حیرت زدہ کر دیا اور اس کے بعد تو وہ شاہراہِ ادب پر اس طرح رواں ہوئے کہ اُنھیں اپنے نقوشِ کفِ پا کو دیکھنے کی فرصت بھی کم ہی مل پائی۔ ع

سر افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا!

"سیرتِ محمد علی" جہاں ایک طرف اعلیٰ اقدار سے ان کے لگاؤ اور جذبۂ ملی سے ان کے انسلاک کی گواہی دیتی ہے وہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آغازِ تصنیف ہی سے سیرت و سوانح رئیس احمد جعفری کا موضوعِ خاص تھا اور اس موضوع سے انھیں مناسبتِ طبعی تھی یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں بھی اُنھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، طویل اور مختصر دونوں طرح کی تصانیف۔ مختصر تصانیف میں "دید و شنید" قابلِ ذکر ہے۔ روایت ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی "دامانِ باغباں" کے نام سے رئیس نے مرتب کر کے کسی ناشر کے حوالے کر دیا تھا مگر وہ بوجوہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔

"دید و شنید" میں جعفری صاحب نے ایک سو آٹھ شخصیتوں کے طویل و مختصر خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں بھی حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ ان میں مجاہدینِ صف شکن بھی ہیں اور ان کے دوش بدوش علمائے کرام، صوفیے عظام اور

رہنمایان ملت بھی ہیں، یہیں کانگریس کے عبد اور معبود بھی مل جائیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی کے رہنما بھی اپنا رجز بلند کرتے ہوئے سنے جا سکیں گے، ارباب قانون و تعلیمات بھی قانون اور علم کی گتھیاں سلجھاتے نظر آئیں گے۔ ادیب اور شاعر بھی مجلس آرا ملیں گے۔ حکمائے حاذق، سفرائے ممالک غیر اور امرائے ذی وقار اپنی حماقت، سفارت اور امارت کے جوہر دکھاتے ہوئے نظر پڑیں گے اور یہیں کچھ کھنڈرسے اور کچھ دختران ملت اپنے الگ الگ دائروں میں سامان نشاط کرتے اور عبرت زائی کرتے دکھائی دیں گے۔ اشخاص و افراد کے اس منضبط ہجوم میں قاری کہیں گم نہیں ہوتا بلکہ ایک نئی پہچان سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت اتنی قدیم نہیں۔ اس کا ابتدائی سراغ تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن تذکروں کا ضرورت سے زیادہ اختصار شخصیات کی واضح تصویر کاری میں حائل ہوتا ہے۔ ہاں اس ضمن میں پہلا اجتہادی کارنامہ آزاد کی "آب حیات" ہے جس میں شعرا و ادبا کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے مرقعے جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان سے ان کے اخلاق و عادات اور اعمال و معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی رقابتوں، چشمکوں، صحبتوں، نفرتوں، معرکوں، مجادلوں اور متعدد دیگر باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ مرقع آرائی اور سراپا نگاری میں آزاد کا قلم بہت رواں نظر آتا ہے۔ اسی سراپا نگاری سے بعد کے لکھنے والے (خاکہ نگار) متاثر ہوئے چنانچہ اس ضمن میں خصوصیت سے فرحت اللہ بیگ، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور رئیس احمد جعفری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس تمام متحرک تصویر آرائی کے باوجود آزاد ایک تو کہیں کہیں پابند تعصب ہو گئے اور دوسرے ان جیتی جاگتی تصویروں کے باطن میں نہ اتر سکے لیکن چونکہ آب حیات اردو شعرا کی تاریخ ہے اس لیے آزاد پر میرا اعتراض ہلکا ہو جاتا ہے۔

باقاعدہ خاکہ نگاری کے باب میں مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" اور رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مولوی عبدالحق صف اول کے [illegible] ہیں جہاں ان کا [illegible] میں [illegible] نام [illegible] اور [illegible] کے [illegible] کا تذکرہ بھی کیا ہے [illegible]

میں نمایاں نظر آتے ہیں اور مولوی صاحب کا موقف ہے کہ نیکی، خیر اور شرافت
کسی ایک دین یا دھرم کی جاگیر نہیں۔ خاکہ نگاری کی ایک کڑی شرط یعنی غیر جانبداری
کا پاس مولوی عبدالحق یوں تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن ایک آدھ مقام پر وہ غیر جانبدار
نہیں رہ سکے چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کے ضمن میں ان کے خاکے میں تعصب کی زیریں
لہر نظر آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پھر مولوی عبدالحق بعض جگہ مواعظ و نصائح کا دفتر
بھی کھول دیتے ہیں جس سے خاکے کی تاثیر میں کمی آجاتی ہے۔

رشید احمد صدیقی زندگی اور زمانے کے بارے میں ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے
تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا ان کی تحریروں کا خاص جوہر تھا۔ خاکہ نگاری کرتے
ہوئے وہ شخصیت کے باطن میں اترتے اور اسے اپنا اور قاری کا ہم راز بناتے
ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار ان کے ایمان کا حصہ ہیں اس لیے وہ شخصیہ نگاری کے لیے
ایسی ہی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جو اعلیٰ اخلاق اور فضائل کا نمونہ ہوں اور
زندگی کو بامعنی اور بامراد بنانے کا ہنر جانتی ہوں۔ دل دردمند اور نگاہ پرسوز
نے ان کے خاکوں میں گہرائی پیدا کی ہے اور شگفتگی اور ظرافت کے چھینٹوں نے
انھیں تر و تازہ بنایا ہے۔

خاکہ نگاری میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی ایسی شخصیات
رئیس احمد جعفری کی پیش رو کہی جاسکتی ہیں۔ جبکہ ان کے معاصر خاکہ نگاروں میں
اشرف صبوحی، سالک، چراغ حسن حسرت اور عصمت چغتائی اور نسبتاً بعد کے
اہم خاکہ نگاروں میں منٹو، شاہد احمد دہلوی اور شوکت تھانوی وغیرہ کے نام قابل ذکر
ہیں۔ عصمت نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ "دوزخی" کے نام سے لکھ کر اردو
خاکہ نگاری کو صاف گوئی اور تحلیل نفسی کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا جبکہ منٹو
نے بعض شخصیات (مثلاً باری علیگ) وغیرہ کے تہ در تہ اسرار کو کھولنے کی کوشش کی
اور تجسس انگیزی کے اپنے مخصوص افسانوی پیرایے کو یہاں بھی کامیابی سے برتا۔
اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی کے خاکے دلی کی تہذیب کے چلتے پھرتے مرقعوں
کو خوبی سے نمایاں کرتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے نہ صرف "اجڑا دیار" کے آخر میں
"شاہجہانی دیگ" کی کھرچن کے نام سے بعض زندہ اور متحرک شخصیتوں کے نہایت

اجمالی خاکے رقم کیے بلکہ "گنجینۂ گوہر" میں نسبتہً مفصل خاکوں کی ایک نئی دنیا آباد کی اور تحلیل نفسی، سراپا نگاری اور سحرکار اسلوب کے تال میل سے ایک ایسا انداز نکالا جو ان کی بعد کی کتاب "بزم خوش نفساں" میں بھی پوری شان سے ظہور کرتا ہے ۔۔۔

شوکت تھانوی کے متعدد اور متنوّع خاکے مصنّف کی شگفتہ فضا بندی کا ایک عمدہ "شیش محل" تیار کرتے ہیں اور قامت اور قیمت دونوں اعتبار سے لائقِ توجہ ہیں

ماضی قریب میں جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کی صنف کو باثروت کیا ہے ان میں محمد طفیل، شورش کاشمیری، محی الدین قادری زور، ضیاالدین برنی، عبدالماجد دریابادی، ماہرالقادری، علی جواد زیدی اور ضمیر جعفری قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی کتابوں میں عمدہ خاکہ نگاری کے بیشتر عناصر موجود ہیں۔ حال کے خاکہ نگاروں میں سید ابوالحسن ندوی (پرانے چراغ)، نصراللہ خاں (کیا قافلہ جاتا ہے)، رحیم گل (پورٹریٹ) قرۃ العین حیدر (پکچر گیلری)، ممتاز مفتی (اوکھے لوگ)، احمد بشیر، گلزار وفا چودھری اور عطاالحق قاسمی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ ان خاکہ نگاروں کے یہاں طویل و مختصر دونوں طرح کے خاکے ہیں۔ بعض کے یہاں تاریخ و سیرت کے عناصر غالب ہیں اور شخصیت کے پہلو ذرا دب گئے ہیں اور بعض شخصیتوں پر لکھنے والوں کی اپنی شخصیت کسی قدر غالب آگئی ہے۔ پھر ان لکھنے والوں کے اسالیب بیان بھی منفرد ہیں۔ کسی کے یہاں جذباتی لہجہ غالب ہے کسی کے یہاں خطابیاتی، کسی کے یہاں سنجیدہ تو کسی کے یہاں رقت آفریں جبکہ بعض کے یہاں ظریفانہ و مزاحیہ، لیکن ان سب کے یہاں شخصیات کی تفہیم کے در وا ہوتے ہیں۔

کامیاب خاکہ نگاری کے لیے چند بنیادی شرائط ہیں مثلاً لکھنے والا حکیمانہ نگاہ رکھتا ہو، مسلسل اور دقیق مشاہدے کی ہمت اور میلان رکھتا ہو شخصیتوں کے انسانی پہلو نمایاں کرنے کو عیب نہ سمجھتا ہو، صداقت نگاری، صاف بیانی، فضابندی اور سراپا نگاری کا سلیقہ رکھتا ہو اور بات اختصار سے مگر شگفتہ اسلوب میں کہنے پر قادر ہو شخصیہ نگاری چاول پر مکمل ھو اللہ لکھنے کا فن نہ سہی لیکن لمبے چوڑے سقف گیر کینوس کے بجائے مغل مینا تور کا فن ضرور ہے۔ ریاضیاتی ایجاز اور شگفتہ اسلوب تحریر اس کے بنیادی خصائص ہیں۔ کامیاب خاکے کا طرۂ کمال یہ ہے کہ وہ شخصیت زیرِ تحریر کی کلید بن جاتے۔

ان معروضات کی روشنی میں جب ہم رئیس احمد جعفری کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ خاکہ نگاری سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں شخصیات کا جس قدر تنوّع اور پھیلاؤ ملتا ہے، اس کی صرف دو اور مثالیں ہیں۔ ایک مولانا عبدالماجد دریابادی اور دوسرے شوکت تھانوی جن کے خاکوں میں بھی ایسا ہی ہفت رنگ منظر نامہ مرتّب و مزیّن ملتا ہے۔ "دید و شنید" کا عنوان بذاتِ خود بتاتا ہے کہ مصنّف نے اس کتاب میں ایسی شخصیات پر گفتگو کی ہے جن کے بارے میں اس نے محض سُنا ہی نہیں بلکہ انھیں دیکھا بھی ہے۔ چنانچہ یہاں شنیدہ اور دیدہ کے تاثرات باہم آمیز ہوکر ایک ایسی کتاب کی شکل میں مدون ہوئے ہیں جو توازن سے ہمکنار اور تعصّب سے بہت حد تک پاک ہے۔ رئیس نے "نظرے خوش گزرے" کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> "مجھے کسی سے عناد نہیں لیکن اظہارِ تاثرات کے وقت میں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی ہے کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا شیفتگی پر؟ لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں، میں نے وہی کیا اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے۔ سچ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خوشگوار ہو۔ کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ بھی آجاتی ہے۔ ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو کہیں تلخ لیکن میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ سچ کے حدود کے باہر نہ نکلنے پائے۔"

"دید و شنید" میں رئیس احمد جعفری نے یا تو صرف انھیں شخصیات کو شامل کیا ہے جو برِّصغیر میں کوئی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی تھیں یا پھر ان لوگوں کو جو بوجوہ اتنے معروف و مشہور تو نہیں تھے لیکن سیرت و شخصیت کے اعتبار سے عظیم لوگوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھے یا جنھوں نے ایسی زندگی اختیار کر رکھی تھی جو لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتنا تھی۔ گویا مصنّف کے پیشِ نظر محض چند شخصیات کو ایک مخصوص شگفتہ یا مزاحیہ لہجے میں پیش کر کے گرمیِ محفل کا سامان کرنا مقصود نہ تھا بلکہ ان شخصیّات کے حوالے سے اعلیٰ انسانی اقدار اور فضائل و فیوض کو عام کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ زیرِ نظر اوراق میں سادگی، بے نفسی، بوریا نشینی،

دیانتداری، اسلامیت، للہیت، شائستگی، منفرد خیالی، ایمان، آگہی، استقلال، پامردی، حلم، حوصلہ، ہمت، تدبر، توازن اور فکر و فرزانگی کی ارفع اقدار و قائع اور یادداشتوں کے سیاق و سباق میں اس خوبی سے اُجاگر ہوتی ہیں کہ ان اقدار کے حامل بزرگوں سے ملنے، معانقہ کرنے اور صفاتِ ثابتہ کو اپنانے اور اپنی شخصیت کا حصہ بنا لینے کو جی چاہتا ہے۔ پھر انھیں اوراق میں حیرت، عبرت اور آشوب کے منظرناموں کی بھی کمی نہیں۔ ان میں ایسی شخصیات کا بھی تذکرہ ہے جو ہلال کی صورت افقِ آگہی پر جلوہ گر ہوئے تھے لیکن اعلیٰ اقدار پر مسلسل عمل اور عظیم مقاصد کی مسلسل پاسداری کے باعث جلد ہی بدرِ کامل بن گئے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو ماہِ چہاردہم تھے یا سمجھے جاتے تھے، لیکن امتحان اور آزمائش کی ایک آنچ کی تاب بھی نہ لا سکے اور بالآخر ان کی شخصیت کا ہیرہ ہوکر ایک ایسی قوس اور کمان کی صورت میں بدل گئی جس کی قسمت میں دائرہ بننا نہیں ہوتا۔

زہد نے اتنی "ترقی" کی کہ عصیاں ہو گیا

خاکوں کے اس مختلف الالوان منظرنامے میں ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن سے رئیس کا رشتہ یارانہ باشی اور قلبی تعلق کا تھا جبکہ بعض سے ان کے مراسم محض چلتے ہوئے تھے اور بعض سے محض صاحب سلامت یا ایک، آدھ ملاقات ہی۔ تناسب سے رئیس نے ان پرکھا اور انھیں جاننا اور جاننے کا موقع قاری کو فراہم کیا ہے۔

رئیس احمد جعفری کی اپنی شخصیت چونکہ بالیدہ و بزرگ تھی اس لیے زیرِ نظر شخصیات میں سے کسی ایک کے بیان میں بھی ان کی اپنی شخصیت دبتی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے بڑے اعتماد اور پوری صاف گوئی سے شخصیات کے ضمن میں اپنے تاثرات رقم کیے ہیں، اور کہیں اپنے قلم کو موج نہیں آنے دی۔ ان اوراق میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں جعفری صاحب شخصیتِ زیرِ بحث کے قائل ہوکر اس کے بارے میں اپنے پہلے سے قائم کردہ تاثر سے دستبردار ہوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ شخصیت زیرِ نظر کے بارے میں اپنے سابقہ تاثر کو بے کم و کاست رقم کرنے سے ہرگز نہیں ہچکچاتے۔ اس سے شخصیات کے ضمن میں خود ان کے ہاں ایک تدریج کا پتا چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ رئیس احمد جعفری کی شخصیت میں لچک

اور توازن کا بہرہ وافر تھا۔ چنانچہ وہ ابوالکلام آزاد ہوں یا مولانا اشرف علی تھانوی، خالدہ ادیب خانم ہوں یا سید ابوالاعلیٰ مودودی، رئیس احمد جعفری ان کے بارے میں اپنے سابقہ تاثرات یا اندیشے رقم کرنے میں ہرگز جھجک محسوس نہیں کرتے اور پھر ملاقات کے بعد تازہ تاثر پذیری کے اظہار میں بھی نہیں ہچکچاتے۔

رئیس کے زیرِ نظر خاکوں کی ایک بہت نمایاں اور امتیازی خوبی ان کی سراپا نگاری ہے۔ وہ زیرِ نظر شخصیات کا سراپا اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ ان کے قلم پر کسی ماہر صاحبِ قلم کا گمان ہوتا ہے۔ ان سراپوں سے شخصیات چھنکتے، بولتے، چلتے اور گھومتے لگتی ہیں۔ ذیل میں ہنگری کے مشہور مسلم مستشرق ڈاکٹر جرمانوس، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ظفر علی خاں اور عطیہ فیضی (کی جوانی کی تصویر) کے سراپے بالترتیب ملاحظہ ہوں۔ رئیس نے موزوں اور مناسب الفاظ کی مدد سے جیتے جاگتے نقشے کھینچ دیے ہیں۔

۱۔ "ان کی صورت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ گداز بدن، گورا رنگ، گول چہرہ، چوڑی دار پاجامہ، سرج کی ایک بے شکن اچکن، ترکی ٹوپی، متبسم چہرہ، آنکھوں میں غور و فکر کی چمک، ادھیڑ عمر۔"

ب۔ "۱۹۳۸ء کی ایک سردِ شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی، میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، حیدرآباد دکن کی شیروانی، داڑھی ندارد، غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئی۔ انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا آپ کی تعریف؟ فرمایا ابوالاعلیٰ مودودی۔"

ج۔ "بوٹا سا قد، خشخشی داڑھی، بال کچھ سفید، کچھ سیاہ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی، گفتگو کا ایک خاص انداز، تقریر کا ایک خاص ڈھب، بلند آوازی کے ساتھ ساتھ پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر پیشانی تک تمام نامی اور غیر نامی اعضاء و جوارح میں ایک حرکت، ایک اضطراب، ایک ارتعاش، ایک جنبش، باتوں میں ٹھیراؤ، لہجہ میں تبلیغی رنگ غالب۔"

د۔ "سامنے ایک قدِ آدم تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کیا تھی حسن و جمال اور رعنائی

زیبائی، دلکشی، فسوں طرازی کا ایک پیکرِ خاموش تھی۔ "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔" نرگس شہلا کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، گلِ تر کی طرح شگفتہ اور رنگین چہرہ۔ مارِ سیاہ کی طرح بڑی بڑی ـــــ اور بڑے بڑے دلوں کو اسیر کر لینے والی ـــــ زلفیں، جوانی تھی کہ پھٹی پڑ رہی تھی، شباب تھا کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ نشہ تھا کہ سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی۔ یہ تصویر کسی فانی ہستی کی نہ تھی۔ یہ تصویر تھی حُسن کی، شباب کی، حسنِ عالم آشوب کی، شباب لازوال کی۔"

کہیں کہیں رئیس نے "حُسنِ حضارت" اور "حُسنِ نسوانی" کی باہم آمیزش سے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش کا سامان کیلئے۔ اصل میں حسن و جمال، رنگ و رعنائی، عشوہ و ادا اور غمزہ و غوانی کے بیان میں رئیس کا قلم سرشاری کی کیفیت میں رواں ہوتا ہے۔ ایک ایسا منظر بھی دیکھتے چلیے۔ واضح رہے کہ یہ نظر سرد جمنی نائیڈو کے خاکے کا ایک اقتباس ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بمبئی کی کلچرل صورت حال کیا تھی اور یہ بھی کہ رئیس نے اپنی ناول نگاری کے بیانیہ اسلوب سے یہاں بھی خوبی سے کام لیا ہے۔ جزئیات نگاری نے رئیس کی خاکہ نگاری کی دھار تیز کر دی ہے۔

"اس وقت تک بمبئی کے انگریزی ہالوں میں ریگل سب سے زیادہ مرتب، مہذب، نستعلیق، فیشن ایبل اور آرام دہ تھا۔ بمبئی کا وہ پہلا سینما ہاؤس تھا جو ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ ہال کی بالکنی دامانِ باغبان و کفِ گلفروش بنی ہوئی تھی۔ چپہ چپہ جنتِ نگاہ اور گوشہ گوشہ فردوسِ نظر دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے گھرانوں کی متعدد آرٹ نواز خواتین تشریف فرما تھیں، وہ ان کا حسنِ بے حجاب، وہ ان کی زرکار اور زرنگار ساریاں، وہ ان کی مسکراہٹیں، وہ ان کی چہلیں اور بے باکیاں، وہ ان کی عشوہ طرازیاں اور دلربائیاں، کبھی ساری کے پلو ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ گرنے دینا اور توجہ بھی نہ کرنا، کبھی بالوں کی لٹوں کا رُخِ روشن کو چھپا لینا جیسے چاند گہن میں آگیا اور پھر گردن کے ایک جھٹکے یا دستِ نازک کی ایک جنبش سے ان سرکش زلفوں کو گردن اور پشت کی زینت بنا لینا، رنگ و بو کے اسی عالم

میں گھنٹی بجی، پردہ گرا، روشنی گل ہوگئی اور تاریکی چھا گئی۔ اب ہم "گربا" دیکھ رہے تھے۔"
رئیس کی زیر نظر کتاب میں از اوّل تا آخر شگفتگی اور بے تکلفی کی فضا نظر آتی ہے۔ اس فضا کے بوجھل ہو جانے کا اندیشہ ضرور تھا۔ کیونکہ اس میں علمائے کبار، صوفیۂ عظام اور کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے مشاہیر بھی موجود تھے جن کے ذکر میں دقیق مذہبی، صوفیانہ یا جدلیاتی مباحث کا اجمالاً ہی سہی، چھڑ جانا بعید نہیں تھا، لیکن مصنف نے بوجھل مقالاتی فضا سے ان خاکوں کو یکسر پاک رکھا ہے۔ چنانچہ متذکرہ حضرات کا ذکر ہو یا شعرا اور حکما کا مصنف کا قلم بڑی سہولت، سلاست، ایجاز اور توازن سے اور کہیں کہیں رمز و ایما کے پردے میں پنہاں و پیدا اپنی جولانیاں دکھاتا چلا جاتا ہے اور گاہے گاہے تخلیقی جملے بھی رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً حکیم انور حسین کے خاکے میں جہاں ان کا جیتا جاگتا مرقع ملتا ہے، وہاں رئیس احمد جعفری قاری کو تخاطب کے ذریعے دھیرے دھیرے حکیم صاحب کے مطب کے ماحول سے متعارف کراتے ہیں۔

"آپ نے شاید حکیم صاحب کو نہ دیکھا ہو، دیکھ لیجیے۔ آپ ایک شاندار مکان میں داخل ہوئے، یہی حکیم صاحب کا دار الشفا ہے۔ یہ سامنے وسیع صحن ہے، بہت سی کرسیاں اور بنچیں پڑی ہیں۔ بیچ میں ایک تخت ہے، اس پر دری بچھی ہے، اس پر قالین بچھا ہے، گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے، بڑے سلیقے اور قرینے سے قلم، دوات، کاغذ رکھا ہے۔ اتنے میں اندر سے ایک شاندار لحیم شحیم ہستی برآمد ہوئی ... الخ"

کتاب میں جا بجا ایسے دسیوں مرقعے مل جائیں گے جن میں چند ضروری جزئیات ہی کے ذریعے جعفری صاحب شخصیت کے خد و خال روشن کر دیتے ہیں اور اس طرح کہ قاری ان شخصیات کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان خاکوں میں مولانا عرفان، حیدر حسن خاں اور نیر کاکوروی کے خاکے تو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والے شہ پارے ہیں۔ یہ تینوں خاکے ان شخصیات کے کامیاب ترین عکاس ہیں۔ ان شخصیتوں پر لکھتے ہوئے تو جعفری صاحب کا قلم عجیب طرح کی گلکاریاں کرتا اور کلکاریاں مارتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان خاکوں میں ان شخصیات کے بعض بہت دلچسپ انوکھے پہلو سامنے آتے ہیں جن میں بچوں کی سی معصومیت اور بے تکلفی کے عناصر سرفہرست ہیں،

منظر کھانے کے وقت مولانا عرفان کی گرفتاریاں عجیب دلچسپ صورتِ حال پیدا کر دیتی تھیں۔ ندوہ کے مہتمم اور رئیس کے استاد مولانا حیدر حسن خان کا تعزیتی خاکہ زیرِ نظر کتاب کا طویل ترین اور کامیاب ترین خاکہ ہے۔ ندوہ میں اپنے استادِ محترم کے ساتھ رئیس کی شوخیاں اور استادِ محترم کا سادگی سے ان کے دام میں گرفتار ہو کر رقت آفرینی کا سامان کرنا عجیب طرح کا لطف دیتا ہے۔ اس خاکے سے حیدر حسن خاں کی بے نفسی، ایثار، اسلامیت، صداقت، تبحرِ علمی، وضعداری اور طنزیات و لطیفہ سنجی نمایاں ہیں۔ بجا طور پر رئیس نے یہ خاکہ اس طرح ڈوب کر لکھا ہے کہ حیدر حسن خاں کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس خاکے میں رئیس کی وقائع نگاری بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے جس سے خاکے کی کشش چہار گونہ بڑھ گئی ہے۔ اس خاکے کا وہ آخری اقتباس بھی دیکھتے چلیے جو اصل میں وداعِ جاوداں کا منظر ہے۔ اس منظر میں ایمان، تیقن کی آواز اور درد نے کس قدر تاثیر پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً آخری دو سطروں میں حیدر حسن کی روحِ رواں سے جعفری صاحب کے تخاطب نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوبِ خاص کی یاد تازہ کر دی ہے۔ (واقعہ بھی یہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کا اسلوب مولانا دریابادی کے انداز و اسلوب سے خاصا متاثر نظر آتا ہے۔)

”یہ ستم رسیدہ خاک کی دنیا حیدر حسن خاں کے وجود سے محروم ہو گئی لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اس مردِ مومن کا استقبال دوسری دنیا میں کس شان سے ہوا ہے۔ اس دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آ کر وہ رسولؐ کا شارح اور مفسرِ پیامبر اور داعی اس دنیا میں پہنچ چکا ہے جہاں نہ نوکری کی پابندیاں ہیں نہ دوسروں کے اشارۂ چشم و ابرو کا کچھ مفہوم ہے، نہ کوئی حاکم ہے، نہ کوئی محکوم، وہاں صرف رحمت ہے، ربوبیت ہے، شانِ مغفرت ہے جس کے جلو میں یہ نعماء موجود ہوں وہ رونے والوں کا دیدۂ تر کیوں دیکھے؟

جا! اے بے قرار روح، شریعت کے سرکار کے دربار میں جا۔ تیری خدمات قبول ہوئیں، اس دربار میں ہمیشگی کی زندگی بسر کر، الوداع، الوداع!“

زیرِ نظر کتاب میں جعفری صاحب کا نقطۂ نظر ایک ہمدرد، غیر جانبدار اور بے لاگ شخصیت نگار کا ہے۔ وہ باطل کو باطل اور حق کو حق کہنے پر (بغیر لومۃ لائم)

مائل نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں طنز خال خال ہے اور تشنیع نہ ہونے کے برابر، طنز عموماً تہ موج کی شکل میں محسوس ہوتا ہے مثلاً اسلم جیراجپوری کے بارے میں، جن سے ان کے منکرِ حدیث ہونے کی وجہ سے رئیس کا شدید اختلاف تھا، بغیر کسی تعصب کے صاف صاف لکھتے ہیں: "دل بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی ہے بلکہ اس میں ان "فنونِ لطیفہ" کی سرے سے گنجائش نہیں۔" چند ایسے اور مزے کے چھچے ٹلے چٹکلے سنیے۔ ایک دو جگہ رمز و رعایت نے بھی خوب لطف پیدا کیا ہے۔

ا۔ "دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے، جن کے خیالات گراں مایہ ہوتے ہیں وہ "بے زبان" ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شخص (مولانا آزاد سبحانی) اقلیمِ خیال کا بھی فرمانروا اور شہرستانِ زبان کا بھی تاجدار۔"

ب۔ "عوام کو دھڑکتے ہوئے دلوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، وہ جگر مرادآبادی اور سید حسین کے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹ بھی دنیا کو یادگار رہ گئے۔"

ج۔ "اگر کسی سے محبت کرتے تو اسے اپنا ہمزاد بنالیتے۔" (بہ سلسلہ ڈاکٹر ضیاء الدین)

د۔ "علمی آدمی عام طور پر خلوت کے آدمی ہوتے ہیں، جلوت میں سرسبز نہیں ہو پاتے۔"

ر۔ "اختر پہلا شاعر ہے جس نے معشوق کے سبزۂ خط کو چھوڑ کر کاکل مشکیں کی طرف توجہ کی۔"

ہ۔ "آپ میں اور موت میں فی الحال اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا حق و باطل میں۔"

ز۔ "جب تک ان کی اولاد کا سار (قوتِ مردمی کی دوا) ترقی کر رہی تھی انھوں نے (ڈاکٹر عبدالحمید خواجہ) نے جامعہ کو بھی بہت کچھ دیا اور دوسرے تعلیمی اداروں کی بھی جی کھول کر مدد کی۔ لیکن جب ترقی کی رفتار انتہا کو پہنچ گئی اور انھوں نے دوسرے منفعت بخش مشغلے بھی اختیار کر لیے تو ان میں امساک پیدا ہو گیا، اب نہ جامعہ پر نظرِ عنایت ہے نہ دوسرے تعلیمی اداروں پر۔"

ح۔ "ان (جگر) کی غزلیں عام و خاص سب کی زبان پر تھیں۔ بچے انھیں گاتے تھے، جوان ان سے لطف لیتے تھے۔ بوڑھے ان میں اپنی زندگی کا جلوہ

دیکھتے تھے، کالج کی لڑکیاں اُنھیں گنگناتیں تھیں اور بلند بام و بالانشین خواتین ان کے کلام پر فدا تھیں۔"

ط۔ "رشید صاحب کی شوخ سنجیدگی یا سنجیدہ شوخی کے اہلِ نظر قائل تھے، شوخی پہلے ہو یا بعد میں لیکن تھی ان کے ادب کا ایک غیر منفک جزو۔"

رئیس کے ان خاکوں کے چراغ ماضی کی باد آفرینی سے بھی روشن ہیں اور ان چراغوں کی لویں تیز کرنے میں ان کے استاد مولانا عرفان اور ان کے ممتاز ہم سبق عبدالسلام قدوائی ندوی متعدد بار ان اوراق میں آ نکلتے ہیں، اور اپنی دلچسپ حرکات اور طور طریقوں سے ان میں رنگ بھرے جاتے ہیں، اور چونکہ ان خاکوں میں بیان کردہ عام شخصیات ایک خاص عہد میں زندہ تھیں، اس لیے ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ برِ عظیم کی بیسویں صدی کے نصف اوّل کی معاشرت، تہذیب، ثقافت، تاریخی احوال، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، ادبی صورتِ حال اور مذہبی اور مسلکی تنوّع یا تنگ نظری بھی آئینہ ہوتی چلی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان خاکوں سے تو د رئیس احمد جعفری کی اپنی شخصیت کے بعض ایسے اہم پہلو سامنے آتے ہیں جن کے جاننے کی اور کوئی صورت نہ تھی اور جن کی مدد سے خود ان کی شخصیت کا جیتا جاگتا اور ہنستا بولتا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

رئیس کی خاکہ نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شخصیات زیرِ نظر کے ناموں کے تحت مختصر مگر بچے تلے الفاظ پر مشتمل ذیلی سرخیاں بھی قائم کرتے جاتے ہیں، یہ ذیلی سُرخیاں نثر میں یا کسی استاد کے مشہور مصرعے پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں بعض اوقات زیرِ بحث شخصیت کا جوہر کھنچ آتا ہے۔ مثلاً مفتی اعظم سید امین الحسینی کے نام کے تحت ان کے خوبصورت چہرے، پُرکشش آنکھوں، گورے رنگ اور بے داغ کردار کے ناتے سے اقبال کے مشہور مصرع "یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل" کی سُرخی جمانا، ٹیونس کے مشہور مجاہد اور فرانسیسی استعمار کے بہت بڑے باغی علامہ ثعلبی کے ذکر میں "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" جیسی ذیلی سُرخی کا اندراج، مسز سروجنی نائیڈو کے روز بروز زوال آثار حسن و جمال کے پیشِ نظر "ہو گئے خاک انتہا یہ ہے"، عطیہ فیضی کے ضمن میں "بلائے جاں ہے غالب

اس کی ہر بات"، مولوی عبدالحق کی سفید، دودھیا طباشیر رنگ مگر انتھک پیری کی رعایت سے "جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب" قاضی عبدالغفار کے باب میں "ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں" اور خواجہ کمال کے لیے "اک دلی پوشیدہ اور کافر کھلا" جیسے برمحل مصرعوں اور مولانا ظفر علی خاں کے نام کے نیچے "تحریک نجد سے لے کر تحریک نیلی پوش تک" مولانا اشرف علی تھانوی کے تحت "شریعت اور طریقت کا سنگم" اور مسٹر جناح کے تحت "بچے کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں" جیسے پُرمعنی اور مختصر کلمات کے اندراج سے ان کے خاکوں کے عنوان زیادہ جاذب، بامعنی اور جامع ہو گئے ہیں۔ پھر بعض جگہ خاکے کے وسط یا آخر میں محض ایک مصرعے کا اندراج وہی کام کر جاتا ہے جیسے ایک صاحبِ ایمان سپاہی کی تیغ کارِ سپاہ کر جاتی ہے۔ مثلاً مولانا عین القضاۃ کے نہایت مؤثر خاکے میں ان کے ایثار، گوشہ نشینی اور بے لوثی سے اشاعتِ اسلام کی کاوشوں کے ذکر میں بالآخر ان کے بیٹھے بیٹھے ایک خاص تاثر کے عالم میں رحلت کر جانے کے منظر کو رئیس نے ایک مشہور فارسی مصرعے "سبک بار مردم سبک تر روند" سے ٹانک کر اس ایک مصرعے کے ذریعے مولانا عین القضاۃ کا عین جوہر کھینچ لیا ہے اور زندگی بسر کرنے کے سلیقے سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔

زیرِ نظر خاکوں میں مفصل خاکوں کے دوش بدوش مختصر خاکے بھی ہیں۔ بعض خاکے تو محض بارانِ تحریر کے چند ہلکے چھینٹے ہیں جن سے ابرِ گہربار کی وسعت اور قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً حسرت موہانی وغیرہ کے خاکے لیکن بعض خاکے بالکل سرسری اور چلتے ہوئے بھی ہیں۔ مثلاً آصف فیضی یا بھولا بھائی ڈیسائی کے خاکے۔ یہ اور اس قبیل کے چند اور لوگ محض چند لمحوں کے لیے پردۂ سیمیں پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر منظر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ خیر اس میں کوئی ایسا حرج بھی نہیں، مشکل وہاں پڑتی ہے جہاں قاری رئیس کے زیرِ تحریر ممدوح یا شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کے بارے میں مزید جاننے کا آرزو مند ہوتا ہے اور رئیس ایک شانِ بے نیازی سے خاکے کو ناتمام چھوڑ کر (کم از کم میرا احساس یہی ہے) آگے بڑھ جاتے ہیں مثلاً موسیٰ جاراللہ، ڈاکٹر جرمانوس اور گاندھی جی کے خاکے قاری کو ایک ایسے ہی دھچکے اور صدمے سے دوچار کرتے ہیں۔ لیکن ایک سو سے متجاوز خاکوں میں اس طرح کے خاکوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے

بعض خاکوں کے تکملے کے لیے قاری رئیس کی مسلمانوں کی جدوجہد کی داستان پر مشتمل کتاب "کاروان گم گشتہ" میں شامل بعض خاکوں (مثلاً حسرت موہانی، گاندھی جی وغیرہ) سے رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہاں بعض شخصیات کے ضمن میں ایسے حقائق اور واقعات درج ہیں جو بوجوہ "دیدہ و شنیدہ" میں جگہ نہ پا سکے۔

رئیس نے ان خاکوں میں متعدد ایسی شخصیات کو بھی جگہ دی ہے جنھیں دنیائے علم و ادب فراموش کرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ عبدالرؤف عشرت، حکیم احمد علی اور حکیم کبیرالدین جیسے اہم لوگوں کو پردۂ خفا سے یا ان کے مخصوص حلقۂ ہائے تعارف سے نکال کر رئیس نے ان کا ذکر اس چاہت، اپنائیت اور خلوص سے کیا ہے، اور انھیں ادب کے ایسے وسیع میدان میں لے آئے ہیں کہ ان کی بازیافت خارج از امکان نہیں رہتی۔

رئیس احمد جعفری کا قلم تمام عمر اسلام اور خدمتِ اسلام کے لیے وقف رہا ۔۔۔۔۔ ان خاکوں میں بھی اُنھوں نے اسلام ہی کی آفاقی قدروں کو اُبھارا ہے چنانچہ اسلام دوست مجاہدین، شعراء، ادبا اور دانشوروں کے ذکر میں ان کا قلم خوب رواں ہو جاتا ہے۔ لیکن ان اوراق میں نہ تو کوئی بے آمیز شیطان ہے نہ کوئی خالص فرشتہ۔ رئیس نے اپنے کرداروں میں تدریجی ارتقا اور قلبِ ماہیت کی خوبی سے نقش آرائی کی ہے۔ ان کا قلم تعصب سے اس قدر پاک ہے کہ وہ اپنی سادہ دلی کے ہاتھوں کمیونسٹ پارٹی کے بعض رہنماؤں کی بھی ضرورت سے زیادہ تعریف و اعتراف کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً پورن چند جوشی وغیرہ کے تدبر اور توازن کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی جانب سے تحریکِ پاکستان کی تائید پر خوب خوش ہوتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تخلیقِ پاکستان سے چند سال پہلے اشتراکی رہنماؤں کی جانب سے تحریکِ پاکستان کی حمایت ایک سوچی سمجھی اسکیم کا حصہ تھی۔ اشتراکی رہنماؤں کی بے نفسی اور مقصد سے ان کا اٹوٹ انسلاک لاکھ قابلِ تعریف سہی لیکن ظاہر ہے کہ اشتراکیت راحت کا جو راستہ بتاتی ہے وہ اعلیٰ روحانی و سماوی قدروں کو مٹا کر اور طبقاتی آویزش اور نفرت کے ذریعے ہی تخریب کیا جا سکتی ہے۔ سجاد ظہیر رئیس کو بڑے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مقصد سے انسلاک اور کٹھنائیوں کی ہمت سے برداشت آدمی کو بڑا بناتی ہے لیکن اگر مقصد ہی پست اور یک رخا ہو تو ؟

ان مختصر معروضات کے اختتام سے پہلے زیرِ نظر اوراق میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے خاکے کے حوالے سے چند باتیں بھی ضروری ہیں۔ رئیس کے اس خاکے میں مولانا سے ان کی محبت اور عقیدت پھوٹی پڑتی ہے۔ ان کے دورِ الحاد کا ذکر کرتے ہوئے رئیس نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں ماجد مذہب کے منکر تھے۔ لیکن ان کی آزاد خیالی اور "ترقی پسندی" بھی اپنے اندر ایک آن رکھتی تھی۔ ان دنوں بقول ان کے ایک وزن اور وقار تھا اور مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے تھے بلکہ اس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے۔ رئیس کی یہ بات محض جزواً درست ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتاب "فلسفۂ اجتماع" میں (جسے بعد ازاں انھوں نے اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا تھا) پیغمبرانِ عظام کے استخفاف اور دین کی تردید کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔ یہی معاملہ ان کی انگریزی تصنیف "PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP" کا بھی تھا۔ اسی طرح مولانا کے تجدیدِ اسلام کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے رئیس نے خاتون منزل لکھنؤ میں ان سے اپنی ملاقات اور مشاہدات کا احوال لکھا ہے۔ اس ملاقات میں رئیس نے مولانا کے بازو کو زخمی پایا۔ سبب یہ تھا کہ مولانا نے بقول ان کے بچپن میں اپنے ہاتھ پر اپنا نام گدوایا تھا۔ اب تجدیدِ اسلام کے بعد مذہبی کتب میں گدوانے کے خلاف مذہبی وعیدیں دیکھ کر انھوں نے اپنا نام مٹوانے اور کٹوانے کا فیصلہ کر لیا اور ڈاکٹر نے ایک انچ کے لگ بھگ حصے کو پوری کھال کھرچ کر صاف کر دیا۔ اس واقعے کے بیان میں رئیس صاحب سے دو تسامحات ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ مولانا نے اپنے بازو پر اپنا نہیں اپنی منگیتر کا نام اردو اور انگریزی میں کھدوا رکھا تھا اور دوم یہ کہ نام بچپن میں نہیں جوانی میں کھدوایا گیا تھا۔ مولانا نے اپنے خاکوں کے مجموعے "معاصرین" میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے ذکر میں اس واقعے کی تفصیل رقم کی ہے۔

جوش پر لکھتے ہوئے رئیس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے کبھی حمد و نعت کا کوئی شعر نہیں کہا۔ یہ بات درست نہیں۔ ان کے ابتدائی مجموعوں خصوصاً "شعلہ و شبنم" میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔ جوش صاحب کے یہاں الحاد کی کیفیت تو ابتدائی دو تین مجموعوں کی اشاعت کے بعد کھلی اور کھلتی ہی چلی گئی۔ آخر عمر میں وہ اپنی اصل کی طرف پلٹے اور سورۃ الرحمٰن کا جو منظوم ترجمہ انھوں نے کیا وہ ان کے حسنات میں یقیناً اضافے کا سبب

بنے گا۔

بہزاد لکھنوی کے خاکے میں ایک جگہ انھوں نے مشہور شعر "بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔۔۔ الخ" کو غالب سے منسوب کیا ہے۔ اس شعر کا اسلوب و انداز غالب کا نہیں، یہ متعین طور پر غالب کا نہیں آتش کا شعر ہے۔

رئیس کے زیرِ نظر خاکے مختلف شخصیات کے ہمہ گیر تنوع کے ساتھ رقم ہوئے ہیں۔ ان خاکوں سے جہاں شخصیات زیرِ قلم کے مزاج، میلان، رویوں اور نظریوں کی وضاحت ہوتی ہے وہیں خود روحِ عصر کے ساتھ رئیس کے انسلاک کا بھی پتا چلتا ہے۔ رہا ان خاکوں میں حقائق کی تصدیق کا مسئلہ تو حقیقت یہ ہے کہ متعدد معاصر اور بعد کے خاکہ نگاروں، سوانح نگاروں اور تخصیہ نگاروں نے بہت سی انھیں شخصیتوں پر لکھا ہے جن پر رئیس نے قلم اٹھایا تھا اور اُن کے بیان کردہ حقائق و واقعات، رئیس کے بیان کردہ حقائق و واقعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ حقائق و واقعات نشاط خیز بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ ان اوراق میں بعض اکابر اور اعاظم کے احوال پڑھ کر میں نے بار بار اپنے آپ سے پوچھا، کیا میں ایسا بن سکتا ہوں؟

نظر سے خوش گزرے!

اُردو زبان میں تراجم وسوانح کی کمی نہیں ملک و ملت کے رہنماؤں پر، دین و مذہب کے علمبرداروں پر، شعر و ادب کے ناخداؤں پر، زبان و بیان کے ماہروں پر حکمت و فلسفہ کے اماموں پر، دولت و ثروت کے مالکوں پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے اس روشِ عام سے ہٹ کر یہ کتاب لکھی ہے اور صرف اپنے تاثرات و مشاہدات پر اکتفا کیا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ پایا، جو کچھ پرکھا اسے برملا بیان کر دیا ہے اور حتی الامکان افراط و تفریط دونوں سے دامن بچایا ہے۔

زندگی میں میں نے بہت سے بڑے اور قابلِ ذکر آدمیوں کو دیکھا اور پرکھا، یہ کتاب اسی پرکھ اور نظارہ کی روداد پر مشتمل ہے۔ مجھے کسی سے عناد نہیں، لیکن اظہارِ تاثرات کے وقت میں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی ہے کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا شیفتگی پر ؟ لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں میں نے وہی کہا اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے۔ سچ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خوشگوار ہو، کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ بھی آجاتی ہے، ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو کہیں تلخ۔ لیکن میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ سچ حدود کے باہر نہ نکلنے پائے۔

اردو زبان میں بعض کتابیں اشخاص و افراد سے متعلق شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ مصنف نے اپنے مزاحیہ رنگ میں اپنے چند دوستوں یا مخالفوں کا سراپا کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے اس پہلو سے اجتناب کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں انہی لوگوں کو لیا ہے جو ہندوستان میں یا دنیا میں کوئی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں یا جو زیادہ نامور نہیں، لیکن اپنی سیرت و شخصیت کے اعتبار سے اعاظمِ رجال میں شریک کئے جانے کے مستحق ہیں۔ یا جنہوں نے اپنی زندگی اختیار کر رکھی ہے جو لوگوں

کے نزدیک قابلِ توجہ ہے ایسے لوگوں سے اگر میں ملا یا ایسے لوگوں کو اگر میں نے دیکھا تو ان کے کردار اور شخصیت کی کون سی ادا مجھے یاد رہ گئی اور اس طرح یاد رہ گئی کہ دوسرے بھی اُسے سنیں بس اسی کو میں نے بیان کر دیا۔

اس کتاب میں اکابر و اعاظم کی سوانح عمری نہیں ہے، لیکن ممتاز اور نمایاں لوگوں کی زندگی، کردار، شخصیت اور اخلاق سے متعلق ایسے واقعات ضرور ہیں جو یاد رکھے جائیں، جن سے سبق حاصل کیا جائے، جنہیں زندگی کے سفر میں دلیل راہ بنا لیا جائے۔

اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو حوصلہ افزائی کی، ناکام ہوا ہوں، تو عفو اور چشم پوشی کی توقع رکھتا ہوں!

رئیس احمد جعفری

بمبئی:- ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

مفتی اعظم سیّد امین الحسینی

یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل

گورا رنگ بوٹا سا قد، سحر انگیز اور پُرکشش آنکھیں خوبصورت چہرے پر بھُور ے بالوں کی خوبصورت داڑھی مختصر اور دل آویز، تبسم دلنواز، باتیں دلفریب، دل اسلام کی محبت سے معمور دماغ فلاح مسلمین کی اسکیموں سے بھرپور طبیعت، کفر کے غلبہ اور ابتلا سے رنجور آنکھیں اسلام اور مسلمانوں کے نشہ کامیابی سے مخمور، خدائے ابراہیم و اسمٰعیل و محمد کی طرف سے تطہیر بیت المقدس کے جہاد کے لیے مامور،

یہ غریب الدیار مسافر مصر کے علوبہ پاشا کے ہمراہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آیا۔ امام بوہیر ملا طاہر سیف الدین کی دولت سرائے مالا بارہل پر مقیم ہوا، فلسطین کے جہاد پیشہ اعراب کا بطل جلیل اور دنیائے اسلام کا یہ مجاہد کبیر محلّات و قصور میں رہنے کے بجائے آیا تھا، کام کرنے اپنی نوائے درد مسلمانانِ ہند کے کانوں تک پہنچانے، اپنا پیام درد قبلۂ اوّل کے عقیدت مندوں کو سنانے قید فرنگ کو توڑنے اور غلبہ یہود کے سیل بے پناہ کو روکنے اس کام کے لیے اسے کسی اپنے ہی جیسے مجاہد کی ضرورت تھی۔ شوکت علی سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ گراں ڈیل اپنے دامن میں عالم اسلام کی اس قابلِ فخر کائنات کو اپنے غریب خانہ پر سمیٹ لایا۔

اب اسکیمیں خلافت ہاؤس میں بننے لگیں، ان اسکیموں کی تخلیق و تشکیل میں مفتی اعظم کی ذکاوت اور شوکت علی کی قوتِ عمل ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں، اسکیم یہ تھی کہ فلسطین کی قابل فروخت زمین کا بڑا حصہ اپنے سرمایہ سے خرید کر ہندوستان کے مسلمان سرمایہ دار وہاں کارخانے کھولیں صنعتی ادارے قائم کریں تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے کے لیے بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں قائم کریں۔ جو نفع ہو چلا ہے تو اسے خود لے لیں مرضی ہو تو مجوزہ جامعہ فلسطین کے ارتقا اور

احیاء پر صرف کرنے کے لیے وقف کر دیں ہیں اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کا تازہ وارد ایڈیٹر تھا اور مولانا شوکت علی کا ذاتی مددگار بھی۔ لہٰذا ان اسکیموں سے براہ راست واقفیت کے مواقع مجھے دوسرے کارکنان خلافت کے مقابلہ میں زیادہ حاصل تھے، مفتی صاحب اپنے ساتھ کچھ پمفلٹ کچھ بیانات اور کچھ معلومات بھی لائے تھے یہ سارا لٹریچر عربی میں تھا اس کے ترجمہ کی خدمت مولانا شوکت علی مجھ سے لیتے تھے۔

مفتی اعظم کی تشریف آوری کے سلسلہ میں مسلمانان بمبئی کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسے کا سامان ہوا، جلسہ کا وقت قریب آگیا تھا، مفتی صاحب، علویہ پاشا مولانا عرفان مرحوم اور مولانا شوکت علی جلسہ میں جانے کے لیے اٹھ رہے تھے کہ مفتی صاحب نے مولانا شوکت علی کو اپنے ایک بیان کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور خواہش ظاہر کی کہ یہ بیان بھی جلسہ میں ضرور پڑھا جائے، مولانا نے وہ مطبوعہ بیان میری طرف بڑھایا اور اپنے مخصوص لہجہ میں اپنے بادقار چہرے اور بڑے سر کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا، بہت کام ہے وقت بہت کم ہے، بیان بہت ضروری ہے، فوراً اس کا ترجمہ کر دو! میں وہیں قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور پندرہ منٹ میں قلم برداشتہ ترجمہ میں نے پیش کر دیا، مولانا بہت جلدی میں تھے بغیر دیکھے ہوئے انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور اپنی آبنوسی چھڑی اٹھا کر نیچے اترنے کے لیے بڑھے، مفتی صاحب کو میری رفتار کار پسند آئی انہوں نے دست شفقت دراز کیا اور پھر کر شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا، مولانا اتنی جلدی میں تھے کہ چلتے چلتے انہوں نے مفتی صاحب سے اردو میں گفتگو شروع کر دی ”ہاں بڑا کام کا ہونہار لڑکا ہے“ اور آگے بڑھ گئے

آج پہلی مرتبہ مفتی اعظم سے میری آنکھیں چار ہوئی تھیں، ان آنکھوں میں کیسی سنجیدگی چمک تھی، عزیمت اور استقلال کی کیسی دل میں اتر جانے والی روشنی تھی یہ آج معلوم ہوا۔

فلسطین کی قابل فروخت زمین کے خریدنے کی خاطر سرمایہ جمع کرنے اور ملک کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد مرتب ہوا۔ جس میں سر سلیمان قاسم مٹھا جیسے لوگ تھے، وفد نے ابھی دورہ شروع نہیں کیا تھا کہ شملہ سے لارڈ ڈنگٹن وائسرائے ہند نے مفتی اعظم کو دعوت ملاقات دی، لہٰذا انہیں فوراً شملہ تشریف لے جانا پڑا۔

پھر جب کام کا وقت آیا تو کام بالکل نہ ہو سکا، ظاہر ہے جس حکومت نے زبردستی فلسطین کو اپنا غلام اور تابع بنا رکھا تھا جس نے بدعہدی اور وعدہ خلافی سے کام لے کر فلسطین

پر اعلان بالفور مسلط کر دیا تھا جو اپنی قوت اور زر کے بل بوتے پر فلسطین کو وطن الیہود بنانے پر تلی ہوئی تھی وہ کیونکر اسے گوارا کر سکتی تھی کہ فلسطین کی زمین مسلمانان ہند خرید لیں اور غریب یہودی سرمایہ دار منہ دیکھتے رہ جائیں حکومت کے ایما اور اشارہ کو مولانا شوکت علی ٹھکرا سکتے تھے۔ لیکن وہ لوگ تو نہیں ٹھکرا سکتے جنہوں نے اپنا "قبلہ و کعبہ" ——— قبلۂ امید، اور کعبۂ آرزو ——— سرکار ابد قرار کو بنا رکھا ہو ———

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وفد نے کام شروع کیا نہ فلسطین کی زمین خریدی گئی نہ جامعہ فلسطین قائم ہوئی نہ وہاں کارخانے قائم ہو سکے۔ استعمار فرنگ کے یہ کارنامے دیکھتے دیکھتے ہماری آنکھیں عادی ہو چکی ہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی قدرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

پھر مفتی اعظم اور اعراب فلسطین نے یہ محسوس کر لیا کہ جو کچھ کرنا ہے انہی کو کرنا ہے خود ہی سب کچھ کیا۔ اور جو کچھ کیا اسے کوئی جرمنی اور اٹلی کے دل جزیں سے پوچھے۔

———

علامہ ثعلبی

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

۱۹۲۳ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ میں اس وقت ندوہ کے درجہ اول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن جلسہ کی شرکت کے شوق میں اپنے ہم سن طلبہ سے کہیں زیادہ آگے تھا۔

اس جلسہ میں ملک کے سربرآوردہ زعماء علماء اور اکابر بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے ان معزز مہمانوں میں ایک غیر ملکی شخصیت بھی تھی، یہ تھے ٹیونس کے مشہور مجاہد اور فرانسیسی سامراج کے بہت بڑے باغی علامہ ثعلبی!

جن لوگوں نے مولانا شوکت علی مرحوم کو دیکھا ہے وہ ان کے قد و قامت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے۔ ایک کرسی لاکر سامنے رکھ دی گئی اور اس پر بیٹھ کر شیر کی طرح گرجنا شروع کر دیا۔ تقریر عربی زبان میں ہو رہی تھی۔ پوری روانی اور تیزی کے ساتھ ہو رہی تھی حاضرین میں اکثر عربی زبان سے ناواقف محض تھے، لیکن وفور تاثر کا یہ عالم تھا کہ ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا سارے مجمع پر، سوئی بھی پھینکیے تو اس کی آواز سن لیجئے سکون اور سکوت کا یہ عالم تھا، تقریر کیا تھی فصاحت و بلاغت جوش بیان اور زور کلام خطابت اور طلاقت لسانی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر تھا۔ ایک طوفان تھا۔ جس کی رو میں سب کچھ بہا جا رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا سوق عکاظ میں کوئی عرب خطیب اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہا ہے ایک ایک لفظ دل میں اتر رہا تھا۔ ایک ایک حرکت جنبش دل کی ترجمان تھی دست و بازو کی ایک ایک جنبش شمشیر و تیر کا کام کر رہی تھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر جاری رہی اور مجمع دم بخود ان کی تقریر کو سنتا رہا: پھر مولانا عبدالرحمٰن گرامی مرحوم اٹھے اور انہوں نے اسی انداز بیان

اور اسی زور کلام کے ساتھ تقریر کا برجستہ ترجمہ کیا۔ اب وہ تقریر نہیں تھی مئے دو آتشہ تھی، جس کے نشہ سے غلاموں کے سر میں آزادی کا سودا پیدا ہو رہا تھا ایک سحر حلال تھا جس کے اثر سے مردوں میں زندگی کی تڑپ اور حرارت پیدا ہو رہی تھی، اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اقبال نے "نطق اعرابی" سے کیا مراد لیا تھا، اور "نطق اعرابی" کی گیرائی، کیف، تاثر، اور جوش کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میرے بچپن کا واقعہ ہے لیکن آج تک اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔

علامہ ثعلبی اپنے وطن سے جلا وطن ہو کر ہندوستان میں پناہ گزین کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ پھر ان سے ایک عرصہ دراز تک ملاقات نہ ہو سکی، ۳۲ء میں ایک روز خلافت ہاؤس میں الحاج محمد علی زنیل علی رضا کے ہاں سے مولانا عرفان کے نام فون آیا کہ علامہ ثعلبی تشریف لائے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

مولانا فوراً تیار ہو گئے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا آج کے ثعلبی میں اور ۲۲ء کے ثعلبی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے، موٹا تازہ جسم گھل کر دبلا ہو چکا تھا وہ حرارت سرد ہو چکی تھی۔ پہلے وہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھے۔ اور اب صرف خاکستر ہو کر رہ گئے تھے۔ ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

آہ! غریب الوطنی اور جلا وطنی کے مصائب!

صبت علی مصائب لو انها
صبت علی الایام صرن لیالیا

ڈاکٹر جرمانوس

ڈاکٹر ٹیگور اور شانتی نکیتن کی ایک یادگار تاریخ

ہنگری کے مشہور مستشرق ڈاکٹر جرمانوس کی بین الاقوامی قابلیت اور مہارت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۲۲ء میں تین سال کا معاہدہ کر کے ڈاکٹر جرمانوس کو شانتی نکیتن میں طلب کیا اور علوم مشرقیہ کی کرسی ان کے سپرد کر دی،

ڈاکٹر جرمانوس کے پہلو میں ایک تڑپتا ہوا دل تھا، وہ صحیح معنوں میں جویائے حقیقت تھے۔ مذہباً وہ عیسائی تھے۔ لیکن یہ مذہب ان کو تسکین نہ دے سکا، شاید اسی تحقیق حق کے جذبہ نے انہیں علوم مشرقیہ کا اسکالر بنا دیا اور تحقیق و تدقیق کی پوری شان کے ساتھ انہوں نے دوسرے مذاہب کو بھی جانچا اور پرکھا۔ لیکن ان کے دل کے لیے ان میں سے کوئی مذہب بھی پیام تسکین و تسلی نہ بن سکا۔

اپنے مطالعہ اور ریسرچ کے زمانہ میں انھوں نے اور مذاہب کے ساتھ ساتھ اسلام کا اسلامی تعلیمات کا، اسلام کے فلسفۂ حیات اور نظام زندگی کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ ہنگری کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے لیکن جہانیاں جہاں گشت بھی تھے انھوں نے اسپین کی سیاحت کی تھی اور وہاں "موروں" (مسلمانوں) کے غیر فانی نقوش بھی دیکھے تھے وہ مصر بھی جا چکے تھے اور وہاں ایک نئی ہوئی قوم کے زندہ جاوید کارنامے ان کے سامنے تھے وہ ترکیہ کا سفر بھی کر چکے تھے، اور وہاں انہوں نے اس قوم کے دست بازو کے ساتھ اس کی تعمرات اور صناعیوں کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اب وہ ہندوستان آئے تو یہاں بھی وہ نچلے نہ بیٹھ سکے، دلّی کی جامع مسجد انہیں دعوت نظارہ دے رہی تھی، آگرہ کا تاج محل اور فتح پور سیکری کے باقیات الصالحات ان کا دامن دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے لاہور کی شاہی مسجد اور قلعہ شاہجہانی کے غیر مرئی نقوش بھی

ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے پہلی فرصت میں وہ شانتی نکیتن کے خلوت کدہ سے اٹھے اور بلاد ہند کے وہ نقوش ناتمام دیکھنے کے لیے چل کھڑے ہوئے جن کی کشش ایک عرصہ سے انہیں اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔

ہندوستان میں عہد اسلامی کی عمارتوں کو دیکھ کر بھی وہ بہت متاثر ہوئے، دلّی آئے تو خوش قسمتی سے ڈاکٹر انصاری تک اور وہاں سے جامعہ ملیہ کے ارباب کار تک ان کی رسائی ہوئی، جامعہ کے خاک نشینوں کا ماحول، طرز زندگی اور نظام معاشرت انہیں پسند آیا۔ وہ کافی دلچسپی جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ سے لینے لگے اور چند ہی ملاقاتوں میں انہوں نے کافی ربط و ضبط بڑھا لیا۔

اسلام سے وہ متاثر ہو چکے تھے اس سادہ اور فطری مذہب کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ زیادہ دیر تک اسلام سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ دلّی کے دوران قیام میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک روز جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ایک کے ہال میں جبکہ کوئی اہم جلسہ ہو رہا تھا انہوں نے اعلان کر دیا کہ آج سے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ شاہجہان اعظم کی جامع مسجد میں انہوں نے بڑے والہانہ جوش اور شیفتگی کے ساتھ جمعۃ الوداع میں شرکت کی۔ ان کی صورت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ گداز بدن، گورا رنگ گول چہرہ، چھوٹی داڑھی، پائجامہ سرج کی ایک چست اچکن، ترکی ٹوپی، متبسم چہرہ، آنکھوں میں غور و فکر کی چمک، ادھیڑ عمر۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ روز کے لیے وہ جامعہ میں ٹھہر گئے، عربی زبان تو وہ جانتے تھے، لیکن پھر بھی مطالعہ کے دوران میں بعض اشکال انہیں پیش آتے رہتے تھے۔ دوران قیام میں اس مرحلہ کو بھی انہوں نے طے کر لینا چاہا۔ میرے اور عبدالسلام صاحب قدوائی کے ذمہ یہ کام کیا گیا۔ وہ عربی بولنے پر قادر نہیں تھے انگریزی بول لیتے تھے، لیکن اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھ مثلاً، کا تلفظ وہ ش سے کرتے تھے پہلے روز جب ہم دونوں ان کے کمرہ میں پہنچے تو جتنی مشکل ڈاکٹر صاحب کو عربی لٹریچر کے بعض مہمات کو حل کرنے میں پیش آ رہی تھی اس سے زیادہ مشکل ہمیں ان کی زبان اور انداز بیان کے سمجھنے میں پیش آتی۔ وہ ہمیں اپنی مشکل سمجھانا چاہتے تھے اور ہم انہیں اپنی مشکل سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

آخر یہ پہلی ملاقات ہر قسم کے اشاروں کنایوں کے باوجود "گاندھی جناح" ملاقات سے زیادہ ناکام ثابت ہوئی اور پھر ہم لوگوں نے ان کے کمرہ کا رخ نہیں کیا۔ کیونکہ منجملہ اور مشکلات کے سب سے بڑی مشکل ہنسی تھی جس کا ضبط کرنا ہمارے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ یہ وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں اصل بات یہ تھی کہ ہماری انگریزی بھی بہت کچی تھی۔ اس لیے انگریزی میں بے تکلف علمی گفتگو قطعاً ناممکن تھی عربی کی استعداد ٹھیک تھی لیکن نہ اتنی کہ ہم انہیں اپنا شاگرد بنا لیتے اور ایسی "عربی مبین" استعمال کرتے کہ ان کی استعداد اسے بآسانی ہضم کر لیتی۔

ڈاکٹر جرمانوس کے قبول اسلام کی خبر جب شانتی نکیتن میں پہنچی تو ایک کھلبلی مچ گئی اور تو اور خود گرودیو ڈاکٹر ٹیگور اس حادثہ کو خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت نہ کر سکے۔ اور اب وہی ڈاکٹر جرمان جنہیں خاص طور پر ہندوستان بلایا گیا تھا جنہیں گرودیو ٹیگور اور شانتی نکیتن کے دوسرے کارکن ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جن کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے قبول اسلام کے جرم میں معتوب و مقہور ہو گئے اب ان پر حقارت کی نظریں پڑنے لگیں وہ حیران تھے کہ جو ٹیگور انسانی اخوت کا عالمگیر برادری کا علمبردار ہو وہ عملاً اتنا تنگ دل نکلے کہ اپنی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا قبول اسلام برداشت نہ کر سکے پہلے اس کے چشم و ابرو پر بل پڑیں اور پھر وہ علانیہ دل کی بات زبان پر لے گئے۔ شانتی نکیتن کی اس تعصب پروری اور ڈاکٹر ٹیگور کی اس ناروا داری ان تمام لوگوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ جو دل سے ڈاکٹر ٹیگور کے ثنا خواں اور شانتی نکیتن کے مداح تھے۔

بہر حال اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر جرمانوس نے اپنی مدت معاہدہ ختم ہو جانے سے پہلے استعفیٰ دے دیا جسے بڑی مستعدی بلکہ شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا گیا اور ایک روز وہ اپنے وطن ہنگری شانتی نکیتن کی اس مہمان نوازی اور ڈاکٹر ٹیگور کی اس اصول پروری کا ایک گہرا نقش لے کر روانہ ہو گئے۔

خالدہ ادیب خانم

تو آبروئے ملتِ اسلام ہے

جامعہ ملیہ کے توسیعی لیکچروں کے سلسلہ میں خالدہ ادیب خانم ۱۹۳۵ء میں ہندوستان تشریف لائیں اور چند روز کے لیے بمبئی میں بھی ٹھہریں۔

مجھے یہ نہیں یاد وہ بمبئی میں مقیم کس کے ہاں ہوئی تھیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ایک روز بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی نے اپنے مکان پر انہیں چائے کی دعوت دی اور چند مخصوص اصحاب کو بھی مدعو کیا۔ مولانا عرفان مرحوم مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

ہم لوگ ملاقات کے کمرے میں جاکر بیٹھ گئے، سید صاحب تشریف رکھتے تھے ان سے مختلف مسائل پر بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد خالدہ ادیب خانم تشریف لائیں۔ ان کے ساتھ مسز کملا دیوی چٹوپادھیا بھی تھیں۔

خالدہ ادیب خانم کا ذکر بچپن سے کانوں میں پڑتا رہا تھا، یہ وہ شیر دل عورت تھی جس نے ترکیہ کے انقلاب میں مردانہ وار حصہ لیا تھا، جس نے مصطفےٰ کمال پاشا کو کامیاب بنانے اور برسرِ اقتدار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا تھا، جو عورت تھی لیکن اپنے ملک کو آزاد کرانے اور پنجۂ اغیار سے چھڑانے کے سلسلہ میں اس نے وہ کار ہائے نمایاں انجام دیئے تھے جن پر مردوں کو بھی فخر ہو سکتا ہے اور جو اب مصطفےٰ کمال کے استبداد و قہر مانیت کا ہدف بنی ہوئی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جس نے ترکیہ کو آزاد کرایا تھا۔ لیکن آزاد ترکیہ کے دروازے اس کے لیے بند تھے۔ جس نے اپنے وطن عزیز کو انقلاب، جہاد اور بغاوت کے راستہ پر گامزن کیا تھا۔ لیکن جو آج وطن کی سرزمین پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی تھی، لیکن وہ آج بھی مصطفےٰ کمال کی تعریف میں

رطب اللسان تھی۔ اور اپنے وطن کا نام سنکر جس کا چہرہ آج بھی دمکنے لگتا تھا۔

گورا رنگ، میانہ قد، بڑی بڑی آنکھیں، چہرے پر ضعیفی کی جھریاں، لیکن ان جھریوں میں بھی شباب رفتہ کا رنگ موجود، آواز لطیف اور شیریں، لیکن لب و لہجہ ایک سپاہی کی طرح فیصلہ کن اور باوقار، پردہ سے آزاد، لیکن دل مذہب کا اسیر، خیالات آزاد لیکن توازن کی دولت سے مالا مال، انداز کلام میں بے باکی، لیکن اس بے باکی میں بھی وقار نسوانی کی جھلک موجود۔

عرصہ سے پروپیگنڈہ ہو رہا تھا کہ ترک لامذہب ہیں، دہریے ہیں، انگریز بن چکے ہیں، لیکن آج آنکھوں کے سامنے جو ترک عورت بیٹھی تھی، وہ بیشک ہندوستان کے رواجی پردہ کی پابند نہ تھی، لیکن اس کی باتوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مذہب کی گرویدہ ہے اسے اپنے مذہب پر فخر ہے وہ دوسرے مذاہب کو بھی ٹٹول چکی ہے اور تلاش و تحقیق کے بعد وہ اسلام کو دنیا کا بہترین مذہب سمجھتی ہے۔ اور اپنے اسلام پر اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتی ہے۔ وہ اس لیے مسلمان نہیں ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی وہ اس لیے مسلمان ہے کہ اس کا یہ یقین و اعتقاد ہے کہ اگر کوئی مذہب قبول کیا جا سکتا ہے تو وہ اسلام کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی یہ باتیں سنکر اس کے ان تاثرات سے واقف ہو کر دل خوش ہوا پہلے سے جو ایک بدگمانی سی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔

مولانا عرفان نے پردہ اور اسلام کے بارے میں کچھ چبھتے ہوئے سوالات کیے، سوالات اس بنیاد پر کیے گئے تھے کہ آزاد ترکیہ کی ایک انقلاب انگیز عورت یہاں تک آگے بڑھ چکی ہے کہاں تک ترقی کے مراحل طے کر چکی ہے، اس نے بڑی سنجیدگی سے تمام سوالات کے جوابات دیے۔ اور انداز جواب سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک اس کے مسلمان ہونے کا تعلق ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے یہ ضرور ہے کہ وہ رواجی پردہ کی نہ پابند ہے نہ اسے پسند کرتی ہے، وہ ایسی مسلمان عورتیں دیکھنا چاہتی ہے جو شمشیر سے لے کر میدان جہاد میں غازیان تہور شعار کو پانی پلائیں، جو اسلام کے سرفروشوں کی مرہم پٹی کریں جو ملت اور مذہب کے لیے ہر تکلیف اور مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کریں۔ مولانا عرفان مجھ سے زیادہ بد اعتقاد اور بدظن ہو کر گئے تھے، لیکن مجھ سے زیادہ خوش اعتقادی اور حسن ظن کی دولت لے کر واپس آئے۔

اس ساری نشست میں گفتگو مولانا عرفان کرتے رہے، میں بالکل خاموش بیٹھا رہا مولانا نے خالدہ ادیب خانم اور کملا دیوی سے میرا تعارف پہلے ہی کرا دیا تھا "یہ روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر ہیں" مصافحہ کے بعد میں چپ چاپ بیٹھ گیا باتیں سنتا رہا۔ لیکن بحث و گفتگو میں میں نے کوئی حصہ نہیں لیا، میں دیکھ رہا تھا کملا دیوی کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی ہے لیکن کیوں؟ اس امر کو میں نہ سمجھ سکا۔

دوسرے روز خالدہ ادیب خانم سے متعلق کملا دیوی نے اپنے تاثرات ایک مقالہ کی صورت میں بمبئی کرانیکل میں شائع کرائے، جس میں اس محفل کا بھی ذکر تھا، اور اس محفل کے ذکر کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا "ایک جرنلسٹ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے لیکن اتنے شرمائے اور لجائے ہوئے کہ عورتوں کو بھی مات کر رہے تھے، کیا مجال ہے جو ایک لفظ بھی کئی گھنٹہ کی نشست میں انہوں نے اپنے منہ سے نکالا ہو، باتونی اخبار نویس تو میں نے بہت دیکھے ہیں، لیکن لب خاموش رکھنے والا یہ پہلا صحافی تھا جو میری نظر سے گذرا"

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے!

میرے لیے یہ فخر بھی کافی تھا!

غازی رؤف پاشا

ایک مجاہد، ایک غازی، ایک مصلح

جامعہ میں داخلہ سے پہلے، ایک روز وطن میں بھائی صاحب (سید عقیل احمد جعفری) کی الماری کی تلاشی ان کی عدم موجودگی میں لیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار "الہلال" کی ایک جلد ہاتھ میں آگئی، میں اسے لایا اور پڑھنے لگا، اس فائل میں پہلی جنگ عظیم ۱۴-۱۹۱۸ء کے دوران حوادث پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تبصرے، مصور خبریں، اور مسلمانان ہند سے پرزور اپیلیں سطر سطر پر نظر کا دامن اپنی طرف کھینچتی رہیں۔

ورق گردانی کرتے کرتے بیچ صفحہ کی ایک تصویر پر نظر پڑی، یہ ایک جہاز تھا ترکی بیڑہ کا سرمایہ فخر و ناز حمیدیہ! اس جہاز کی کمان امیر البحر رؤف پاشا کے ہاتھ میں تھی، اور اس یگانہ روزگار امیر البحر نے اپنے اس چھوٹے سے جہاز سے بڑے بڑے کام لئے تھے کبھی یہ ڈوبا تھا کبھی اچھلا تھا، کبھی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور کبھی گولے برساتا ہوا اور آگ کی بارش کرتا ہوا نمودار ہوگیا تھا، حمیدیہ جہاز اور ترکی بحریہ کا امیر البحر رؤف پاشا انگریزوں کے لیے ایٹم بم بنا ہوا تھا وہ رؤف اور حمیدیہ کا نام سنکر لرز جاتے تھے، ان کا بس چلتا تو ان دونوں کو سمندر کی تہہ میں غرق کر دیتے، الہلال میں نہایت تفصیل کے ساتھ حمیدیہ جہاز کے کارنامے اور رؤف پاشا کے کمالات حرب درج تھے، ترکوں سے عقیدت ہمیشہ سے تھی، لیکن رؤف پاشا نے اس عقیدت اور محبت کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔

مدت گذر گئی پھر نہ حمیدیہ کا نام سننے میں آیا نہ رؤف پاشا کا، ترکیہ پر مصطفےٰ کمال پاشا آمریت کی پوری شان کے ساتھ حکومت کر رہے تھے اور جن مجاہدوں نے مصطفےٰ کمال کو مصطفےٰ کمال بنایا تھا، جنہوں نے ترکیہ کو مصیبت کے بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا تھا، جنہوں نے اتحادیوں کی غلامی سے ترکی قوم کو آزاد کرایا تھا، وہ اب مصطفےٰ کمال

پاشا کے معتوب تھے اور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان جلاوطنوں میں بہت زیادہ ممتاز خالدہ ادیب خانم اور رؤف پاشا کی ہستیاں تھیں، رؤف پاشا پیرس میں مقیم تھے۔

آخر ۱۹۲۳ء میں دفعتاً ایک روز خبر گرم ہوئی کہ جامعہ میں لکچر دینے کے لیے غازی رؤف پاشا ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر تشریف لا رہے ہیں، اس خبر نے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی، حمیدیہ جہاز کا ہیرو، ترکیہ کے بحری بیڑہ کا سردار، ترکیہ جدید کا معمار ہندوستان آ رہا ہے، جامعہ کا مہمان بن رہا ہے، رؤف پاشا کے آنے سے پہلے تصور کے قلم نے اس مجاہد اور غازی کی دل نشیں تصویر کھینچ لی۔ کتنا بانکپن تھا اس تصویر میں!

آخر کار اشتیاق کی اندھیری رات ختم ہوئی اور صبح دید طلوع ہوئی رؤف پاشا آ گئے آج آنکھوں کے سامنے باہزاراں شان یکتائی و دلربائی وہ مرد مجاہد کھڑا تھا جس کی تلوار نے اسلام کے دشمنوں کی گردنیں کاٹی تھیں جس کے مجاہدات نے فرنگی سامراج میں تزلزل پیدا کر دیا تھا، جس کے یادگار معرکوں نے لائڈ جارج اور چرچل کی نیند حرام کر دی تھی، تصور کی آنکھیں جما کر دیکھا، یہ گورا گورا رنگ یہ بڑی بڑی آنکھیں! یہ بھرے بھرے بازو اس مرد مجاہد کے ہیں جو میدان جنگ سے ہمیشہ سرخرو ہو کر لوٹتا، دیکھ لو آج بھی اس کا چہرہ کتنا سرخ و سفید ہے سرخی ایسی ہے جیسے مجاہد کا خون، سفیدی ایسی جیسے فرشتہ کا دامن!

یہ وہ مجاہد ہے جس نے دشمنوں سے بھی جہاد کیا اور اپنے نفس سے بھی، جب فتوحات و مجاہدات کا ثمرہ لینے کا وقت آیا تو مصطفےٰ کمال نے اُسے اپنا دست راست بنانے کے بجائے معزول اور جلاوطن کر دیا۔ اور خالد ابن ولید کی طرح چودھویں صدی کے اس مجاہد نے بھی بے چون وچرا ہتھیار ڈال دیئے اور رختِ سفر باندھ کر اپنے دیس سے ایک مسافر کی طرح نکل کھڑا ہوا، حالانکہ اگر چاہتا تو خون کی ندیاں بہا کر اپنا اقتدار قائم کرا سکتا تھا۔

رؤف پاشا نے کئی روز تک جامعہ کے ہال میں ترکیہ کے ماضی وحال پر سبق آموز معلومات افزا اور پُرمغز لکچر دیے، خدا کی قدرت ہے میدانِ جنگ کا سورما تقریر کے میدان اور تحریکا دوڑ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، خلقت مور و ملخ کی طرح اُمڈی پڑ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا ایک فوج ظفر موج کے سامنے اس کا محبوب کمانڈر کھڑا ہوا تقریر کر رہا ہے۔

ان لیکچروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مصطفےٰ کمال یا ترکی حکومت کے خلاف ایک حرف بھی نہیں تھا، تھا کیا؟ اپنے وطن مقدس کی ترقیوں پر فخر، اپنی قوم کے اتحاد پر ناز، اپنی ملت کی وحدت پر اظہار مسرت، جس کا مصطفےٰ کمال بدترین دشمن تھا اور جو خود بھی یقیناً مصطفےٰ کمال کا دوست نہیں تھا، ایک ایسے مجمع میں جہاں اسے پوری آزادیٔ تقریر حاصل تھی اور جو اشتیاق کے ساتھ مصطفےٰ کمال کے خلاف نئے نئے معلومات اور انکشافات کا منتظر تھا اس طرح خاموش رہنا حرف شکایت کا زبان پر نہ لانا اور تعریف و توصیف میں بخل نہ کرنا صرف ایک بڑے آدمی کا بہت بڑے آدمی کا ایک بڑے دل کا بہت بڑے دل کا ذاتی سربلندیوں کو اجتماعی وقار، ملی اعزاز اور قومی وقار پر قربان کر دینے والے کا کام ہو سکتا ہے، ہر شخص کا نہیں ہے

سرمد غم عشق بو الہوس را نہ دہند
سوز غم پروانہ مگس را نہ دہند

حاضرین میں سے چند لوگ ضبط نہ کر سکے، انہوں نے اٹھ کر لیکچر کے بعد براہ راست مصطفےٰ کمال کے بارے میں، اس کی پالیسی کے بارے میں ترکیہ کے بڑے بڑے مجاہدوں اور غازیوں کی جلاوطنی کے بارے میں چبھتے ہوئے سوالات کئے، لیکن اس نے ایک غیر ملک میں اپنے ملک کے خلاف کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے ابھی کچھ عرصہ ہوا مسٹر چرچل نے امریکہ کے دوران سفر میں امریکی صحافیوں کے سوال و جواب میں موجودہ پریمیر اٹیلی کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کر دیا تھا، یہ ہوتا ہے زندہ قوموں کا کردار۔

خدا کا شکر ہے رؤف پاشا کو صدر عصمت انونو نے واپس بلا لیا اور اب وہ اپنے وطن میں ہیں اور وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔

علّامہ موسیٰ جار اللہ

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

انقلاب روس کے طوفان میں صرف زار کا استبداد اس کی قہرانیت اور اس کا وجود ہی خس و خاشاک کی طرح نہیں بہا، بلکہ اس ریلے میں بہت سے آبدار موتی لعل و گوہر اور آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بھی۔

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

علامہ موسیٰ جار اللہ روس کے ان ارباب فضل و کمال اصحاب زہد و تقویٰ اور سند نشینان علم و فضل میں سے تھے، جن پر نہ صرف روس کو بلکہ عالم اسلام کو ناز تھا۔

امارات اور ریاست کی گود میں آنکھ کھولی، عیش و تنعم کے گہوارہ میں پروان چڑھے دولت و ثروت کے جلوس میں عرصۂ زندگی میں داخل ہوئے، وہ روس کے بہت بڑے جاگیرداروں میں تھے اور عیش و کامرانی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اس انقلاب نے اُن کی دنیا بدل دی وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور ہندوستان آکر پناہ گزیں ہو گئے۔

ترکیہ روس افغانستان ایران ممالک عربیہ اکثر مقامات کے لوگ ہندوستان مہمان بن کر آئے، یہاں سر آنکھوں پر بٹھائے گئے، پھر اُنہوں نے اپنی شخصیت اور اپنی آن کو ختم کر کے یا دریوزہ گری شروع کر دی یا سجادۂ معرفت بچھا کر بیٹھ گئے ہر صورت میں فائدہ رہے۔

لیکن اپنی آن اور شان کے اعتبار سے موسیٰ جار اللہ کی شخصیّت ایک مخصوص انفرادیت کی حامل تھی، وہ ہندوستان اس حالت میں آئے کہ تہی دست اور بے نوا تھے ان کے قدر شناس اور مداح پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے، خود ان کے ہم وطن مسلمان بھی خاص تعداد میں موجود تھے، اور ان میں سے بعض کامیاب کاروبار کے مالک تھے اور دل میں ان کی عظمت اور عقیدت رکھتے تھے، لیکن کیا مجال ہے کہ اس گدائے متکبر نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہو، کسی کی امداد و اعانت قبول

کی نہ کسی کے خوانِ کرم کی ریزہ چینی کی ہو، فاقے کئے عسرت و فلاکت میں زندگی بسر کی۔ پھٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے، لیکن نہ کسی کے دسترخوان پر بیٹھا، نہ کسی کی جیب پر للچائی ہوئی نظر ڈالی۔

۱۹۲۲ء کے آغاز میں یہ خلافت کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، میرا خلافت سے تعلق منقطع ہو چکا تھا اور میں اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہندوستان نکال رہا تھا مجگاؤں میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور وہیں مقیم تھا کہ بیمار ہوا، قطب صاحب خلافت ہاؤس کے مہمانخانہ میں مجھے اُٹھا لائے، میرا کمرہ اور علامہ موسیٰ جار اللہ کا کمرہ بالکل ملا ہوا تھا۔ اس طرح کئی ہفتے تک یکجائی رہی اور مجھے اُن کے دیکھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا۔

میں نے دیکھا یہ شخص صرف یہی نہیں کہ باغی دل و دماغ کا مالک ہے اپنے سینہ میں انقلاب اور تغیر کا طوفان پنہاں رکھتا ہے جس طرح مجلس علم کا بلبل خوشنوا ہے اسی طرح میدانِ کارزار کا سورما بھی ہے بلکہ عابد شب زندہ دار بھی ہے، ضعف اور کہولت کے باوجود نماز اس ذوق اور جوش و خروش سے پڑھتا ہے، جیسے اس کا کام نماز کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں اور وظائف کا سلسلہ بھی جاری ہے تہجد کی پابندی بھی ہے، لیکن باہمہ اور بے ہمہ، کیا مجال جو خلافت ہاؤس کا کھانا کبھی کھایا ہو، اگر جیب میں کچھ پیسے ہیں تو خود ہی ایک پتیلی پر اپنے کمرہ میں کچھ پکا رہے ہیں ایک کیتلی میں چائے گرم ہو رہی ہے اور اگر جیب خالی ہے تو پتیلی بھی سربند رکھی ہوتی ہے اور کیتلی بھی۔ پھر حکومت ہند نے انہیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا ابھی حال میں رہا ہوئے ہیں۔

موسیٰ جار اللہ کے جو خیالات روس کے بارے میں ہیں اُن سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کے تقدس، حسن نیت اور بے لوثی سے انکار نہیں ہو سکتا۔

ابوالکلام آزاد

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اُردو کی پسماندہ صحافت میں الہلال نکال کر ابوالکلام نے ایک نئے شاندار اور یادگار دور کا آغاز کیا۔ الہلال کے ساتھ ابوالکلام کا طرزِ انشا بھی اتنا انوکھا اور نرالا تھا کہ جو سمجھ گیا اس نے بھی داد دی اور جو نہ سمجھ سکا داد دینے پر وہ بھی مجبور ہو گیا۔

۱۹۲۲ء میں کہ میں ندوہ کی ابتدائی جماعت کا ایک طالب علم تھا، علی برادران کے ساتھ ابوالکلام بھی لکھنؤ آئے، رات کو رفاہِ عام کے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ مسلمانانِ لکھنؤ کا منعقد ہوا، ندوہ سے کئی طالب علم جلسہ کی شرکت کے لیے گئے میں بھی ساتھ ہو لیا، بڑی دیر تک مولانا کی تقریر ہوتی رہی مگر میری سمجھ میں کچھ خاک نہ آیا، گھر میں بچپن سے ابوالکلام کا ذکر عقیدت و عظمت کے ساتھ سنتا چلا آ رہا تھا، میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد صاحب جعفری تو ابوالکلام کے پرستاروں میں تھے، اسی پروپیگنڈہ کا اثر تھا میں رفاہِ عام کے جلسہ میں چلا گیا، لیکن جا کے پچھتایا کہ نہ معلوم یہ اتنے مشہور کیوں ہیں؟

اگست ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی مشہور زمانہ نہرو رپورٹ قیصر باغ کی بارہ دری (لکھنؤ) میں پیش ہوئی، ندوہ کے طلبہ، قومی معاملات میں عملی حصہ لینے کے خوگر تھے۔ اور مقامی قومی کارکن قومی تقریبات کے مواقع پر ان کے جذبات سے فائدہ اُٹھانے کے عادی تھے۔ اس آل پارٹیز کانفرنس کے سلسلہ میں بھی ندوہ سے رضا کاروں کی طلبی ہوئی، ندوی رضا کاروں کے دستہ کا ایک فرد میں بھی تھا۔

میرے ذمہ ڈیوٹی یہ تھی، کہ چند رضا کاروں کے ساتھ چار باغ اسٹیشن پر موجود رہوں، اور جو زعمائے قوم اور رہنمایانِ ملت تشریف لائیں انہیں منزلِ مقصود تک

پہنچانے کے انتظام میں اپنے سردار کا ہاتھ بٹاؤں۔

ہر ٹرین پر دس پانچ معمولی اور دو چار بڑے "لیڈر" تشریف لاتے رہتے تھے کوئی ٹیلر پیلس میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا ذاتی مہمان ہے، کوئی ٹھاکر نواب علی کے "قصر فلک نما" کو اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہے، آخری ٹرین سے مولانا ابوالکلام تشریف لائے، آپ کی پیشوائی کیلئے ہم معمولی رضا کاروں کے علاوہ چند سربرآوردہ شخصیتیں بھی پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھیں، مہاراجہ محمود آباد کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر سعید الرحمن قدوائی موجود تھے اور ندوہ کے ارباب انتظام کی طرف سے نواب علی حسن خاں ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے بڑے صاحبزادے امیر حسن صاحب کو بھیجا تھا لیکن مولانا نے دونوں دعوتیں بڑی خندہ پیشانی اور وسعت قلب کے ساتھ مسترد کر دیں، انہوں نے فرمایا، میرے بھائی یہ سچ ہے آپ مجھے اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں، لیکن مجھے آرام ہوٹل ہی میں ملے گا، قبل اس کے کہ سعید الرحمن صاحب یا امیر حسن صاحب مزید اصرار فرمائیں، مولانا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر محمد جان کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو چکے تھے، ان دونوں میزبانوں کی حالت اس وقت قابل دید تھی۔

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

میں نے سوچا یہ کیسا اکل کھرا لیڈر ہے جو مہاراجہ اور نواب جیسے جلیل القدر میزبانوں تک کی دعوت پوری شان استغنا کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے ـــــ عجیب شخص ہے!

پھر یہ دیکھا کہ آل پارٹیز کانفرنس کے ایوان زرنگار میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں، کبھی بپن چندر گوپال گرج رہے ہیں، کبھی مسز اینی بسنٹ کی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا لیڈر اپنی گرمیٔ گفتار کے کمالات دکھا رہا ہے، لیکن ابوالکلام صاحب ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں، پرائیویٹ مجلسوں میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، لیکن جلسہ عام میں مہر بہ لب،

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

بعض لوگوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے اس اجتماع کو مجلس مشاعرہ اور نہرو رپورٹ کو اس کا مصرعہ طرح سمجھ کر مولانا سے بھی طبع آزمائی کی درخواست کی، لیکن مولانا نے انکار فرمادیا، میرے بھائی تقریریں کافی ہو چکیں کسی مزید تقریر کی کیا ضرورت ہے۔" مہاراجہ محمود آباد پاس بیٹھے تھے، انہوں نے بھی بڑا اصرار کیا۔ اب مولانا نے زبان کے بجائے صرف گردن سے جواب دینا شروع کیا۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

میں رضا کار کی حیثیت سے ڈائس کے قریب کھڑا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، حیرت اس پر تھی کہ یہ شخص مہاراجہ کے اصرار کو بھی خاطر میں نہیں لایا، جس کی شاعرانہ تعریف مسز سروجنی نائیڈو تک نے اپنی مچھے دار تقریر میں کر ڈالی ـــــــــ خوب ادائیں ہیں اس لیڈر کی بھی! زمانہ اور آگے نکل گیا!

۱۹۳۲ء میں مولانا دہلی آئے، میں بھی اس زمانہ میں دہلی میں تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا معلوم ہوا مولانا کچھ روز دہلی ہی میں بسر کریں گے، دریا گنج میں انہوں نے عرصہ سے ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی، اسی میں یہ مقیم تھے الٹ دو ق کوٹھی خود بدولت اور دو ملازم یہ تھے اس وسیع مکان کے مکین۔

اپنے دوست عبدالسلام قدوائی کے ساتھ میں روانہ ہوا، ہم دونوں پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم مسز آرونا آصف علی کے ساتھ پہنچ گئے، ہمارے لیے حاجب و دربان کی پابندی تھی، اذنِ باریابی کی ضرورت تھی، یہ دونوں ان رسمیات سے بالا تھے، ہم ملازم سے التجا کر رہے تھے کہ مولانا کو اطلاع کر دے وہ ابھی ہماری اس التجا پر اپنا فیصلہ نہ صادر کر پایا تھا کہ یہ دونوں لیڈر آئے اور دڑاتے ہوئے اندر چلے گئے اور اس طرح کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے آخر ہم لوگ واپس آ گئے۔

از در یار چہ گویم بہ چہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

یہ زمانہ تھا کہ میں مولانا کے افکار سیاسی سے سخت بیزار تھا، لیکن الہلال، البلاغ اور تذکرہ پڑھ چکا تھا، ان کی قابلیت ذہانت اور بڑائی کا سکہ اختلافِ فکر و نظر کے

باوجود دل پر بیٹھ چکا تھا۔

چند روز بعد ہم دونوں پھر پہنچے۔ آج زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا، ملازم بھی سمجھ گیا شاید کہ مستقل مزاج لوگ ہیں، درشن کیئے بغیر واپس نہ جائیں گے، اس نے ہمیں لائبریری میں بٹھایا، اور خود اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پردہ اُٹھا اور مولانا نمودار ہوئے، بڑی شفقت اور رحمت کے ساتھ ہم نیازمندوں کے ساتھ پیش آئے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا، کیا وجہ ہے کہ مؤطا امام مالک "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ" نہیں مانی جاتی اور بخاری مانی جاتی ہے، حالانکہ امام مالک زمانی اعتبار سے بھی امام بخاری کے مقابلہ میں رسول اللہ سے اقرب تھے؟ اور بخاری کے رواۃ کا وہ درجہ اصحاب خبر کے نزدیک نہیں جو مؤطا کے رواۃ کا ہے۔ اس سلسلہ رواۃ کو تو "سلسلۃ الذہب" کہا جاتا ہے؟ مولانا غور سے میرے معروضات سنتے رہے، پھر فرمایا آپ جو کچھ کہتے ہیں، صحیح ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مؤطا درسی کتاب نہیں ہے، علاوہ ازیں اس میں زیادہ تر آثار ہیں نہ کہ اقوال و احکام اور بخاری زیادہ تر اقوال و احکام پر مشتمل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صدیوں سے نصاب درس میں داخل ہے اس کی ایک ایک حدیث اور ایک ایک روایت ہزاروں لاکھوں بار جانچی اور پرکھی جا چکی ہے، پھر ایک محویت کے ساتھ فرمایا "سچ کہا تھا ابن حجر نے بخاری کا اُمت پر قرض ہے اور وہ قرض آجتک باقی ہے" یہ جملہ بار بار مولانا نے دہرایا "قرض" کے لفظ پر خاص زور دیتے تھے۔

میں نے دوسرا سوال کیا، سارق کے قطع ید کی مصلحت کے بارے میں اس سوال کو بھی مولانا نے غور سے سُنا، پھر فرمایا، اسلام بجائے خود ایک نظام ہے اور یہ نظام اپنے تمام جزئیات کے ساتھ ہی بروئے کار آسکتا ہے، آج اگر زانی کو سنگسار کر دیا جائے، چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو یہ ظلم ہو گا، لیکن اگر اسلام کا نظام برسر عمل ہو، ایسی سہولتیں مہیا کر دی جائیں کہ فطرت صحیح چوری یا زنا کی طرف مائل ہی نہ ہو سکے، اور پھر بھی کوئی شخص زنا کرے یا چوری کا مرتکب ہو، تو یقیناً وہ اس کا مستحق ہے، کہ اسے عبرت انگیز سزا دی جائے۔

اس جواب سے اندازہ ہوا کہ سیاسیات کے کانٹوں سے اپنا دامن الجھانے کے

باوجود یہ شخص اپنے اصل موضوع، اسلامیات پر اتنی ہی گہری نظر رکھتا ہے جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔

آخر میں ایک سوال اشتراکیت کی "حلت وحرمت" کے بارے میں قدوائی صاحب نے کیا، جواب ملا، "یہ ایک تجربہ ہے اور یہ تحریک جب تک تجربہ کے دور سے نہ گزرے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

اب مغرب کا وقت ہوچکا تھا، ہم نے اجازت چاہی اور واپس چلے آئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

آغاز میں ہم کیا تھے، انجام میں ہم کیا ہیں؟

۱۹۳۳ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پائجامہ، حیدرآبادی وضع کی شیروانی، داڑھی ندارد غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئی، انگریزی تراش کے بال خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے، میں نے مولانا عرفان سے پوچھا، آپکی تعریف؟ فرمایا، ابوالاعلیٰ مودودی۔

اس نام کا مسمیٰ آنکھوں کے لیے نیا تھا۔ لیکن کانوں کے لیے نیا نہ تھا؛ بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ کے افکار و دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے "ترجمان الجمعیۃ" کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی اور اسے بام عروج پر پہنچایا، ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اوّل میں پہنچا دیا، سوامی شردھانند کے حادثہ قتل کے بعد جس نے "اسلام اور تشدد کا مسئلہ" اس موضوع پر اتنے عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی، مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہو گئے، اور اب عرصہ سے جس کی ادارت میں حیدرآباد سے رسالہ "ترجمان القرآن" نکل رہا تھا، جس کے مقالات، اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ نظر اور اہلِ علم کے لیے باعث فخر و رشک ہو گئے تھے، باتیں کیں تو معلوم ہوا خدا نے ذہانت کے ساتھ ساتھ علم، گہرائی اور فکر، کی نعمت بھی عطا کی ہے۔ ابھی تک مولانا بڑے آدمی نہیں بنے تھے، دنیا سے بے نیاز بھی نہیں ہوئے تھے، حیدرآباد کے ایک حاکم باختیار تک ——— ساحل بمبئی پر ——— جو ولایت سے آ رہا تھا ——— اپنے ایک عزیز

کی سفارش پر سنیما نے تشریف لائے تھے، لیکن باتوں میں، لب و لہجہ میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا، بے موقع تبسم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں، خلا ملا سے پرہیز تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی اور خاموشی، بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں اور مولانا ان سے پورے طور پر مسلح تھے۔

کئی روز تک مولانا مقیم رہے اور اس عرصہ میں کئی بار آپس میں گفتگو ہوئی، شام کو مولانا عرفان نے حسب عادت موٹر گیرج سے نکالی، وہ ڈرائیوری کر رہے تھے اور میں اور مولانا مصروف تکلم تھے، سارے شہر کی سیر کر ڈالی لیکن گفتگو کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، مولانا نے سنیما دیکھنے کی دعوت دی جسے ہمارے مہمان نے ایک بے نیازی کے ساتھ مسترد کر دیا، دوران قیام میں کئی آدمی ترجمان القرآن کے خریدار مولانا عرفان کی کوشش سے بنے، جن میں صدر خلافت سید مرتضیٰ بہادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا نے خلافت کے تبادلہ کو کہا جس نے منظور کر لیا، ترجمان القرآن کے مکمل فائل دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، حیدرآباد پہنچتے ہی تمام پرچے بغیر کسی یاددہانی کے بھیج دیئے، بس یہ ایک ایسی بات تھی جو بڑے پن کے منافی تھی۔

مولانا کے واپس جانے کے بعد ایک روز مولانا عرفان سے ان کا تذکرہ چھڑا، میں نے کہا مولانا کی قابلیت، ذہانت، بالغ نظری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن جیسا باطن ہے ظاہر ویسا نہیں ہے، یہ بات ذرا دل کو کھٹکتی ہے۔ مولانا نے فرمایا جس نے باطن بدل دیا ہے وہ ظاہر کے بدل دینے پر بھی قادر ہے اور میاں اصل چیز تو باطن ہی ہے۔ ظاہر میں کیا رکھا ہے، میں اس دلیل سے لاجواب ہو گیا۔

لیکن رفتہ رفتہ میرے دل کی کھٹک دور ہوتی گئی، قرآن کے اس ترجمان اور اسلام کے اس شارح اور پیامبر پر اسلام کا رنگ چڑھتا چلا جا رہا تھا اور بہت جلد یہ نوبت پہنچ گئی کہ وہ شروع سے آخر تک "صبغۃ اللہ" میں رنگ گیا اور اس رنگ سے بہتر اور چوکھا رنگ نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے اور آج یہ عالم ہے کہ ابوالاعلیٰ کے نظریات اسلامی اور تصورات دینی سے سنجیدہ اور مدلل اختلاف رکھنے والے متعدد بزرگ ملیں گے، لیکن اس کی اسلامیت پر حرف گیری کرنے والا اس کا بدترین دشمن بھی نہیں، کیوں نہ ہو، خدا کی دین ہے وہ چاہے تو انسان کا ظاہر اور باطن سب کچھ بدل دے سکتا ہے!۔۔

مولانا آزاد سبحانی

ایک بلند پایہ مقرر ایک یگانۂ روزگار خطیب

مسجد کانپور کے حادثۂ انہدام کے سلسلہ میں مولانا آزاد سبحانی شہرت کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی برطرفی کے بعد کلکتہ کی امامت عید تک شہرت اور ناموری کے بہت سے مراحل خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے طے کر لیے، تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں، تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں، بہت بڑے فلسفی بھی ہیں تقریر میں فلسفیانہ تحلیل و تجزی کے کمالات اور دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ندوہ کی مجلس میلاد انہوں نے پڑھی تھی، مولانا ظفر الملک علوی کے خیالات میں اور ان کے خیالات میں ہمیشہ بعد المشرقین رہا ہے، لیکن وہ خاص طور پر سائیکل پر سوار ہو کر محض ان کی تقریر سننے آئے تھے اور آخر وقت تک نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنتے رہے تھے، ایک دوست نے پوچھا آپ خلاف معمول کیسے تشریف لے آئے، فرمایا صرف مولانا آزاد سبحانی کی تقریر سننے!

میں جب جامعہ میں داخل ہوا تو مولانا آزاد سبحانی کی "گاڑھا تحریک" اور "حکومت ربانیہ" کی تحریک زور شور سے جاری تھی، مولانا کے صاحبزادے بھی جامعہ میں پڑھتے تھے، اس وجہ سے اکثر مولانا جامعہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا کرتے تھے جب آتے تھے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو شرف عطا کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنا مہمان بنائیں، اور وہ بڑی خوشی سے یہ سعادت حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔

ایک بار مولانا جامعہ تشریف لائے میں انجمن اتحاد کا نائب صدر تھا بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ مولانا کو تقریر کی دعوت دی جائے، میں ذاکر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا ایک

چارپائی پر لیٹے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے میں نے تقریر کی دعوت دی فلسفیانہ استغراق و تامل کے بعد قبول فرمائی گئی، طے پایا کہ رات کو تقریر فرمائیں گے۔

محمد علی ہوسٹل میں تقریر کا انتظام ہوا، حاضرین مولانا کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے کہ دفعتاً کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی مسلسل آوازیں آنا شروع ہوئیں، نظر اٹھائی تو مولانا کھٹ پٹی پہنے ہوئے خراماں خراماں مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں، گاڑھے کا ایک تہ بند زیب بر، تہ بند کا باقی حصہ رونق دوش و سر، بال کمتر سیاہ زیادہ تر سفید، لیکن سفیدی دودھ کی سفیدی نہ تھی، اس پر خاکساری کا رنگ غالب تھا، ہم میں سے بہتوں نے سمجھا مولانا کے لیے موزوں ترجگہ اسٹیج کے بجائے خانقاہ ہو سکتی تھی یا کسی مسجد کی کوٹھری شاید مولانا نے یہ بات بھانپ لی، مسکراتے ہوئے اٹھے، اور تبسم کے ساتھ تقریر شروع فرمائی، یہ بے موقع تبسم بھی ناگوار گزر رہا تھا، جی چاہتا تھا اس تبسم کا جواب قہقہہ سے دیں۔

اب مولانا کی تقریر شروع ہو چکی تھی، ڈھلے ہوئے فقرے، موزوں اور مناسب الفاظ، چست اور معنی خیز جملے، صاف اور شیریں زبان، واضح اور نشین بیان خیالات زبان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، زبان خیال بلند پرواز کی بلندیوں پر دلوش دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے، جن کے خیالات گرانمایہ ہوتے ہیں وہ "بے زبان" ہوتے ہیں لیکن یہ شخص اقلیم خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستان زبان کا بھی تاجدار، کیا خدا کی قدرت ہے، صورت دیکھئے تو ہیچ میرز باتیں سنئے تو معلوم ہو شاعر نے یہ شعر انہی کے لیئے کہا ہے ؎

مبیں حقیر گدایان قوم را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

مولانا اسلم جیراج پوری

از ماہجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

بلند پایہ عالم ہیں، تاریخ اسلام پر وسیع نظر رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں لیکن تاریخ الامت بہت مشہور و مقبول ہے، پہلے علی گڑھ کالج میں اسلامیات کے معلم تھے پھر جامعہ ملیہ کی تاسیس ہوئی، علی گڑھ کی آرام دہ نوکری چھوڑ دی اور جامعہ کے غریب خانہ میں آکر بیٹھ گئے، جامعہ پر بڑے بڑے نازک وقت آئے لیکن اس ادارے سے ان کی وفاداری کبھی متزلزل نہ ہوئی۔

مسلک اہل قرآن کے تابع ہیں، قدرتاً حدیث کو حجت نہیں مانتے ان کے نزدیک وہی حدیث ہے جس کی عمل متواتر سے تائید ہو، مسلک کے صواب و خطا سے بحث نہیں لیکن ان کی مذہبیت، صداقت، دیانت اور دینی حمیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ نماز بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں اور حتی الامکان باجماعت اپنے مسلک پر سختی سے قائم ہیں، لیکن اس موضوع پر گفتگو اسی سے کرتے ہیں جو خود کرنا چاہے، ورنہ خاموش رہتے ہیں۔

دل، بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی ہے بلکہ اس میں ان "فنون لطیفہ" کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔

برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست!

جس زمانہ میں مولانا حدیث کی مذہبی حیثیت کے خلاف مقالات تحریر فرما رہے تھے میں نے کئی مقالے ان کے جواب میں لکھے، مولانا خود بھی رسالہ جامعہ کے ایک مدیر تھے انہوں نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ انہیں جامعہ میں شائع کیا اور کبھی ایک لفظ ایسا نہیں کہا جس سے یہ اندازہ ہو کہ برہم ہیں، کبھی ایک بات ایسی نہیں کی جس سے یہ شبہ

ہو کہ ناراض ہیں، شفقت و عنایت کا جو سلوک جامعہ میں میرے داخل ہونے کے روز تھا بالکل یہی سلوک اس وقت بھی تھا جب میں تیز و تند لہجہ میں ان کے مقالات کے خلاف مقالات لکھ رہا تھا صرف یہی نہیں اس وقت بھی اور اس وقت کے بعد بھی اگر کوئی موقع آیا تو انہوں نے میرے حق میں کلمہ خیر کہے، اور اخلاقی امداد پہنچانے سے ذرا بھی دریغ نہیں کیا، سچ تو یہ ہے کہ مولانا کے اس کردار نے میرے دل پر ایک ایسا نقش بٹھا دیا ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

مولانا عربی ادب پر بھی بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں اور فارسی ادب کے ماہر بھی ہیں ہنگامہ آرائیوں کے اس زمانہ میں میری طبیعت فارسی کی طرف مائل ہوئی میں نے مولانا سے اس شوق کا اظہار کیا انہوں نے فوراً بغیر کسی تامل کے اوقات درس میں سے وقت نکال کر مجھے فارسی پڑھانا شروع کر دیا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے چاہا، مولانا کی مستعدی اور توجہ میں کبھی ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

مولانا کا سب سے بڑا اور میری نظر میں قابل تقلید وصف یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی طلبہ کو اپنے ذاتی خیالات و معتقدات سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی صرف اپنے کام سے کام رکھا، ان کے متعدد شاگردوں کو ان کے مسلک کا علم اس وقت ہوا جب انہوں نے جامعہ میں ان کے مقالات دیکھے ورنہ وہ برسوں سے پڑھ رہے تھے اور ان کے فیض تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے تھے، کبھی انہیں شبہ نہیں گزرا کہ مولانا کے مسلک میں انفرادیت ہے اور وہ اپنا کوئی مخصوص اور جداگانہ مسلک رکھتے ہیں

مولانا جید عالم ہیں لیکن ان کے لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا، نہ جبہ اور عمامہ کے پابند ہیں نہ وعظ و تلقین کے، عام آدمیوں میں عام آدمیوں کی طرح رہتے ہیں، یہ ہے ان کی بے نفسی اور بے لوثی!

مولانا حیدر حسن خاں

عالمِ باعمل، صوفیِ باصفا

مولانا حیدر حسن خاں صاحب، سابق شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔

ہمیشہ رہے ہے نام اللہ کا

ان کی دلربا شخصیت ان کا یگانہ فضل و کمال ان کا زہد و تقویٰ ان کی سیرت سے اچھی صورت اور صورت سے بہتر سیرت، ان کی شفقت و محبت، اپنوں سے ان کی والہانہ فریفتگی، بیگانوں سے ان کا مخلصانہ برتاؤ اس طرح کے واقعات ایک ایک کر کے دماغ کے پردہ پر یوں ابھر آتے چلے گئے جیسے پردۂ سیمیں پر تصاویر متحرک۔

میں ۱۹۲۳ء میں ندوہ کے درجہ اوّل میں داخل ہوا، اس وقت میری عمر مشکل سے ۱۱-۱۲ سال کی ہوگی۔

پہلی مرتبہ دارالاقامہ (بورڈنگ) کی زندگی سے آشنا ہوا، عصر کے بعد اکثر لڑکے فیلڈ چلے جاتے اور ہاکی کھیلتے، کچھ امین آباد کے اور قیصر باغ کے سبزہ زاروں کی سیر کو نکل جاتے، بعض گومتی کے کنارے جاتے نہاتے سیر کرتے روانیِ آب کا منظر دیکھتے، چند ندی کے کنارے کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے اور اپنے دوستوں یا ساتھیوں کے کھیل پر نقد و تبصرہ کرتے، جنہیں اخبارات سے دلچسپی ہوتی وہ "الاصلاح" چلے جاتے اور اخبارات و کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے لیکن میں اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر کے خوب روتا، جب تک مغرب کی اذان نہ ہو جاتی، میرا بہترین مشغلہ رونا اور گھر کو یاد کرنا تھا۔

ایک روز اتفاق سے میں باہر نکلا، دفتر کے سامنے کھڑا ہوا کوئی نوٹس پڑھ رہا تھا، اتنے میں ایک صاحب اوپر سے اترے، میانہ قد، دبلا بدن، دودھ کی طرح سفید داڑھی

سرخ و سفید چہرہ جیسے کشمیر کا سیب، سر پر ایک پگڑی، ہاتھ میں ایک چھڑی، آنکھ میں
ایک خاص قسم کی چمک، لمبا کرتا، اونچا پاجامہ میں نے بعض بزرگوں سے سنا تھا اور جنات
رہتے ہیں، یقین ہو گیا، یہ کوئی جن ہیں، جو نوٹس میں پڑھ رہا تھا دفعتاً اس کے حروف
آنکھوں کے سامنے غائب ہونے لگے، پاؤں لڑکھڑانے لگے، اور میں بے ساختہ رونے لگا۔

کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہے مفتی محمد یوسف صاحب ظہر کا وضو کر رہے تھے دفعتاً ان پر
فالج کا حملہ ہوا، اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ وہ تنہا ہی رہتے تھے اور مولوی گنج میں یہ حادثہ
پیش آیا، ندوہ میں اطلاع پہنچی سب کو افسوس ہوا، لیکن مولانا (جنہیں میں آئندہ مولوی صاحب
لکھوں گا، میں انہیں اسی لفظ سے پکارا کرتا تھا) بے قرار ہو گئے۔ ندوہ میں اس دن تعطیل
تھی، فوراً مولوی گنج گئے ایک پالکی میں انہیں لٹا کر ندوہ لائے، یہاں ان کے لیے ایک
کمرے کا انتظام کیا، فوراً ڈاکٹر نعیم انصاری کو بلایا، کچھ دیر بعد میڈیکل کالج کے ایک
ڈاکٹر کو بلوایا انہیں بیس روپیہ فیس کے دیئے اور دو طالب علموں کی ایک ایک گھنٹے کے
لیے ڈیوٹی لگائی، تاکہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔

ندوہ میں مفتی صاحب کے دوست شاگرد و رفیق سب تھے مگر کسی میں وہ بیکلی
وہ اضطراب، وہ بے قراری میں نے نہیں دیکھی جو مولوی صاحب میں تھی، ان کی نورانی
آنکھوں سے موتی کی طرح آنسو ٹپکتے تھے۔

کئی سال گذر گئے میں درجہ ششم میں پہنچ گیا، اب میں ندوہ کا ایک خاموش طالب علم
نہیں تھا، اب میں ایسا طالب علم تھا جو باغی تھا سرکش تھا، سٹرائیک ہو تو وہ پیش پیش
ہنگامہ ہو تو وہ اس کا قائد، تنظیم "الاصلاح" میں جلسے ہوں تو وہ "لیڈر آف دی ہاؤس"،
رہنمایان قوم اور بزرگان ملت کی خدمت میں سپاسنامے پیش ہوں، ان کے اعزاز میں جلسے
ہوں، انہیں پارٹیاں دی جائیں تو وہ رکن رکین اساتذہ میں بعض مجھ سے خوش تھے، بعض
"نالاں" اور ناخوش، "استادوں میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب بھی تھے، مولوی صاحب
ان لوگوں میں تھے، جن کی رائے تھی کہ طالب علمی کے زمانہ میں کوئی اور کام نہ کرنا چاہیے
میں اور سب کام کرتا تھا، طالب علم ہی کا کام نہیں کرتا تھا لہٰذا ان کی خفگی بجا تھی۔

اس سال مولوی صاحب کا بھی ایک گھنٹہ ہمارے درجہ میں تھا، ترمذی کا درس وہ
دیتے تھے، پہلے دن جب میں گیا تو وہ میری جانب مخاطب بھی نہیں ہوئے، ایک ہفتہ

اسی بیگانگی کے عالم میں گذر گیا۔

مولوی صاحب کا طرز تعلیم اور اسلوب تحقیق اتنا دلکش اور نرالا تھا کہ چند ہی دنوں میں حدیث سے مجھے خاص رغبت ہو گئی، اب ان کے درس میں شریک ہوتا تو مطالعہ کر کے تیار ہو کے تھوڑے سے ہی دنوں میں وہ مجھ سے اتنے خوش ہو گئے کہ درجہ میں مجھ سے زیادہ کوئی طالب علم ان کی نظروں میں محبوب نہیں تھا، بعض طالب علموں نے صرف ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے داڑھی میں اضافہ کر لیا تھا، ہر مسئلہ میں مولوی صاحب کی ہر آواز کے ساتھ جزاک اللہ اور مرحبا کے نعرے بلند کرنا انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا میں نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی کبھی کبھی میں مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج، استدلال اور استنباط سے مطمئن نہیں ہوتا تھا اور اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ مثلاً قرأت خلف الامام اور مسئلہ طلاق میں آخر تک مولوی صاحب کی دلیلوں سے مطمئن نہیں ہوا، لیکن ان کی شفقت و محبت کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی، انہوں نے تین طالب علموں کی ایک مجلس بنائی تھی جو گویا ان کے "ریسرچ اسٹینٹ" تھے، مصطفیٰ کریم ندوی ایم۔ ایس سی (علیگ)، عبدالسلام قدوائی، ندوی (ادارہ تعلیمات اسلام) اور راقم الحروف ہم تینوں کو اوقات درس کے علاوہ مولوی صاحب اپنے دارالحدیث میں یاد فرماتے تھے۔ اور روزانہ دو ڈیڑھ گھنٹے تک کسی خاص موضوع پر کتب حوالہ سے مواد جمع کراتے، رواۃ کے بارے میں آراء جمع کراتے صحاح ستہ سے اور دوسری کتب حدیث سے اسی موضوع پر ہم معنی حدیثیں جمع کراتے مسئلہ کی مخالفت اور موافقت میں حفاظ اصحاب اخبار اور ارباب رائے کے خیالات جمع کراتے اور پھر اپنی تحقیق انیق شروع کرتے تھے، اتنی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے بڑے بڑوں کے لیے اس سے اختلاف کرنا ناممکن ہو جاتا تھا، ان کا بالکل وہی طرز تھا جو "بدایۃ المجتہد" میں ابن رشد نے اختیار کیا ہے، حلقہ درس میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ ان کی ڈسک پر، شلف پر، مسند پر، میز پر، سامنے کی الماری میں درجنوں کتب حوالہ موجود رہتی تھیں، جہاں کوئی مختلف فیہ مسئلہ آیا اور انہوں نے زبانی لکچر دینے کے بجائے انہی کتابوں سے مخالف اور موافق مواد طلبہ کے سامنے پیش کیا، پھر اپنی رائے، دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غیر حنفی طلبا بھی مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے مطمئن ہو جاتے تھے سوائے ہمارے ایک "کٹر اہلحدیث" ساتھی عبدالجلیل صاحب

فیصل کے، وہ جب بہت زچ ہو جاتے اور ہیں مولوی صاحب کے سامنے انہیں چھیڑتا تو برہم ہو کے فرماتے "ہم کیا جواب دیں، ہمارے عالموں سے مناظرہ کر دو تو معلوم ہو"۔ مولوی صاحب ان کے اس جواب سے بہت محظوظ ہوتے۔

مولوی صاحب کو بر بنائے دلائل حنفیت سے بڑی شیفتگی تھی مذاہب اربعہ میں وہ حنفیت کو سب سے زیادہ کتاب و سنت سے قریب سمجھتے تھے اپنی اس رائے کی تائید میں وہ بڑے ٹھوس اور وزنی دلائل بھی رکھتے تھے، امام ابو حنیفہؒ سے انہیں عقیدت نہیں عشق تھا، امام صاحب کا نام آیا اور ان کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوئی، ان کا خیال تھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ان کے بعد کے مصنفین کرام نے بہت زیادہ ظلم کیا ہے، امام صاحب کی مظلومیت نے ان کے دل کو رقیق بنا دیا تھا۔ ان کی حالت،

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے!

کے مصداق ہو گئی تھی۔

امام بخاری کی تاریخ صغیر میں امام ابو حنیفہ کے لیے "جعل الاسلام عروۃ" آیا ہے، ان الفاظ کا جب حوالہ دیا، یا یہ الفاظ جب انہیں یاد آجاتے تو ان کے سیل گریہ میں گرد دوں کف سیلاب تھا۔

پھر مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوتا تھا، امام بخاری کو تو حفظ مراتب کے خیال سے کچھ نہ کر سکتے تھے البتہ روتے اور دوسروں کو رلانے کی کوشش کرتے امام صاحب کی مظلومیت کا ایسا دردناک نقشہ کھینچتے کہ امام عالی مقام حسین علیہ السلام کے بعد انہیں کی مظلومیت مسلم ہو جاتی، یہ موضوع جب چھڑ جاتا تو اصل سبق رہ جاتا، دوسرا گھنٹہ شروع ہو جاتا لیکن مولوی صاحب کی تقریر اسی جوش سے جاری رہتی جس جوش سے شروع ہوئی تھی، ہم اٹھنا چاہتے، وہ پکڑ پکڑ کر بٹھاتے دوسرے گھنٹہ کا کافی حصہ ختم ہو جاتا، لیکن مولوی صاحب کی تقریر ختم نہ ہوتی، آخر ہم لوگ با چشم گریاں اور با سینۂ بریاں اٹھتے کم از کم مولوی صاحب ہم میں سے اکثر سعادت مندوں کے متعلق یہی سمجھتے کہ وہ ان سے زیادہ متاثر ہیں۔

اگر کسی دن ہمارا پڑھنے کو جی نہ چاہتا تو مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی اپنا ہاتھ آنکھوں تک لے جا کر میری طرف اشارہ کرتے، مطلب یہ آج محفل عزا برپا ہونی چاہیئے،

میں کسی نہ کسی طرح امام صاحب کا ذکر کرتا، پھر تاریخ صغیر کا پتھر جعل الاسلام عروۃ " کا بس پھر کیا تھا
اب کہاں کا سبق اور کہاں کا درس، کیسی تحقیق اور کدھر کی رسترح ؟

پھر چھڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

مولوی صاحب کو اپنے علم وفضل کی بنا پر جن لوگوں نے انہیں دور سے اور دور رہ کر دیکھا ہے
وہ بھی مانتے ہیں ـــــــ یگانہ تھے، لیکن جن لوگوں نے ان کے حلقۂ درس کی شرکت کی ہے
ان کا طرز تحقیق دیکھا ہے، ان کی حاضر دماغی کا مشاہدہ کیا ہے ان کے حسن استدلال کو پرکھا ہے
ان کی وسعت نظر کو جانچا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری درسگاہوں کے حلقۂ درس میں بھی
شرکت کی ہے دوسرے شیوخ کا طرز تعلیم بھی دیکھا ہے ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ مولوی صاحب
اپنے علم وفضل کی بنا پر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بلاد اسلامیہ میں بھی یگانہ تھے فرد فرید تھے
" لا شریک لہ " تھے۔ ان کے زمانہ میں بھی ہم نے بہت سے علماء اور شیوخ کو دیکھا، اب بھی دیکھتے
ہیں، لیکن حیدر حسن خاں کی سی بات نہیں پاتے۔

وہ بات کو ہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ!

یوں تو مولوی صاحب بے انتہا خاکسار، سراپا عجز، ہمہ تن فروتنی تھے لیکن اپنی علمی منزلت
سے واقف تھے صرف واقف ہی نہیں بلکہ قدر شناس بھی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کو خاطر
میں کم لاتے تھے طبیعت میں باینہمہ زہد وتقویٰ شوخی، مزاج میں تازگی اور باتوں میں سنجیدہ ظرافت
اور متین ظرافت کی وہ آمیزش ہوتی تھی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب بعض انتظامی تبدیلیوں کے ماتحت ہمارے بورڈنگ "شبلی
ہوسٹل" کے اتالیق مقرر ہوئے، اب اور زیادہ قرب اور ہم نشینی کی سعادت حاصل ہوئی۔
مولوی صاحب اگرچہ بڑے پکے حنفی تھے، لیکن نماز فجر غلس میں ادا کرتے تھے بڑے
سویرے وہ بہ نفس نفیس ہر کمرے میں تشریف لیجاتے، ہر طالب علم کو اٹھاتے۔
بورڈنگ کا ایک کمرہ نماز کے لیے وقف تھا، ابھی مسجد نہیں بنی تھی، گرمی کے
موسم میں بہت تکلیف ہوتی جگہ بھی کم تھی انہوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ باقاعدہ
اجازت حاصل کی جائے، مزدور لگیں اور دفتری طور پر کام ہو۔ بہ نفس نفیس چبوترہ کی تعمیر

اپنے دست مبارک سے شروع کر دی، ہم بھی پہنچ گئے دیکھا دیکھی اور بہت سے طالب علم بھی شامل ہو گئے، لیجیے دو ہی دن میں چبوترہ تیار ہو گیا وہاں اذان کی آواز گونجنے لگی. تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے تہلیل اور تسبیح کا مشغلہ شروع ہو گیا!

جب مولوی صاحب دارالاقامہ کے اتالیق بن گئے اور ہم لوگوں پر زیادہ محنت صرف کرنے لگے. اس قرب مکانی نے ان کے دل کو بھی ہم سے قریب کر دیا تھا، خارج اوقات میں وہ پہلے بھی ہمیں پڑھاتے تھے اور اب زیادہ وقت دینے لگے اتنا زیادہ کہ بعض وقت طبیعت اُکتا جاتی اور اب اپنی نہی بختی پر افسوس ہوتا ہے.

مولوی صاحب کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ "علم" اس وقت تک نہیں حاصل ہوتا، جب تک منطق اور فلسفہ میں درک حاصل نہ ہو.

سنہ میں ایک معمولی بات پر دفعتہً ندوہ میں اسٹرائک ہوئی عبدالسلام صاحب اس مجوزہ اسٹرائک کے سخت حامی تھے اور میں شدید مخالف "الاصلاح" کا ناظم میں تھا، شروع کے دو دنوں میں اس ہنگامہ سے میں بالکل الگ رہا۔ ایک دفعہ عبدالسلام صاحب مجھ سے کنوینگ فرما رہے تھے، چاہتے تھے میں بھی اسٹرائک میں شریک ہو جاؤں، میں نے پوچھا اس کا مقصد کیا ہے؟ فرمایا اسٹرائک میں نے کہا "اسٹرائک کا مقصد اسٹرائک" ارشاد ہوا "ہاں" اس جواب پر کچھ غیر ذمہ دارانہ حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں، شام کو طلبہ کا عام جلسہ ہونے والا تھا کہ اسٹرائک ہو یا نہ ہو جلسہ میں بڑی، جوش، غضب اور جنون کا طوفان امنڈ رہا تھا.

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

نعرے لگ رہے ہیں۔ زندہ باد اور مردہ باد کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی الگ الگ ٹولیاں مشوروں میں مشغول ہیں۔ ہر "لیڈر" محاذ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے، عوام کالانعام جان دے دینے تک پر تیار ہیں، جوش ہے کہ بڑھتا جاتا ہے ہر ہر لمحہ ایک نئے طوفان کا آئینہ دار، ہر نظام برہم ہر اصول شکستہ، ہر ضابطہ ناقابل احترام

دوسری طرف اساتذہ کے جلسے ہو رہے ہیں، ارکان مشورے کر رہے ہیں، ارباب اقتدار نظم و امن کی بحالی کے انتظامات میں مصروف ہیں، آج کی رات فیصلہ کن رات ہے، یا ادھر یا اُدھر، یا سر پر کامیابی یا تختہ نامرادی، یہ جوش یہ ولولہ یہ ہنگامہ یہ ہجوم یہ شور دار و گیر الامان والحفیظ.

عشار کے بعد جلسہ ہوا، جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، چھوٹے اور بڑے سمجھ دار اور ناسمجھ، سنجیدہ اور پُرجوش، گوشۂ اعتکاف میں بیٹھنے والے اور بزم یاراں میں چہچہانے والے اساتذہ کے نیاز مند اور باغی سب ہی جمع تھے، مجمع کے ایک سرے پر تماشائی کی حیثیت سے، ایسے تماشائی کی حیثیت سے جو عنقریب خود تماشہ بننے والا تھا، میں بھی کھڑا تھا۔

عبدالسلام صاحب نے صدارت کے لیے میرا نام پیش کر دیا۔ یہ "رشوت" تھی، میں نے انکار کیا۔ لیکن آیئے آیئے کے شور میں میری آواز دب گئی، میں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ارباب اقتدار کو اپنی اسٹرائک سے دبالیں گے تو یہ غلط ہے، اور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ کامیابی ہو یا ناکامی ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، تو بسم اللہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، سب نے کہا ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، میں نے کہا، توکل صبح سے اسٹرائک کیجئے اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیئے۔

صبح ہوتے ہی اسٹرائک شروع ہو گئی، ہر ہر دروازہ پر پکیٹرس موجود تھے۔ بڑے دروازہ پر چند دوستوں کے ساتھ میں کھڑا تھا۔ پکٹنگ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ڈے اسکالرس بھی اندر جانے نہ پائیں، بورڈنگ کے تو سب لوگ ہمنوا تھے ہی کٹپنگ کامیاب ہوئی۔ اور ایک طالب علم کی بھی حاضری نہ لکھی جاسکی۔ سب غیر حاضر تھے، سب باغی تھے، سب نافرمان تھے ان میں بعض "کل نافرمان" بھی تھے۔

ندوہ کی تاریخ میں اتنی مکمل، ہمہ گیر اور مؤثر اسٹرائک کبھی نہیں ہوئی تھی، دو روز بعد جب اسٹرائک کرنے والے طلبہ کے نام خارج ہوتے تو حد ہو گئی، ان میں ابواللیث (مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم کے پوتے) اور صلاح الدین (مولانا عبدالودود صاحب معلم منطق و فلسفہ کے فرزند ارجمند) بھی تھے۔

جوش برابر بڑھتا جا رہا تھا نئی نئی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں، کبھی سننے میں آتا کہ پولیس بلائی گئی ہے، کبھی مشہور ہوتا کچھ طلبہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ افواہیں آگ پر تیل کا کام کرتی تھیں۔

دوسرے روز صبح سے مطبخ بند کر دیا گیا، اس سے بھی طلبہ کے عزم و ولولہ میں کوئی

فرق نہیں آیا، آپس میں چندہ ہوا، اور بڑی پتیلیاں مٹی کے نئے بنے ہوئے چولہوں پر چڑھ گئیں، اور کھچڑی پکنے لگی، پتیلیوں میں بھی اور دماغوں میں بھی۔

تیسرے یا چوتھے روز شام کو میں مجیب (عبد المجیب ندوی بی اے، ایل ایل، بی) کے ساتھ ڈالی گنج سیر کو گیا، ہم دونوں اکثر اسٹیشن کی طرف یا کسی اور طرف نکل جاتے تھے، مغرب کے بعد ہم واپس آئے تو دیکھا کہ صحن میں ایک جم غفیر، جمع ہے اور بہت پرجوش (لیکن بے آہنگ) آوازیں آرہی ہیں، آگے بڑھے تو معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی "گھیرے میں" لے لیے گئے ہیں، بیچ میں وہ کھڑے ہیں،

ہر کجا بود چشمۂ شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

کا سماں آنکھوں کے سامنے "مردم و مرغ و مور" پرا باندھے کھڑے ہیں، عمامہ کی سفیدی دیکھتے ہی سمجھ گیا، سید صاحب ہیں، آگے بڑھا، عرفان خاں (حافظ محمد عرفان خاں ندوی بی اے جامعہ تحصیلدار بھوپال) اپنے چھوٹے سے لیکن (دیدہ زیب) قد کے ساتھ ایک ایک بالشت اچھل کر بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہے ہیں، میں نے انہیں خاموش کیا اور سید صاحب سے گفتگو شروع کر دی، معلوم ہوا مراد آباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا جلسہ ہے اور وہ وہیں تشریف لے جا رہے ہیں، میں نے زیر لب عرض کیا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا مے روی

انہیں جلدی تھی اور وہ چاہتے تھے اپنے سامنے ابھی معاملہ طے کر کے جائیں۔ وہ جس شفقت، ملاطفت، مرحمت اور عطوفت کے ساتھ پیش آ رہے تھے مجمع اس سنس SENSE میں اس کا خیر مقدم نہیں کر رہا تھا، سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی میں اس پر کھڑا ہوا، اور تقریر شروع کر دی اور سید صاحب کی مداخلت کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، اصل میں سید صاحب جس طرح اس گتھی کو سلجھا رہے تھے وہ بہترین چارہ کار تھا، لیکن مشتعل مجمع صلح سے ہمیشہ بیزار رہتا ہے، میری تقریر کے بعد بھی بہت سے لوگ مطمئن نہیں ہوتے، البتہ عام طور پر ایک پرامید فضا پیدا

ہوگئی افسوس ہے کہ بعد میں سید صاحب کی مداخلت کارگر نہیں ہوئی اور معاملہ پھر وہیں کا وہیں رہ گیا، اس مشتعل مجمع کے فرد ہمارے عمران خاں (حافظ محمد عمران خاں ندوی) فاضل ازہر مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء بھی تھے، یہ حضرت زبان سے تو کچھ نہیں گویا ہوئے البتہ پورے عزم و ثبات کے ساتھ اپنے لیڈروں کی کمزوری پر پہلے تو خوب آنسو بہائے اور پھر بھوک ہڑتال شروع کر دی ساری رات فاقہ سے گزر گئی۔ دوسرے روز کا بڑا حصہ اسی طرح گزر گیا، مگر اس شیر مرد نے ایک دانہ تو بھی نہ استعمال کیا۔ حالانکہ اقبال کا قول ہے کہ

ہمیشہ نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

عرفان پہلے خوشامد کر کے اور بعد میں پٹ کے اور سگ باش برادر خورد مباش کا عملی تجربہ کر کے خاموش ہو گئے، دوستوں نے سمجھایا ناکام رہے ساتھیوں نے التجائیں کیں، لیکن وہ نگاہ غضب سے (ٹھوکر سے نہیں) ٹھکرا دی گئیں، اب میں پہنچا میں نے منا لیا۔

لائیے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

یہ اتنی لمبی داستان بیان ہوگئی، مگر اس میں مولوی صاحب کا ذکر جمیل نہ آیا؟ وہ بھی سن لیجئے، مولوی صاحب توقع کے مطابق اسٹرائک کرنے والوں کے سخت مخالف تھے، بے حد نالاں اور برہم تھے، پٹھان تھے اور غصہ ور بھی، ہر وقت اپنی جیب میں ایک بالشت کا چاقو رکھتے تھے کہ کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا اور اس کا دیدۂ گستاخ باہر نکالا۔

اس سارے عرصہ میں مولوی صاحب سے نہیں ملا، عمداً نہیں ملا، کس آنکھ سے ملتا؟ کس دل سے ملتا؟ کس زبان سے ملتا؟

راہ میں وہ ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

وہ ہوسٹل کے نگراں اور اتالیق تھے، لیکن میرا کمال دیکھئے میں نے ان کا آمنا سامنا ہونے ہی نہیں دیا۔

اسٹرائک کے ختم کرنے کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی، تعطیل کر دی جائے چنانچہ دو مہینے کی تعطیل کر دی گئی، سب لوگ منتشر ہو گئے، میں مجیب اور عبد السلام تین آدمی رہ گئے کہ لکھنؤ میں رہ کر کام کو جاری رکھیں گے۔

طلبہ کے رخصت ہونے کا منظر بھی دل ہلا دینے والا منظر تھا کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوں نجم الدین کی دواعی نظم نے تو سماں باندھ دیا تھا۔

اب تک ہم مولوی صاحب کی عزت ایک شفیق اُستاد ایک وسیع النظر عالم ایک علامہ دوراں ایک شیخ الحدیث ایک متقی اور پرہیزگار صوفی کی حیثیت سے کرتا تھا، لیکن اب وہ وقت آرہا ہے کہ مولوی صاحب ایک انسان ایک کامل العیار انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، ان کی ساری حیثیتیں مدہم پڑجاتی ہیں، یہ حیثیت سب پر بالا ہوتی ہے وہ مافوق الانسان نہیں تھے صرف انسان ہی کے متعلق غالب نے کہا ہے:۔

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

انسان کامل وہی ہے جس میں کوئی خلا نہ ہو، اگر ہو بھی تو وہ خود بخود پُر ہوجاتا ہے ہمارے مولوی صاحب ایسے ہی انسان تھے خدا ان کی تربت عنبریں کرے!

تعطیل کلاں ختم ہوئی، دارالعلوم کے نئے میقات کا آغاز ہوا، ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسٹرائک ہوئی ہی نہیں تھی۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

لوگ آتے تھے، معافی نامہ پر دستخط کرتے تھے اور داخل ہوجاتے تھے، ان میں بعض مجبور تھے، بعض بدنفس، پانچ آدمی ممنوع الادخال تھے، عبدالسلام، مصطفےٰ کریم، نجم الدین، عبدالحی اور میں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازاں تدبیرِ ما؟

نجم الدین اور عبدالحی اپنے اپنے گھر پر تھے، میں اور عبدالسلام لکھنؤ میں تھے، ہم نے ارادہ کیا کہ جامعہ جائیں، اتفاق سے مولانا عبدالودود صاحب سے ملاقات ہوئی، مولانا بڑے لطف و عنایت سے پیش آئے، انہوں نے اصرار کیا "تم بھی داخلہ کرالو"، میں نے کہا "معافی جو مانگنی پڑے گی" فرمایا "تم مجھ سے ہاں کہہ دو، باقی سب کچھ میں کرلوں گا، تم نہ معافی مانگنا نہ معذرت نامہ لکھنا، میں خاموش ہوگیا، انہوں نے کوشش شروع کردی، لیکن ناکام رہے، اور خاموش ہوگئے۔

عبدالسلام صاحب کی مولوی صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی، میں اب تک ان سے نہیں ملا تھا عبدالسلام صاحب کا بیان تھا مولوی صاحب اس طرح ملے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، میری اور

ان کی قسمت پر افسوس کرتے رہے۔ اب انہوں نے کر ہمت باندھی، سید صاحب لکھنؤ ہی میں تھے ان سے ملے، وہ بیچارے تو راضی تھے لیکن اساتذہ ارکان اور ناظم صاحب کا عندیہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ناظم صاحب خلاف تھے اساتذہ حامی تھے، متعدد ارکان کے پاس مولوی صاحب بہ نفس نفیس کنولیسنگ کی غرض سے تشریف لے گئے مولوی عبدالباری صاحب ندوی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) کے "غریب خانہ" واقع ڈالی گنج بھی اس حالت میں پاپیادہ تشریف لے گئے کہ بخار چڑھا ہوا تھا، گرمی کا موسم تھا اور سورج پوری حدت کے ساتھ چمک رہا تھا، مولوی صاحب کی یہ کوشش جاری تھی کہ میں خیر آباد چلا آیا، عبدالسلام صاحب لکھنؤ ہی میں رہے، پھر وہ بھی وطن چلے گئے۔ چند روز بعد مولوی صاحب کا خط پہنچا، سب کچھ طے ہوگیا، رئیس کو بھی اطلاع کر دو، اور تم دونوں فوراً ندوہ پہنچ جاؤ۔ عبدالسلام صاحب نے خود مجھے خط لکھا، میں حالات ایسے دیکھ آیا تھا کہ مجھے یقین نہیں تھا مولوی صاحب کو کامیابی ہوگی، میں نے جواب دیا جب تک دفتر سے باقاعدہ اطلاع نہ آجائے جانے میں جلدی نہ کرو، لیکن انہوں نے مولوی صاحب کا خط پاتے ہی بوریہ بستر باندھا اور لکھنؤ پہنچ گئے، مولوی صاحب فوراً مہتمم صاحب کے پاس گئے اطلاع دی عبدالسلام آگئے ہیں، رئیس آنے والے ہیں، مگر مہتمم صاحب کے پاس نظامت سے نیا حکم آگیا تھا کہ ان مجرموں کو داخل نہ کیا جائے مہتمم صاحب نے یہ خبر مولوی صاحب کو سنائی وہ سناٹے میں آگئے، کتنے خوش ہو کر گئے تھے اور کتنے ملول و غمگین واپس آئے۔

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، عبدالسلام سے کیا کہیں؟ اسی روز شام کو عبدالسلام صاحب خیر آباد پہنچے اور تمام واقعات کی اطلاع دی، اب جامعہ جانے کی رائے اور زیادہ پختہ ہوگئی جو کچھ ہوا تکلیف دہ ضرور تھا، لیکن خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔

چند روز بعد میں لکھنؤ پہنچا، ندوہ ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا، اب اتنے عرصہ کے بعد ــــ مولوی صاحب سے ملا۔

ہمیں ندوہ چھوڑنے کا کافی غم تھا، یہ وہ سرزمین تھی جہاں ہم نے عقل کی آنکھیں کھولیں۔ بصارت اور بصیرت حاصل کی، پڑھا اور بہت کچھ سیکھا، یہاں کا

چپہ چپہ کونہ کونہ گوشہ گوشہ ہمارے لیے مرکز جذب و کشش تھا، ہماری انجمن آرائیوں کا راز داں تھا، ہماری محفل طرازیوں کا غماز تھا، جب ہم ندوہ سے جامعہ روانہ ہو رہے تھے تو بے ساختہ یہ شعر میری زبان پر آ گیا۔

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو
ٹکڑے تو ڈھونڈ لیں دل صد پاش پاش کے

اب وہ احباب کہاں؟ وہ بے تکلفی کی مجلس کہاں؟ وہ قہقہے اور چہچہے کہاں وہ بے فکری اور نشاط خاطر کہاں؟ اب ایک نئی دنیا میں جا رہے تھے، نئے ماحول سے سابقہ پڑ رہا تھا نئے لوگوں سے دوچار ہو رہے تھے وہاں ہر چیز نئی بنانا ہوگی، دوستی بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گی تعلقات بھی از سر نو قائم ہونگے۔ رسم و راہ کا سلسلہ بھی نیا ہوگا۔ یہاں ہر چیز پہلے سے کئی سال کے رہن سہن سے بنی ہوئی چلی آ رہی تھی .... بہرحال ان غم آگین خیالات سے ہم کافی متاثر تھے، لیکن مولوی صاحب کی حالت ہی کچھ اور تھی، وہ رو رہے تھے سچ مچ رو رہے تھے ان کی حور جنت کی طرح پاک آنکھ آنسو بہا رہی تھی انہیں عبدالسلام اور رئیس کی جدائی شاق تھی حالانکہ یہ دونوں ان کی خاک پا بھی نہ تھے، مگر رسم و راہ تو بڑی چیز ہے۔ وہ تو کچھ دور تک شرف ہمرکابی حاصل کرتی ہے۔

عبدالسلام مجھ سے دو روز پہلے دہلی چلے گئے تھے۔ تیسرے روز جب میں روانہ ہوا تو اسٹیشن پر بہت سے دوست الوداع کہنے آئے تھے ان میں ایک بزرگ دوست بھی تھے، یہ ہمارے مولوی صاحب تھے وہ اپنے عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں سے محبت کرنے والوں اور تعلق رکھنے والوں سے یہی برتاؤ کرتے تھے۔

ہم لوگ جامعہ میں داخل ہو گئے ——— جامعہ کا عہد بہار بھی ایک مفصل داستان کا طالب ہے ——— گرمیوں کی تعطیل قریب آئی دفعتاً دل میں خیال پیدا ہوا، ندوہ میں بھی تعطیل ہونے والی ہے، کیوں نہ اس مشترک تعطیل سے فائدہ اٹھایا جائے، فوراً مولوی صاحب کو خط لکھا، توقع سے پیشتر جواب آیا وہ تیار تھے اس پر تیار تھے کہ اپنی دو مہینے کی تعطیل غارت کر دیں گے، اس پیرانہ سالی میں وطن نہیں جائیں گے، اس جھلسا دینے والی لو اور تڑپا دینے والی گرمی میں لکھنؤ میں رہیں گے تکلیفیں برداشت کریں گے، مصیبتیں سہینگے، بے آرامی اٹھائیں گے لیکن اپنے دو محبوب شاگردوں کا دل میلا نہیں کریں گے ان کا دامن آرزو گوہر مراد

سے بھر دینگے انہیں اپنے در سے خالی نہیں پھیرینگے۔

لکھنؤ پہنچے، ندوہ گئے، بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرہ میں ڈیرہ ڈالا، سارا بورڈنگ خالی تھا، طلبہ جا چکے تھے، اساتذہ رخصت ہو چکے تھے، شاگرد پیشہ بھی چھٹی منا رہے تھے صرف چند دور دراز کے طالب علم تھے اور ایک چپراسی، سب سے بڑی دقت کھانے کی تھی، مطبخ بند تھا، ہمیں اپنی فکر نہیں مولوی صاحب کی تھی، ہم تو ہر طرح گزر کر سکتے تھے لیکن مولوی صاحب، بس سوال یہ تھا، عبدالسلام صاحب کو غرّہ تھا کہ وہ "دال روٹی" پکا لیتے ہیں، اسی بھروسہ پر دال اور آٹا لایا گیا، مولوی صاحب کو بھی ہم نے اپنے ساتھ شریک کر لیا، ارہر کی دال پکی، ویسی ہی جیسی اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی ایک "بچگانہ" نظم میں تصویر کھینچی ہے۔

دال ارہر کی بے مزہ پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

اب روٹی کی باری آئی، کوئی قتاش نما، کوئی مربع دیکھن مدوّر کوئی نہیں، یہاں تک بھی غنیمت تھا، سخت اتنی جیسے چمڑا، ایک کونہ میرے ہاتھ میں تھا دوسرا مولوی صاحب کے ہاتھ میں، ہم دونوں زور لگا رہے ہیں لیکن وہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی، عبدالسلام صاحب کی اس "مہارت" پر مجھے غصہ آ رہا تھا، مولوی صاحب ہنس رہے تھے۔ اور یہ حضرت خود مسکرا رہے تھے۔

دوسرے دن باقاعدہ بخاری کا درس شروع ہو گیا، اوقاتِ درس ملاحظہ ہوں:۔
نماز فجر کے بعد سے ۱۲ بجے دوپہر تک یعنی جب تک کھانا نہ آ جائے، پھر نماز ظہر کے بعد سے عصر کے وقت تک، پھر مغرب کے بعد سے عشا تک چھٹی جمعہ کو بھی نہیں، بغیر اس پروگرام کے اتنے مختصر عرصہ میں ہم بخاری کیونکر ختم کر سکتے تھے؟

مولوی صاحب کے سامنے عبارت پڑھنا یعنی قرأت کرنا آسان نہ تھا وہ آخری حرف کے اعراب پر خاص زور دیتے تھے کہ صاف پڑھا جائے، خواہ وہ اسم ہو علم ہو، فعل ہو، کچھ ہو، مثلاً ان کے سامنے "عن عکرمہ" یا "عن ابی ہریرہ" ہرگز نہیں پڑھ سکتے ضروری تھا کہ آخری حرف کا اعراب نمایاں کیا جائے یعنی "عن عکرمۃ" یا "عن ابی ہریرۃ" پڑھا جائے، پہلے روز عبدالسلام صاحب نے قرأت کی، دو ایک جگہ اسماو اعلام کے آخری

حرف کو ساکن پڑھا، مولوی صاحب نے ٹوکا تو گڑبڑا گئے اور گھبرا کر کچھ غلطیاں کر بیٹھے، مولوی صاحب برابر ٹوکتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ درس کی رفتار سست رہی، دوسرے دن بھی یہی ہوا، تیسرے دن بھی عبدالسلام صاحب کچھ سوچتے جاتے تھے (یہ پرانی عادت ہے)، اور پڑھتے جاتے تھے اور کچھوے کی طرح خراماں چل رہے تھے، مولوی صاحب نے مجھ سے کہا "میاں تم پڑھو"، میں نے ٹالنا چاہا معذرت کی جس میں انکسار سے زیادہ خود شناسی کو دخل تھا، لیکن انہوں نے پھر اصرار فرمایا "میاں تم ہی پڑھو" میں نے

درین دریائے بے پایاں درین طوفاں موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

کہہ کے قرأت شروع کر دی، آدھا صفحہ پڑھ گیا، مولوی صاحب نے کہیں نہیں ٹوکا، اب میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے فراٹے بھرنا شروع کیئے کہ عبدالسلام صاحب منہ دیکھتے رہ گئے، اب تو مولوی صاحب پر میرا سکہ جم گیا، حاضر و غائب ستائش ہو رہی ہے، میاں! (میاں تکیہ کلام تھا) رئیس تو ایسی عبارت پڑھتا ہے، اتنا شوقین ہے کہ کیا کہوں؟ اب مستقل طور پر قرأت میرے ذمہ ہو گئی، جب تک درس کا سلسلہ جاری رہا قرأت میں ہی کرتا رہا، درس اتنی تیز رفتاری کے ساتھ جاری تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک دن میں ایک ایک پارہ بخاری کا ہم نے ختم کر لیا، یونہی رواروی میں نہیں اسی شان تحقیق و تدقیق سے، اسی غور و فکر سے، اسی ہر ہر حوالے اور ہر ہر بحث پر سیر حاصل مذاکرہ کے ساتھ جو مولوی صاحب کے حلقۂ درس کی ممتاز، نمایاں اور شاید واحد خصوصیت تھی ایک دن جمعہ کے بعد پڑھنے کو جی نہ چاہا، مولوی صاحب کو اطلاع دیئے بغیر ہم دونوں ڈالی گنج چلے گئے۔ وہاں سے مرمرے، شکر اور برف لیتے آئے کہ ستو بنائیں گے ہم اپنے کام میں مشغول تھے کہ مولوی صاحب اپنا سُرخ رومال لپیٹے ہوئے اس چلچلاتی دھوپ میں آتے دکھائی دیئے، وہ ہماری "خیریت" معلوم کرنے تشریف لا رہے تھے، ان سے ہم نے کہہ دیا "آج جمعہ ہے، امین آباد بھی جانا ہے اب کل پڑھیں گے، مولوی صاحب "اچھا میاں" کہہ کر واپس چلے گئے۔

مولوی صاحب ایک عزیز شاگرد کے ایک ضروری کام سے چند روز کیلئے دارالمصنفین

گئے، اب ہم بیکار تھے، ندوہ کا کتب خانہ کھلا ہوا تھا، اپنے استاد مولوی کلیم احمد صاحب ندوی سے میں "فسانہ آزاد،، کی چار جلدیں لایا اور ختم کر دیں۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد مولوی صاحب واپس آ گئے، نہ آرام لیا نہ سستائے آتے ہی انہماک اور شغف کے ساتھ تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ایک روز حلقۂ درس پورے زور کے ساتھ جاری تھا، قدم قدم پر مولوی صاحب داد تحقیق دے رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامنے کی کتاب کا صفحہ الٹا ایک پرزہ کاغذ نظر آیا، جس پر مولوی صاحب کے "نو مرحوم،، بھتیجے یا بھانجے کے ہاتھ کی یادداشت لکھی ہوئی تھی، مولوی صاحب ان مرحوم کو بہت چاہتے تھے، ان کے ہاتھ کے نقوش جو نظر آئے، تو مولوی صاحب کی آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر پھر گئی، سلسلۂ درس منقطع کر کے اسی پرزہ پر نظر جما دی "کئی بار ہا! میاں!" فرمایا، میں نے پوچھا "کیا بات ہے مولوی صاحب؟،، انہوں نے مرحوم کے فضائل وحسنات، ان کے اوصاف وکمالات اور ان کی جواں مرگی کا حال ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا کہ ہم دونوں خلصے متاثر ہوئے۔

اب آگے بڑا نازک مرحلہ آتا ہے، مولوی صاحب نے مرحوم کا سراپا بیان کرنا شروع کیا اور خاص زور ان کی "کھالی داڑھی،، پر دیا، مولوی صاحب جب جوش بیان میں ہوتے تھے نوک کا لفظ کھ فرماتے تھے مثلاً کالا کو کھالا، کہتے تھے، جب کھالی داڑھی نے طول کھینچا اور مکررات کی صورت اختیار کر لی تو قطعاً بلا ارادہ اور بالکل بے ساختہ مجھے ہنسی آگئی، اور میں زور سے ہنس پڑا، مولوی صاحب بڑے نازک دماغ بھی تھے، کیا مجال جو کوئی خلاف شان حرکت برداشت کر لیں انہوں نے دفعتاً پوچھا "کیا ہوا میاں؟ کیوں ہنسے؟" میرے لیے یہ کٹھن گھڑی تھی، مولوی صاحب کو اگر یقین ہو جاتا کہ ان کے بیانِ غم پر مجھے ہنسی آئی ہے تو شاید میں ہمیشہ کے لیے ان کی بارگاہ میں مردود ہو جاتا، لیکن

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

دفعتاً مولوی صاحب کے کوئی ملنے والے آ گئے، وہ ان کی طرف مخاطب ہو گئے، جب یہ صاحب چلے گئے تو میں نے غم والم کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے پھر مرحوم کا ذکر چھیڑا، اور ہمہ تن متوجہ ہو کر مولوی صاحب کا بیان سنتا رہا۔

ندوہ میں ہمارے ابتدائی دور کے ایک ساتھی وصی احمد صاحب (جو اب طبیہ کالج دہلی میں پڑھتے تھے) لکھنؤ آئے اور سیدھے ہمارے پاس آ گئے اپنے علیل بھائی کو لے

کر آئے تھے جن کا آپریشن ہونے والا تھا، آپریشن ناکام ہوا دوسرے روز ان کا انتقال ہو گیا، ظاہر ہے ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا، انتظامات میں مدد دینا وصی احمد صاحب کے لیے جملہ امکانی آسانیاں بہم پہنچانا ہمارا فرض تھا، وہ ہمارے ندوی بھائی تھے، ان کے بھائی گویا ہمارے بھائی تھے، حامد صاحب نے کفن وغیرہ کے انتظامات میں وصی احمد صاحب کی مدد کی، جب ہم لوگ تجہیز و تکفین و تدفین کے ارادے سے جانے لگے تو مولوی صاحب سے اجازت لی، حالانکہ وصی احمد صاحب مولوی صاحب کے شاگرد نہیں تھے، لیکن محض انسانی ہمدردی سے وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے، میں نے کہا، مولوی صاحب اس گرمی میں آپ کہاں زحمت کریں گے، یہاں سے عیش باغ تک پاپیادہ جانا اور آنا ہے، کوئی ۸-۹ میل کا چکر ہو گا، لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ سنی فرمایا، "واہ میاں مجھے کیا سمجھتے ہو کیا میں اتنا بوڑھا ہوں کہ ایک مسلمان کی میت کو کاندھا بھی نہ دوں ؟ وہ کسی طرح نہ مانے اور ہم سب کے ساتھ عیش باغ تک جہاں قبرستان تھا گئے، برابر میت کو کاندھا دیتے رہے۔ واپسی پر وہ آسانی سے یکہ پر واپس آسکتے تھے، لیکن چونکہ آٹھ دس آدمی ساتھ تھے اور یہ سب پیدل جا رہے تھے، مولوی صاحب کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ تنہا یکہ پر بیٹھ کر الگ الگ روانہ ہو جائیں، میرے اصرار پر فرمایا "میاں، سب کے ساتھ آئے ہیں ساتھ جائیں گے، ساتھ کیوں چھوڑیں ؟ آخر انہوں نے اپنا کہا کیا اور عیش باغ سے پھر پاپیادہ واپس آئے، واپسی پر ہم لوگ تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن وہ ویسے ہی ہشاش بشاش تھے، گویا ماندگی تھی ہی نہیں۔

تعطیل کے ختم ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ بخاری کی تکمیل ہو گئی مولوی صاحب بہت خوش ہوئے، طالب علمی کے زمانہ میں ہم میں سے کسی نے بھی اس توجہ اور انہماک شغف اور شوق کا اظہار نہیں کیا تھا، ان کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی، بخاری ختم ہم نے کی تھی، لیکن باچھیں ان کی کھلی جا رہی تھیں، بند قبا ان کے ٹوٹے جا رہے تھے، اس خوشنودی کی سند میں مولوی صاحب نے ہمیں وہ انعام دیا جو زیادہ سے زیادہ تھا، توقع اور امید، اہلیت اور استحقاق سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ تھا!

مولوی صاحب نے ہمیں دو سندیں مرحمت فرمائیں ایک سند تو بلفظہ وہ تھی جو ان کے استاد جلیل حضرت شیخ محمد صاحب یمنی نے انہیں مرحمت فرمائی تھی، بس فرق یہ تھا، کہ اپنے

نام نامی کے بجائے میری سند میں میرا اور عبدالسلام صاحب کی سند میں ان کا نام ڈال دیا تھا دوسری سند ندوہ کے فارم پر مہتمم دارالعلوم کی حیثیت سے ہمیں مرحمت فرمائی، اب شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کی غیبت کے باعث مولوی صاحب کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ یعنی اب وہ شیخ الحدیث بھی تھے اور دارالعلوم کے مہتمم بھی، ان دونوں ذمہ داریوں کو اپنے معیار کے مطابق انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔

جس سال میں دہلی (جامعہ) گیا ہوں، اسی سال میں شدید ملیریا میں مبتلا ہوا، علاج کی طرف توجہ نہ کی، مرض بڑھتا گیا اور بگڑتا گیا، کئی مہینے کے بعد زندگی سے مایوس ہوکر میں وطن کے قصد سے روانہ ہوا، ندوہ پہنچا اور محب اللہ صاحب (ندوی، ایم اے، علیگ) کے ہاں مقیم ہوا، ان کا اصرار تھا کہ لکھنؤ میں علاج کراؤں، مولوی صاحب کو اطلاع ہوئی وہ بھی اپنے مریض کو دیکھنے تشریف لائے، بڑی دیر تک تشریف فرما رہے، اور اصرار فرماتے رہے، کہ میں لکھنؤ میں علاج کراؤں، مجھے یقین تھا، میں بچوں گا نہیں، اسی لئے میں وطن جانا چاہتا تھا کہ وہیں آسودۂ خاک ہوں، میں نے کسی کی نہ سنی اور وطن چلا گیا۔

میں ہی نہیں میرے دوست خود مولوی صاحب میری زندگی سے مایوس تھے، عبدالسلام میرے بعد لکھنؤ آئے انہوں نے محب اللہ صاحب کو ورغلایا وہ بیچارے ڈاکٹر عبدالعلی کے پاس گئے انہیں خیرآباد جانے کی زحمت اٹھانے پر آمادہ کیا۔ پھر ٹیکسی کا انتظام کیا اور ڈاکٹر صاحب کو لے کر خیرآباد پہنچ گئے۔

مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوا، وہ بھی خیرآباد تشریف لائے، شام کی گاڑی سے محب وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی معجز نما دوا نے حیرت انگیز فائدہ کیا، ایک ہفتہ میں بالکل تندرست ہوگیا، لکھنؤ آیا، عمران خاں نے دو قسم کا گوشت اور کئی قسم کی مٹھائیاں دسترخوان پر جمع کی تھیں، میں نے اس طرح کھایا جیسے بیمار ہی نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کی حذاقت کا میں ہمیشہ سے قائل تھا، اب ان کی مسیحا نفسی کا بھی قائل ہوگیا۔

ندوہ کی انجمن طلبائے قدیم عرصہ ہوا مرحوم و مغفور ہوچکی تھی، ہم اب ندوہ کے طالبعلم نہیں تھے لیکن "قدیم طالبعلم" تو تھے۔ ہمارے اس حق سے کون انکار کرسکتا تھا، جامعہ میں رہ کر ہم نے انجمن طلبائے قدیم کو زندہ کیا، صرف زندہ ہی نہیں کیا اس میں حرکت اور عمل کی لہر پیدا کر دی، دو تین بڑے شاندار سالانہ جلسے ہوئے، ایسے شاندار جو ندوہ کی تاریخ میں یادگار رہیں

گئے، پہلا جلسہ شاید ۱۹۴۲ء میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا تھا دور دور سے لوگ شرکت کیلئے آتے تھے، مجلس استقبالیہ کی طرف سے مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام تھا میں بھی مہمانوں کے کیمپ میں مقیم ہوا اور بھی کئی دوست ساتھ تھے، مولوی صاحب تشریف لائے۔ ادہر ادھر کی باتوں کے بعد شکایت کی کہ تم یہاں کیوں ٹھہرے؟ تمہیں تو میرے ساتھ ٹھہرنا چاہیئے تھا، اچھا اب چلو اور وہیں رہو۔ مولوی صاحب اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جو اپنا ہو وہ کہیں اور ٹھہرے کہیں اور کھائے، کسی اور کا مہمان ہو، صرف عمران خاں کے بارے میں مولوی صاحب نے مجھے مستثنیٰ کر رکھا تھا میرے ان کے تعلقات سے وہ واقف تھے، اس لیے اس معاملہ میں دخل نہیں دیتے تھے، البتہ کہیں اور ٹھہر جاؤں تو مولوی صاحب اسے برداشت نہیں کرتے تھے جب مولوی صاحب دعوت کرتے، گوشت منگواتے، اپنی خاص نگرانی میں اور کبھی کبھی اپنے دست مبارک سے پکاتے تھے، جانتے تھے مجھے گوشت کا بہت شوق ہے۔ زیادہ سے زیادہ بوٹیاں مجھے مرحمت فرماتے آخر وقت تک ان کا اصرار جاری رہتا تھا، میاں کھاؤ، ابھی کھایا ہی کیا ہے اور کھاؤ۔ لو یہ بوٹی۔

میرے اور عبدالسلام صاحب کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ عجیب و غریب قسم کے رہے ہیں مولوی صاحب ہم دونوں سے اتنے ہل مل گئے تھے، کہ کوئی تکلف نہیں رہ گیا تھا، اگرچہ حفظ مراتب میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو "عبدالسلام" نہیں "عبد" میں "کہتے تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ حضرت اپنی زبان کبھی بند نہیں کرتے تھے موقع بے موقع بحث پر ہمیشہ تیار رہتے تھے، اور کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ جاتے تھے، جو بعض اوقات طوفان خیز بن جاتی تھی، اس سلسلے میں مجھ سے اکثر نا روا حرکتیں ان کی "اصلاح و تربیت" کے لیے سرزد ہوتی رہتی تھیں جو "ضرب خفیف" سے شروع ہو کر یہ معلوم کہاں کہاں تک پہنچتی تھیں، مولوی صاحب کو میرے ان کے یہ تعلقات اتنے بھا گئے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "میاں اپنے عبد کو ڈانٹو" میں ڈانٹتا تو مولوی صاحب بڑی دیر تک لطف لیتے رہتے، کبھی فرماتے "میاں" تمہارے عبد نے یہ کیا! گویا مولوی صاحب نے ان کی شکایت کی اور اب چاہتے تھے کہ ان کے سامنے میں اپنے "عبد" کی اصلاح و تربیت کروں، جب میں ارشاد کی تعمیل کرتا کن الفاظ میں کہوں مولوی صاحب پر اہتزاز اور انبساط کی کیسی کیفیت طاری ہوتی تھی، وہ قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے

تھے لیکن اس موقع پر ان کے دہن مبارک سے قہقہہ کی ہلکی سی آواز نکلنے لگتی تھی، کبھی میں نہ ہوتا اور مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو چھیڑنا چاہتے تو فرماتے اچھا رئیس کو آنے دو، اس سے کہوں گا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ اگرچہ سو روپے سے نہیں بڑھی، لیکن وہ اتنے فراخدل تھے کہ یہ ساری آمدنی ان کی مہمانداریوں، دوست نوازیوں، غریب طلبہ کی اعانت اور مفت خوروں کی دلجوئیوں پر صرف ہو جاتی تھی، پنجاب یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور بعض دوسری جگہوں کے ممتحن بھی تھے، اس طرح سال بھر میں انہیں چار پانچ سو روپے مل جاتے تھے، لیکن یہ رقم بھی کم ایسا ہوتا تھا کہ ان کی ذات پر خرچ ہوتی ہو، وہ کسی درجہ میں بھی روپیہ کو عزیز نہیں رکھتے تھے، روپیہ ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا، وہ حقیقتاً اسے ہاتھ کا میل سمجھتے تھے، آیا اور گیا۔

جو لوگ ان کی اس افتاد طبیعت سے واقف تھے وہ ان کی اس عادت سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے، "قرض" لے لیا، اب نہ مقروض صاحب دیتے ہیں نہ مولوی صاحب مانگتے ہیں بات آئی گئی ہو گئی، میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے قرض لے لے کر مولوی صاحب کو سخت دشواریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا، ان کی زبان مبارک شکوہ سے آلودہ نہ ہوئی، انہوں نے تقاضا بھی نہیں کیا، نادہند مقروض کی صورت دیکھ کر وہ خود شرما جاتے تھے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

طبیعت بالکل بچوں کی سی پائی تھی، وہی سادگی، وہی بھولاپن، وہی معصومیت و ہی بے فکری جو بچوں کی خصوصیت ہوتی ہے مولوی صاحب کی بھی تھی، کھانا جیسا مل گیا کھا لیا، کپڑا جیسا میسر آیا پہن لیا، چارپائی ہوئی تو اس پر آرام فرمایا، فرش ہوا تو اس پر استراحت فرما گئے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کسی کام سے ڈاکٹر صاحب کے پاس امین آباد تشریف لے جا رہے تھے میں اور عبدالسلام صاحب ساتھ تھے شاید دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا ہم دونوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے پھر بھی سردی سے ٹھٹھرے جا رہے تھے مولوی صاحب اس شان سے بالاخانہ سے برآمد ہوئے کہ پاؤں میں نرمی کا سرخ جوتا (کاش وہ مل جائے اور اس کی خاک آنکھوں کی زینت بن سکے) جسم مبارک پر وہی گاڑھے کے کپڑے، سر پر پگڑی،

کاندھے پر سرخ رومال، روئی کا ایک شلوکہ بھی پہنے ہوئے تھے، لیکن اس ٹھاٹھ کے ساتھ
کہ اس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے، میں نے کہا مولوی صاحب بٹن لگا لیجیے، فرمایا
میاں بٹن لگاتے ہوئے میں گھبراتا ہوں، میں نے عرض کیا "سردی بہت ہے"، ارشاد ہوا
میاں سردی نوجوانوں کو بہت لگتی ہے، اصل میں وہ اپنی آن کے خلاف سمجھتے تھے کہ
شلوکے کے بٹن لگائیں، جب انہوں نے جوانی میں یہ نہیں کیا تو اب بڑھاپے میں کیوں
کریں؟ آگے بڑھے موتی محل کے پل پر پہنچے، اب تو مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں کھڑا ہوا مولوی
صاحب بھی کھڑے ہو گئے، میں نے بے کچھ کہے سنے شلوکے کے سب بٹن لگا دیئے وہ
مسکراتے رہے اور میری اس گستاخی پر ذرا بھی برہم نہ ہوئے۔

مولوی صاحب جس طرح اپنے ظاہری فضل و کمال سے بے پروا اور بے خبر تھے اسی
طرح اپنے باطنی عروج وارتقاء کا احساس بھی نہیں فرماتے تھے، وہ جس طرح متبحر عالم تھے، اسی
طرح ایک برگزیدہ صوفی بھی تھے، لیکن جس طرح ان کے علم وفضل پر خاکساری کا پردہ پڑا
ہوا تھا، اسی طرح ان کا روحانی عروج وارتقاء بھی پردۂ خفا میں مستور رہتا تھا۔

ہمہ وقت مولوی صاحب باوضو رہتے تھے، جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو، جاڑے
میں ان بے چاروں کو گرم پانی کہاں سے ملتا، لیکن وہ ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باوجود ٹھنڈے
پانی سے وضو کرتے، بے وضو رہنا کسی حالت میں بھی انہیں گوارا نہ تھا۔

ان کے زہد و عبادت کے معمولات بھی ایسے تھے کہ چشم ظاہر پرکھ نہیں سکتی تھی کہ وہ
عابد اور زاہد ہیں، تہجد کی نماز بالالتزام پڑھتے، پھر فجر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، نماز
فجر غلس میں پڑھتے، پھر چہرہ انور پر رومال ڈال کر اپنے معمولات ادا کرتے، یہاں تک کہ
اشراق کا وقت آجاتا، پھر اس سے فارغ ہوتے۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب حضرت شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے
بیعت تھے، صرف بیعت نہیں مجاز بھی، وہ خود اسے اس طرح چھپاتے تھے جیسے کوئی
بڑا راز ہے اور اس راز کا افشا کوئی بڑی معصیت!

حق بات کہنے میں، علم کا وقار قائم رکھنے میں وہ مرعوب ہونا، بڑی سے بڑی شخصیت
سے متاثر ہونا، دارالعلوم کے حکام والا مقام اور ارکان والا شان سے مداہنت کا برتاؤ
کرنا جانتے ہی نہ تھے، اگر کوئی علم کی توہین کرتا تھا، علماء کا وقار مجروح کرتا تھا، اپنی

جہالت کے زعم میں خود اپنے تیئں علامۂ دوراں سمجھنے لگتا تھا، اقتدار کی ترنگ میں اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوجاتا تھا، پھر مولوی صاحب قابو میں نہیں رہتے تھے، وہ سامنے بھی بہت کچھ کہتے سنتے تھے، اور جب پس پشت موقع آجاتا بحث چھڑ جاتی تھی، تو بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، ان کے طنزیات لطیف مستقل سامان وجد و کیف ہوتے تھے۔

"اپنے" طالب علموں کا وہ دوسروں سے بھی اتنا ہی احترام کراتے تھے جتنا خود ان کا کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی لکھنؤ تشریف لائے، اور حسب معمول منشی احتشام علی صاحب کے دولت کدہ واقع خیال گنج میں اقامت پذیر ہوئے۔

مولوی صاحب امراء اور رؤسا سے ملنے میں بہت ہچکچاتے تھے، وہ اسے علم وفن کے خلاف شان سمجھتے تھے، کہ علماء امراء کے دربار میں جائیں، ان کے دولت کدوں کا طواف کریں، ان کی ڈیوڑھیوں پر بار بار پہنچیں، لیکن شیروانی صاحب اس اصول سے مستثنیٰ تھے مولوی صاحب اس کے قائل تھے کہ وہ "عالم" ہیں، وہ بھی مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے، مولوی صاحب کے جی میں آیا کہ منشی صاحب کے یہاں جاکر ان سے ملیں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے "صلاح" پوچھی، ہم نے تائید کی تیار ہو گئے، اپنے ساتھ مجھے اور عبدالسلام کو بھی لیتے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا، کوٹھی کے صحن میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں دھوپ میں منشی صاحب اور شیروانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، دوسری کرسیوں پر کچھ اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے، صرف ایک کرسی خالی تھی، شیروانی صاحب بڑے تپاک سے ملے، اٹھ کر مصافحہ کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا "تشریف رکھیئے" مگر مولوی صاحب کہاں بیٹھنے والے تھے؟ "میاں جب تک ہمارے ساتھی (ہم دونوں) نہ بیٹھیں، ہم کیسے بیٹھ جائیں؟ خود بھی کھڑے رہے اور اپنے ساتھ حاضرین کو بھی کھڑا رکھا، جب تک اور کرسیاں نہ آگئیں، اور ہم لوگ نہ بیٹھ گئے وہ کسی طرح نہ بیٹھے، ان کی یہی شان تھی، وہ اپنے شاگردوں کو حقیر اور کم مایہ نہیں سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو ٹونک کا ویرانہ پسند تھا، اپنے اس وطن کو وہ ہندوستان کے تمام مقامات سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے، وہاں کی ندی کا پانی ان کے نزدیک اتنا ہاضم تھا کہ جب اس کے فضائل بیان کرتے تو سفوف جالینوس اور نمک سلیمانی بھی اس کے

سامنے ہیچ معلوم ہوتے۔

ٹونک کے درو دیوار سے بھی انہیں محبت تھی، وہاں کے عہد گزشتہ کی کہانیاں بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے، وہاں کی عدالت میں داڑھی منڈوں کی گواہی قاضی نہیں قبول کرتا، اس پر مولوی صاحب کو بڑا فخر تھا وہ اپنے وطن کی اس "اسلامیت" پر نازاں تھے ہم لوگ گوش ہوش سے ان کی یہ پیاری پیاری باتیں سنا کرتے۔ اسی دوران میں وہ دعوت بھی دیتے کہ میاں ایک دفعہ ٹونک ضرور آؤ۔ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ تمنا پوری نہ ہوئی، البتہ جامعہ کے زمانہ طالب علمی میں اتفاقاً یہ آرزو بر آئی۔

میں جامعہ میں جب داخل ہوا تو پاس ہی طبیہ کالج میں میرے ابتدائی دور کے ایک ندوہ کے ساتھی نصیر الدین صاحب (مولانا معین الدین صاحب اجمیری سابق صدر جمعیۃ العلماء ہند اور غازی محی الدین صاحب اجمیری سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی کے بھتیجے اور شفا الملک حکیم نظام الدین صاحب کے فرزند سعادت مند) بھی پڑھتے تھے ہم دونوں کے ندوہ میں بہت گہرے مراسم تھے اب کئی برسوں کے بعد دہلی میں ملاقات ہوگئی تو عہد ماضی اور زیادہ جوش اور سرگرمی سے تازہ ہو گیا، ان کا فاضل وقت میرے پاس "محمد علی ہوسٹل" میں صرف ہوتا تھا، میرے فرصت کے اوقات ان کے بورڈنگ ہاؤس میں گزرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ اجمیر گیا، اور وہاں جا کر میں نے ٹونک چلنے کا تقاضہ کیا۔ چنانچہ دوسرے روز ہم لوگ ٹونک روانہ ہو گئے، شام کو پہنچے، نصیر صاحب اپنے تعلقات کے سبب حکیم برکات احمد صاحب مرحوم کے ہاں ٹھہرے، اور مجھے بھی زبردستی (ان کی اس طرح کی زبردستیوں کا میں ہمیشہ تختہ مشق بنتا رہا ہوں) وہیں ٹھہرایا۔

ٹونک پہنچ کر نصیر صاحب نے کہا "صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے عید اگر اجمیر میں نہ ہوئی تو والد صاحب بہت خفا ہوں گے، اور اب اتنا ہی وقت ہے کہ آج کی رات رہو اور صبح ہوتے ہی چل دو" یہ الفاظ کچھ ایسے خوف و دہشت کے لہجہ میں انہوں نے کہا کہ میں بھی راضی ہو گیا۔ حالانکہ تکلیف بہت ہوئی، سوچا یہ تھا کہ ٹونک میں دو تین دن رہیں گے، لیکن ایک دن بھی رہنے کا موقعہ نہ ملا۔ افطار کے بعد ہم دونوں مولوی صاحب کے علم کدہ پر پہنچے، گھر کے پاس ہی مسجد تھی، مولوی صاحب کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمود حسن خاں صاحب (صاحب معجم المصنفین) وہاں معتکف تھے مولوی صاحب بھی انہی کے پاس تشریف رکھتے تھے

اچانک ملاقات ہوئی، بہت خوش ہوتے کچھ کچھ گئے، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں دوسری جگہ ٹھہرا ہوں تو بہت برہم ہوئے۔ بار بار شکوہ فرماتے تھے "میاں آئے بھی تو بس اتنی دیر کے لیے!" میں نے کھانا نہیں کھایا، مولوی صاحب کا بس چلتا تو سارے گھر کو بھوکا رکھتے اور جو کچھ تھا: ماشاء اللہ بہت کچھ تھا) سب مجھے نوش جاں کرا دیتے۔

انہیں بڑی تمنا تھی کہ مجھے ٹونک کی سیر کراتے۔ وہاں کا قلعہ وہاں کی جامع مسجد وہاں ان کا بنایا ہوا مدرسہ فرقانیہ یہ سب مجھے دکھاتے۔ لیکن اب رات ہو چکی تھی اور صبح یہ مسافرت ختم ہونے والی تھی۔ اب کیا ہو؟ مولوی صاحب سب سے زیادہ اسی بات پر ملول تھے۔

لیکن مولوی صاحب آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے اسی وقت انہوں نے لالٹین سنبھالی اور تیار ہو گئے "چلو میاں" ان کی اس جواں ہمتی پر میں عش عش کر گیا! ابھی افطار و طعام سے فارغ ہوتے ہی ذرا دیر بھی آرام کا موقعہ نہیں ملا، اور اب کئی میل پیدل چلنے پر تیار ہیں، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں، ہم دونوں چلے، پہلے تو مولوی صاحب نے وہاں کا بازار دکھایا پھر دور سے وہاں کا قلعہ دکھایا جو اندھیرے اور کہر کے سبب مجھے نظر نہ آیا، لیکن اس خیال سے کہ مولوی صاحب مزید تکلیف نہ کریں، میں نے اس کی خوش منظری کی پورے شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ تعریف کر دی، مولوی صاحب آگے چلے اب جامع مسجد پہنچے اس کا ایک ایک در دکھا رہے ہیں، اس کی مضبوطی، پختگی اور خوبصورتی اور خوشنمائی کے گن گا رہے ہیں۔ لالٹین اٹھا اٹھا کر اس کے ہر مینارہ کی مینا کاری اور صنعت پر خاص توجہ دلا رہے ہیں، یہاں سے نکلے تو اب انہوں نے اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ فرقانیہ دکھایا، جس میں قرآن شریف قرأت، اور ابتدائی عربی کی تعلیم ہوتی تھی، یہ مدرسہ مولوی صاحب نے قائم کیا تھا، اس پر بڑی محنت کی تھی، اس کی ترقی پر ان کی توجہ ہمیشہ مرکوز رہتی تھی، خدا کے فضل سے اس وقت تک کامیابی سے چل رہا ہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہم اس راؤنڈ سے فارغ ہو سکے، میں نے چاہا کہ مولوی صاحب اپنے مکان تشریف لے جائیں، لیکن میں مہمان تو انہیں کا تھا، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ "مہمان" کو تنہا چھوڑ دیں؟ وہ میری قیام گاہ تک تشریف لائے، بڑی دیر تک جلوہ فرما رہے، زیادہ تر علمی اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر رات گئے تشریف لے گئے۔

صبح اٹھتے ہی ہم لوگ ۸ بجے اپنے روانہ ہو گئے، وہاں کچھ دیر قیام کر کے اجمیر چلے گئے۔

عید کا چاند ریل میں دیکھا اور عین نماز کے وقت اجمیر پہنچے۔

مولوی صاحب عام علماء کرام کے برعکس عربی بے تکلفی سے بولتے تھے لکھتے بھی روانی سے تھے، فارسی پر بھی اچھا خاصا عبور تھا، لیکن اردو کا شاید بالکل مطالعہ نہیں کیا تھا، پچھلے زمانہ کے لوگ اردو کو کم مایہ اور حقیر زبان سمجھتے تھے اس لیے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے تھے، مولوی صاحب بھی پرانے زمانے کے آدمی تھے، اور اردو زبان کی افادیت اور اہمیت کے قطعاً معترف نہیں تھے، پھر بھی کوئی اچھی کتاب مل جاتی تھی، تو اسے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کی تعریف میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے لیے سب سے زیادہ دقت آزما کام اردو میں کچھ لکھنا ہوتا تھا، اب وہ اتالیق تھے، ہر روز لکھنے سے انہیں کام رہنے لگا، ہر درخواست انہی کے توسط سے جاتی اور اس پر انہیں رائے لکھنی پڑتی، اردو رسم الخط میں مولوی صاحب یائے معروف و مجہول کا فرق نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے "بخار" کی وجہ سے ایک روز کی درخواست دی، وہ طالب علم کا دل بھی رکھنا چاہتے تھے اور جھوٹ بولنا بھی انہیں منظور نہ تھا اس لیے کہ درخواست دہندہ کو بخار نہیں تھا، مولوی صاحب نے اس درخواست پر تحریر فرمایا، "یہ کہتے ہیں کہ انہیں بخار ہے۔ لہٰذا ایک روز کی رخصت دی جائے،، اس پر مجھے بہت ہنسی آئی بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ ان کا رسم الخط یہی ہے۔

قرآن شریف مولوی صاحب خاص لحن سے پڑھتے تھے، اتنا مؤثر دلنشیں اور موہ لینے والا لحن جس کی تعریف نہیں ہو سکتی، عربی میں وہ خطبہ دیتے تھے۔ وہ بھی انہی طرز کا ہوتا تھا، انہوں نے جب سے جمعہ کی نماز پڑھانا شروع کی، بیرونی نمازیوں (لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ) کی تعداد میں غیر معمولی اور نمایاں اضافہ ہو گیا تھا،

ان کی دھج ایسی ہوتی تھی کہ دیکھنے والے پر رعب بھی پڑتا اور اثر بھی، ان کی سادگی پر ہزاروں بناوٹیں قربان، پاؤں میں نری کا سرخ جوتا، دبلا بدن میانہ قد، بڑی بڑی مخمور آنکھیں، ریش مبارک سفید، سر پہ ایک پگڑی اونچا پائجامہ، نیچا کرتہ، چلتے اس طرح سے تھے جیسے ڈھلوان جگہ سے کوئی اتر رہا ہو، رفتار خاصی تیز۔

آواز گرجدار نہیں تھی لیکن پُروقار تھی، انداز میں خاکساری نمایاں جس سے ملتے جھک کر ملتے، ترفع نمود اور نمائش کے جذبہ سے کوسوں دور، وہ دل کھول کر ملتے تھے، چاہتے

تھے دوسرے بھی ایسے ہی ملیں، کاٹ پیچ کے آدمیوں سے دور رہتے تھے، بعض دفعہ ایسے لوگوں کے منہ پر ان کی کمزوری ظاہر کر دیتے تھے۔

ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ان کی طبیعت ایک سادہ ورق تھی ان کا مزاج ان کے عادات واطوار، ان کے شمائل وخصائل سب میں اسلامیت للہیت اور شائستگی کا جلوہ نمودار رہتا تھا۔

وہ خفا ہوتے تھے تو اپنی خفگی کو چھپاتے نہیں تھے، جتنے خفا ہوتے تھے اس سے زیادہ کا اظہار کرتے تھے پھر جب خوش ہوتے تھے تو اس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، ہمارے دو ساتھیوں سے وہ اسٹرائک کے زمانے میں بہت خفا تھے، اس خفگی کا علی الاعلان اظہار بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ یہی ذکر چھڑا انکی خفگی کا آفتاب نصف النہار پر تھا معلوم ہوتا تھا اس کی تمازت اور حدت سے معتوبین جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے میں نے خوشامد کی نہیں مانے۔ التجا کی شرف قبول سے محروم رہی، سفارش کی رد کر دی گئی پھر ان کا سراپا نور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور ان دونوں کو معاف کر دینے کی استدعا کی مولوی صاحب ذرا ٹھنڈے ہوئے، میری خوشامد کا سلسلہ جاری رہا، تھوڑی دیر کے بعد ان کا آئینہ کی طرح صاف شفاف دل گرد وغبار سے پاک ہو گیا، سب کچھ بھول گئے، سب کچھ معاف کر دیا۔ یا تو وفور غضب سے چہرہ تمتمایا ہوا تھا یا جوش مرحمت میں پھول کی طرح کھل گیا۔

ان دونوں معتوبین میں سے ایک صاحب بعد میں ندوہ کے دفتر میں ملازم ہو گئے، مولوی صاحب ان سے اب اس طرح پیش آئے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ان کی خفگی افسانہ پارینہ بن چکی تھی، انہوں نے اپنی سعادت مندی، خدمت گزاری اور طاعت کیشی سے مولوی صاحب کا دل موہ لیا۔ پھر تو وہ ان سے اتنے خوش ہوئے کہ قریب قریب انہیں اپنا معتمد علیہ بنا لیا۔

وہ داڑھی پر، نماز کی پابندی پر، وضع اسلامی پر زور دیتے تھے، لیکن ان کی خوشی اور خفگی کا معیار جداگانہ تھا، اس کا ان چیزوں سے تعلق نہیں تھا۔ وہ صورت نہیں دل دیکھتے تھے ان کی نگاہیں دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں، دل کے معائنہ کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے اس میں تبدیلی کم ہوتی تھی، ان کے کئی ایسے شاگرد تھے جن کی داڑھی یک مشت دو انگشت کے حدود سے تجاوز کر چکی تھی اسلامی وضع بھی رکھتے تھے، نماز کے بھی پابند تھے، ان کی

خدمت گزاری میں بھی سرگرم رہتے تھے، ان کی ہر بات کی تائید بھی کرتے تھے وہ اگر دن کو رات فرمادیں تو وہ لوگ

"اینک ماہ پروین"

کا نعرہ لگانے لگیں، لیکن ان سے مولوی صاحب ذرا بھی خوش نہیں تھے بعض اوقات تو بُری طرح جھڑک دیتے تھے، کبھی ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے، کبھی ان کی باتوں سے اثر نہیں لیتے تھے، کبھی اپنا شریک حلقہ نہیں بناتے تھے برعکس ازیں بعض ایسے طلباء تھے جو اس سختی سے شرائط بالا پورے نہیں کرتے تھے، انہیں مولوی صاحب تنبیہ کرتے رہتے تھے، سمجھاتے رہتے تھے ان کی اصلاح میں برابر سرگرم رہا کرتے تھے لیکن دل کے معائنہ کے بعد انہیں "اپنا لیتے" تھے، انہیں زیادہ سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی ہر بات مانتے تھے، ان کا خیال رکھتے تھے، اثر قبول کرتے تھے۔

دل کے پہچاننے کا کمال مولوی صاحب میں ایسا تھا کہ طبقۂ علماء میں بالخصوص یہ چیز بہت کم ملے گی، یہ حضرات زیادہ تر ظاہر کو دیکھتے ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر غلط رائے قائم کرتے ہیں، مولوی صاحب کی نظر بطون پر رہتی تھی، اس لیے ان کی رائے بہت کم غلط ہوتی تھی، اور انہیں اپنے فیصلہ میں شاذونادر تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں ندوہ کی مسجد کا افتتاح تھا، اس میں شرکت کے لیے میں دہلی سے آیا تھا، اسی زمانہ میں سید مرتضیٰ بہادر کی زیر صدارت لکھنؤ میں خلافت کانفرنس ہو رہی تھی، وہیں خلافت کی ادارت کے معاملے طے ہوئے اور جنوری ۱۹۲۴ء کے آغاز ہی میں بمبئی روانہ ہو گیا،

میں بمبئی روانہ ہوا چلتے وقت مولوی صاحب نے نصیحت فرمائی میاں علم کی مزاولت جاری رکھنا۔ اس جملہ کو بار بار فرمایا، کچھ سوچتے اور یہی فرماتے۔

بعض اہم مسائل پر مولوی صاحب نے عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے املا کرائے تھے، ان کی تمنا تھی یہ عام ہوں پھیلیں اور اشاعت پائیں تاکہ لوگ مستفید ہوں، ان میں ایک رسالہ ایسا تھا جو ان کی تحقیق و تدقیق محنت و مطالعہ وقت خیال، اور وسعت نظر، کاوش و جستجو کا شاہکار کہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے مندرجات کم علم اور کم سواد لوگوں کے لیے گمراہی کے موجب بھی ہو سکتے تھے مولوی صاحب اس کی اشاعت کے خاص طور پر شائق

تھے، میں نے کہا مولوی صاحب اس رسالہ کی عام اشاعت اُردو تو اُردو، عربی زبان میں بھی مناسب نہیں ہے، فرمایا "کیوں میاں" میں نے عرض کیا "آپ کا یہ رسالہ مضنون بہ بغیر اہلہ" ہے، بہت ہنسے، بڑی دیر تک لطف لیتے رہے بار بار اس لفظ کو فرماتے دہراتے اور تبسم فرماتے،

مسئلہ حجاب اور طلاق پر بھی انہوں نے بڑی دماغ کاوی اور دیدہ ریزی سے الگ الگ رسالے لکھے تھے ان میں سے پہلا رسالہ میں ۱۹۲۷ء میں اپنے ساتھ بمبئی لے آیا، بمبئی میں بہتر سے بہتر عربی ٹائپ موجود تھا اور لکھنؤ میں بدتر سے بدتر ٹائپ ملنے میں بھی دشواریاں تھیں، میں اگر لیتھو میں چھاپنا چاہتا تو بڑی آسانی سے خلافت پریس میں چھاپ سکتا تھا، لیکن میں چاہتا تھا اس رسالہ کی اشاعت بلاد اسلامیہ میں بھی ہو، اور وہاں کے لوگ ٹائپ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ لیتھو کے عربی مطبوعات میں خواہ وہ کتنے ہی پُر مغز اور اہم ہوں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔

بد قسمتی سے بعض ایسے موانع پیش آئے کہ وہ دو برس تک نہ شائع ہو سکا آخر ۱۹۲۵ء میں میری کوشش اور ان کے ایک عزیز شاگرد مولوی خلیل شرف الدین صاحب الکتبی کی مہربانی سے وہ شائع ہوا، مولوی صاحب اسے مطبوعہ صورت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، وہ چاہتے تھے، ان کی علمی تحقیق عام ہو جائے، لوگ جمود، قدامت اور "وجدنا علیہ آباءنا" کی گمراہی سے نکلیں، اپنے دماغ سے سوچیں اپنی آنکھ سے دیکھیں، اپنے دل سے پرکھیں، جو پہلو مضبوط پائیں اسے اختیار کر لیں اور اسی پر عمل پیرا ہوں، وہ اپنے نور بصیرت کے متعلق خدائے اقبال کے الفاظ کہا کرتے تھے ؂

مرے قافلہ میں لُٹا دے اسے
لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

مولوی صاحب کا استخارہ بڑے غضب کا ہوتا تھا، کبھی غلط پڑا ہی نہیں جب کوئی مصیبت ہو پریشانی ہو تکلیف ہو اپنے لیے یا اپنے مخصوص عزیزوں اور شاگردوں کے لیے وہ استخارہ کرتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ نماز عشا کے بعد ایک مخصوص دعا پڑھتے تھے، اس میں اس بات کا ذکر بھی کرتے تھے جس کے لیے استخارہ کر رہے ہوتے تھے، پھر سو جاتے تھے، رات کو خواب میں اس امر کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ معلوم ہو جاتا تھا، جو

کچھ معلوم ہوتا تھا میرے علم میں وہ ہمیشہ صحیح ہوتا تھا، دو ایک واقعات میرے سامنے گزرے اور وہ بالکل مولوی صاحب کے استخارہ کے مطابق صحیح اور درست ثابت ہوئے۔

مولوی صاحب کشف وکرامت کے جذب وسلوک کے مدعی نہ تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان کی طریقت شریعت سے جدا نہ تھی۔

ہندوستان کے نامور بزرگ شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مسترشد تھے اور مجاز بھی تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان سب خصوصیتوں کو وہ چشم مردم سے پنہاں رکھتے تھے ان کا اظہار واعلان بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

ہم دونوں پر (مجھ پر اور عبدالسلام صاحب پر) ان کی خاص نوازش تھی، علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی بھی ہمیں گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، ہماری روحانی اصلاح وتربیت ان کی بہترین آرزو تھی، ان کی مرضی تھی کہ ہم ان سے بیعت ہوجائیں، ایک روز ندوہ کی مسجد میں ہم دونوں نماز فجر کے بعد ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوگئے۔

خوشا روزے وخرم روزگارے

یہ کتنی بڑی سعادت تھی لیکن کتنے بڑے بدبختوں کے حصے میں آئی جو ہرگز اس کے اہل نہ تھے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی میں راقم الحروف کا نکاح ہوا، میری تمنا تھی مولوی صاحب بھی اس میں شریک ہوں صرف شریک ہی نہ ہوں، وہی نکاح بھی پڑھائیں، وہ چپ چپاتے دہلی روانہ ہوگئے۔ اتفاق اسی گاڑی سے میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری بھی شرکت کے لیے تشریف لارہے تھے: انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ مولوی صاحب دہلی اسی مقصد کے لیے تشریف لے جارہے ہیں، انہوں نے پوچھا آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ فرمایا جہاں تم جارہے ہو میاں بھائی صاحب نے لاکھ لاکھ مختلف ترکیبوں سے پوچھا لیکن انہوں نے نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ دہلی کے اسٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا، اب بھائی سمجھے کہ مولوی صاحب کیوں تشریف لائے ہیں۔

دہلی سے روانہ ہونے لگے تو خیر وبرکت کی بہت سی دعائیں دیں، اس خلوص وا پنائیت سے جس کی مولوی صاحب کے پاس کمی نہ تھی، لیکن اب ان کے بعد یہ جنس نایاب ہے، ناپید ہے، عنقا ہے۔

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں ؟

میں اسٹیشن تک پہنچانے گیا، ان کا بستر کیا اصرار کیا کہ وہ استراحت فرمائیں، ان کا مزاج بھی کچھ ناساز تھا فوراً لیٹ گئے، گاڑی روانہ ہوئی، اور میں نہ معلوم کیا سوچتا ہوا واپس آگیا۔

آخری ملاقات ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی، اس کے کچھ دنوں بعد مولوی صاحب بعض حالات سے دل برداشتہ ہوکر کچھ وطن کی کشش سے مجبور ہوکر ٹونک چلے گئے۔

وہ اپنی خودداری پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دیتے تھے، ٹونک جا کے مالی اعتبار سے وہ بہت تکلیف میں رہے لیکن انہیں یہ اطمینان تھا کہ اب "نوکر" نہیں ہیں، اب ضعیفی بھی غالب آچکی تھی، عمر تقریباً ۸۵ سال کی ہوگی، تقریباً دو سال تک اپنے وطن میں علم وفن کے فیض سے لوگوں کو مستفید کرتے رہے پھر وقت آگیا۔ وہ وقت جو آکر کبھی نہیں ٹلتا، جو نہ جوان کے ساتھ رعایت کرتا ہے، نہ بڑھے کے ساتھ، وہ موت سے خائف نہیں تھے ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسم برلب اوست

ان کا وقت جب آیا تو وہ پوری تیاری کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے اور رفیق اعلےٰ سے جا ملے۔

مبارک ہے وہ سرزمین جس کے سینہ پر حیدر حسن خاں کا جسم نورانی ہمیشگی کی نیند کے لیے رکھا گیا۔

وہ حیدر حسن جو علم کی زینت تھا، جسکے دم سے قال الرسول کی محفلیں آباد تھیں جس کا وجود قال اللہ کہنے والوں کے لیے شمع ہدایت تھا جو "قال اقول" اور قیل وقال کرنے والوں سے روگرداں رہتا تھا، جس کا جسم پھول کے مانند سبک جس کی روح نور سے زیادہ لطیف۔

آہ اب ایسے لوگ کہاں ہیں جن پر انسانیت فخر کرے اخلاق کو جن پہ ناز ہو؟ کردار جن کے وجود سے روشن اور تاباں ہوں؟ ہونگے کچھ لوگ ضرور ہوں گے، لیکن حیدر حسن کے سے نہ ہونگے، ہماری نظر میں تو وہی ایک پیر مرد دانا تھا، جس کے ساتھ یہ سب خصوصیتیں رخصت ہوگئیں۔ اس ایک ہستی کے اٹھ جانے سے علم وفضل، تحقیق وتدقیق، انسانیت اور للہیت شرافت اور کرامت وقار اور ایثار، زہد وانکسار کی دنیا سونی ہوگئی۔

دوست ہوں یا عزیز، اُستاد ہوں یا بزرگ، ساتھی ہوں یا رفیق ہم ہر ایک کے سامنے ایک جداگانہ رنگ میں نظر آتے ہیں، دوست کے سامنے بے تکلف ہو جاتے ہیں اپنی کہتے ہیں اس کی سنتے ہیں، عزیز پر کوئی مصیبت ہو ہمارا خون جوش میں آجاتا ہے اور ہم سراپا عمل ہو کر اس کی مدادا میں مصروف ہو جاتے ہیں، استاد کی خدمت کرنا، احترام کرنا، اطاعت سے پیش آنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، بزرگ کے سامنے ہم معنویت کی تصویر بن جاتے ہیں ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سنتے ہیں اس کی زندگی سے سبق، اس کے کارناموں سے ہمت۔ اس کی عظمت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، ساتھی ہمارے کام آتا ہے، وہ ہمیں سکھ پہنچاتا ہے ہم اس کے آرام کا خیال کرتے ہیں، وہ کچھ ہم سے چاہتا ہے ہم کچھ اس سے تقاضہ رکھتے ہیں، رفیق سے ہمارا ناطہ بس کام تک ہوتا ہے، کوئی ایک بات ہے جسمیں وہ ہمارا ہم اس کے رفیق پھر اس کی منزل اور ہمارا راستہ جدا، یہی وجہ ہے کہ ہم دوست کے سامنے جو کچھ ہوتے ہیں عزیز کے سامنے نہیں ہوتے، استاد کے سامنے ہمارا جو رنگ ہوتا ہے بزرگ کے سامنے نہیں ہوتا، ساتھی ہمارا جو روپ دیکھتا ہے، رفیق اس کا درشن نہیں کرپاتا، یہ ہماری انفرادی حیثیتیں ہیں جو اسی وقت اُجاگر ہوتی ہیں۔ جب ان کا محل ہو، موقع ہو۔

مولوی صاحب ہمارے دوست بھی تھے اور عزیز بھی، استاد بھی اور بزرگ بھی، ساتھی بھی اور رفیق بھی، ہر رنگ میں ہم نے انہیں دیکھا پرکھا جانچا اور کھرا پایا، وہ دوست کی حیثیت سے ہمارے رازدار عزیز کی حیثیت سے ہمارے جاں نثار استاد کی حیثیت سے رہبر، بزرگ کی حیثیت سے اخلاق و نصیحت کے پیام بر، ساتھی کی حیثیت سے دکھ اور درد کے ساتھی، رفیق کی حیثیت سے تن من دھن سے ہر کام میں شریک، ہمارے لیے تعین مشکل ہے کہ وہ ہمارے کیا تھے، ہم ان کے کیا تھے، ہم ان کی خاک پا بھی نہیں تھے لیکن وہ ہمارے سب کچھ تھے، بہت کچھ تھے اور ایسے کچھ تھے جس کا بیان لفظ و عبارت کی مدد سے ناممکن ہے۔

ہم نے انہیں دور سے بھی دیکھا اور نزدیک سے بھی غصہ میں بھی اور عالم مرحمت میں بھی تلخ اور کھری نکتہ چینی کرتے بھی اور تعریف و توصیف کے دریا بہاتے ہوئے بھی، دکھ میں بھی اور خوشحالی میں بھی، تنہائی میں بھی اور مجمع میں بھی، دوستوں میں اور حکام والا مقام کے دربار میں بھی ارکان لاشان کے قصور و محلات میں

کبھی ہمعصروں میں کبھی تنگ نظروں میں کبھی قدر شناسان علم کے سامنے کبھی نمائندگان جہل و جہل مرکب کے حضور میں بھی، ہر رنگ میں ہر مقام پر، ہر حیثیت سے وہ صرف حیدر حسن خاں تھے اور کچھ نہیں تھے!

ہمارا ان کا دس برس تک ساتھ رہا، یہ مدت خاصی طویل ہے۔ اتنے عرصہ میں ہم نے دیکھا ہے، پرانی دوستیاں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں گہرے سے تعلقات داستان پارینہ بن گئے۔ خلوص اور یگانگت کے دعوے نقش باطل ثابت ہوئے جو پہلے اچھے تھے اب برے بہت برے بن گئے۔ جو پہلے برے تھے اب اچھے بہت اچھے نظر آنے لگے۔ اتنے طویل عرصہ میں انسان کی رائے اس کے تجربے اس کے مشاہدے اس کے فیصلے کتنے کچھ منقلب نہیں ہوتے؟ دوسروں پر بھی یہی گذرتی ہے۔ ہم پر بھی یہ گزر چکی ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اتنے مکمل مشاہدے اور مفصل تر تجارب کی روشنی میں بھی حیدر حسن خاں کا وجود سمندر کا وہ "مینارۂ نور" بنا رہا۔ جس سے زندگی کے جہاز اور مستی کے سفینے صراط مستقیم حاصل کرتے ہیں، ہلاکت کی چٹانیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

پہلے سمجھے تھے ہم نے مولوی صاحب کو خوب جی بھر کے دیکھ لیا اور اب کہ وہ ہم میں موجود نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ایک برق جہندہ تھی جو چمکی اور غائب ہوگئی

جھانک کر اس نے جو چلمن ڈال دی
دیکھنے والوں نے گردن ڈال دی

شعر عامیانہ ہو تو ہو، لیکن حسب حال ضرور ہے۔

بے شک یہ خاکی دنیا حیدر حسن خاں کے وجود سے محروم ہو گئی، لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اس مرد مومن کا استقبال دوسری دنیا میں کس شان سے ہو رہا ہے اس دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آکر وہ رسول کا شارح اور مفسر پیام برادر داعی اس دنیا میں پہنچ چکا ہے جہاں نہ زندگی کی پابندیاں ہیں نہ دوسروں کے اشارۂ چشم و ابرو کا کچھ مفہوم ہے نہ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم وہاں صرف رحمت ہے، ربوبیت ہے، شان مغفرت ہے، جس کے جلو میں یہ نعائم موجود ہوں وہ رونے والوں کا دیدۂ ترکیوں دیکھے؟

جا! اے بیقرار روح یثرب کے سرکار کے دربار میں جا! تیری خدمات مقبول ہوئیں، اسی دربار میں ہمیشگی کی زندگی بسر کر۔

الوداع۔ الوداع!

مولانا حسین احمد

ماضی کی چند بھولی بسری باتیں

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگرس کے ساتھ ساتھ مجلس خلافت کا بھی سالانہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ ندوہ کے چند طلبہ شرکت کے لیے گئے تھے ان میں میں بھی تھا۔ جلسہ کے صدر مولانا محمد علی مرحوم تھے، اس جلسہ میں وقت کے اہم ترین مسئلہ یعنی نہرو رپورٹ پر بحث و گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ متعدد لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور تقریباً سب ہی نے رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قرار دیا۔

اب ایک اور مقرر صاحب اسٹیج پر تشریف لائے یہ مولانا حسین احمد تھے آپ نے ایک طویل تقریر کی، مولانا کو ہندوستان سے متعلق ہندو اور انگریز مورخوں کے اقوال زبانی یاد ہیں اور اپنی تقریر میں بڑی روانی کے ساتھ وہ انہیں پیش کیا کرتے ہیں اس تقریر کی خصوصیت بھی یہی تھی، تاریخ سے یعنی ماضی سے گزر کر مولانا جب حال پر آتے تو اور زیادہ فصاحت سے انہوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے، تقریر میں انگریزوں کے خلاف بھی بہت کچھ کہا تھا، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے انگریزوں سے زیادہ ہندوؤں کے خلاف، ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی کے خلاف نہایت تلخ اور تند باتیں کہی تھیں، مولانا کی تقریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کو "پاکستان" بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

چنانچہ تاریخی حوالوں سے ہندوؤں کے وطن کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے فرمایا کہ وہ تو وہاں بھی جا سکتے ہیں اور اس دیس کی سرزمین پر کوئی حق نہیں رکھتے، لیکن ہم نے تو اس ملک کو فتح کیا ہے اور اس طرح فتح کیا ہے کہ ہم اس سرزمین پر مرنے کے بعد بھی قبضہ رکھتے ہیں، ہر روز نہ جانے کتنے مسلمان مرتے رہتے ہیں اور ہر مسلمان مرنے کے بعد اس سرزمین کے ایک حصہ پر قابض ہو جاتا ہے، لہٰذا ہم تو کسی طرح

سے نہیں جا سکتے اس طرح کے متعدد تاریخی اور علمی لطائف سے یہ تقریر بھرپور تھی۔ یہ تقریر دلپذیر سننے کے بعد گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، کہ مولانا کبھی قومیت متحدہ کا علم بھی اپنے دوش ناتواں پر لہراتے ہوئے سر سہ اہل نظر ثابت ہوں گے، لیکن یہ زمانے کے انقلابات ہیں اور اس طرح کی تبدیلیاں انسانوں میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

میر سے تغیر رنگ پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے!

۱۹۳۸ء میں تھانہ بھون سے واپسی پر چند گھنٹے کے لیے دیوبند بھی جانے کا اتفاق ہوا، مولانا طیب صاحب، مہتمم دار العلوم کے نام مولانا عبد الماجد نے ایک تعارفی خط دے دیا تھا۔ اس خط نے بڑا کام دیا۔ مولانا طیب صاحب شاہ محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں، اور اپنے اسلاف کرام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان کا انکسار ان کی تواضع ان کی مہمانداری ہر چیز میں قدامت کی دلربا شان نظر آتی ہے، باتیں سنئے! جیسے نغمۂ فردوس، صورت دیکھئے تو معلوم ہو۔

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مولانا طیب کی عنایت سے دار العلوم کے حلقہ ہائے درس کے دیکھنے کا بھی مجھے موقع ملا۔ اور میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ مشرق کی اس مایۂ ناز درسگاہ کے معائنہ اور مشاہدہ کی مجھے سعادت حاصل ہوئی، مولانا حسین احمد صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کا مجھے اتفاق ہوا، مولانا حدیث کا درس دے رہے تھے، مولانا سے سیاسی اختلافات کسی کو خواہ کتنے ہی ہوں لیکن ان کے علم وفضل تقدس وسعت نظر اور تقویٰ کے سب قائل ہیں۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ اس حلقہ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا، اور مولانا کی تدریس کا انداز دیکھا علوم اسلامیہ میں سب سے زیادہ اہم اور نازک فن حدیث ہی کا ہے، لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مولانا ایں ہمہ فضل وکمال ڈاکٹر ضیاء الدین بن کر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے بہترین ماہر تعلیمات ہیں، لیکن سارا وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں۔ مولانا مایۂ ناز محدث ہیں، لیکن سیاسی اشتغال میں ایسے الجھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کے فضل وکمال سے طلبہ پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے، کاش! مولانا کی سرگرمیاں صرف دیوبند تک محدود رہتیں!

مولانا سید سلیمان ندوی

"مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں"

میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ندوہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں کی دنیا ہی دوسری تھی۔ دوسرے عربی مدارس کی طرح یہاں وہ گھٹن اور وہ چبھن نہیں تھی جس سے عام طور پر عربی مدارس کے طلبہ دوچار رہتے ہیں نہ یہاں وہ عہد مظلمہ کی تاریکیاں اور پابندیاں تھیں جن سے عام طور پر مدارس عربیہ کے طلبہ کو سابقہ پڑتا رہتا ہے نہ یہاں وہ اعتکاف و اعتزال کا عالم تھا جو عام طور پر عربی مدرسوں کا طرۂ امتیاز تھا، نہ یہاں اساتذہ اور طلبہ کا معاملہ "بین الخوف والرجا" معلق تھا، جیسا کہ عام طور پر عربی درسگاہوں میں ہوتا رہتا ہے، یہاں روشن خیالی اور تیز خرامی تھی، زندگی اور زندہ دلی تھی، شوخی اور بذلہ سنجی تھی، بے تکلفی اور یارباشی تھی، اجتماعیت اور مجلس آرائی تھی، والی بال تھا، فٹ بال تھا، ہاکی تھی، بین المدارس میچ تھے جلسے تھے، پارٹیاں تھیں، جلوس تھے، مظاہرے تھے، مشاعرے تھے، مقابلے تھے، اور نماز کے وقت نماز، کھیل کے وقت کھیل، تعلیم کے وقت تعلیم، ندوہ میں سب سے زیادہ عظیم، محبوب اور دل آویز شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی کی تھی، وہ دارالمصنفین کے ناظم کی حیثیت سے اعظم گڑھ میں مقیم تھے، کبھی کبھی ندوہ آتے تھے، دو چار روز رہ کر چلے جاتے تھے معتمد تعلیمات وہی تھے ندوہ کے تعلیمی امور کا آخری فیصلہ انہی کے ہاتھ میں تھا، اب تک میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا نام سنا تھا، ایک روز مغرب کے بعد میں کھانے کی گھنٹی کے انتظار میں ٹہل رہا تھا، آگے آگے میرے ایک ہم وطن سید اختر حسین خیر آبادی تھے، سامنے سے ایک مولانا برآمد ہوئے۔ نہایت سیاہ داڑھی، سر پر نہایت خوبصورت سفید صافہ ہاتھ میں خوشنما چھڑی خوب رُو خوش قامت، خوش لباس، پتلے پتلے ہونٹ، بارعب باوقار آواز، انہوں نے اختر کو ٹوکا۔ "السلام علیکم"، انہوں نے مرعوب ہو کر وعلیکم السلام کہنے کے بجائے ادب سے ہاتھ اٹھا کر

سلام کا جواب دیا۔ مولانا نے رعب دار آواز میں دریافت فرمایا "کیا آپ کا منہ بیلا بولا ہے" اس عجیب و غریب سوال نے اختر کو بالکل حواس باختہ کر دیا، انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بات نہ بڑھائیں اور بغیر جواب دیئے ہوئے کترا کے نکل جائیں۔ مولانا نے ان کا ارادہ بھانپ لیا، اور پھر سوال کیا "کیا آپ بدتمیز بھی ہیں؟" اب ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ اس طرح خاموش کھڑے ہو گئے، جیسے شیر کے سامنے بکری۔ رحم اور ترس کی کیفیت اپنے چہرہ پر طاری کئے بغیر مولانا نے پھر پوچھا، اور بالکل قریب آکر پوچھا "کیا آپ داڑھی مونچھ منڈاتے ہیں؟" حالانکہ وہ سبزہ آغاز تھے مگر گھبراہٹ میں "جی" کہہ گئے۔ اب ذرا درشتی کے ساتھ مولانا نے پوچھا "اسی لیے آپ یہاں آئے ہیں؟" اختر صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پہلے والے سوال کا جواب دیتے ہوئے خود ایک سوال کر ڈالا "میرے داڑھی مونچھ ابھی نکلی کہاں ہے؟" اس اثنا میں کچھ بڑے طلبہ بھی آچکے تھے، انہوں نے آتے ہی مولانا کو گھیر لیا، اب وہ ان کے ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف چلے، راستہ میں کسی سے پوچھا "قال" اصل میں کیا تھا؟ کسی سے دریافت کیا "مفعول مالم یسم فاعلہ" کی مثال کیا ہے؟ کسی سے پوچھا "کلمہ حرف و ممنع لمعنی مفرد" میں "مفرد" کے دال کو زبر دینگے یا زیر یا پیش؟ زبر دیں گے تو کیوں؟ زیر دیں گے تو کس کے لیے؟ اور پیش دیں گے تو اس کی وجہ بیان کرو، یا اس حرف پر تینوں اعراب صحیح ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو بھی اس کا سبب معلوم ہونا چاہیئے، اسی قسم کے سوالات کرتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچ گئے، اب معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی یہی ہیں۔

چھوٹے طلبا پر سید صاحب کی اور ان سے زیادہ ان کے برجستہ سوالات کی دہشت چھائی تھی، اور بڑے طلبہ بھی ان سے اور ان سے زیادہ ان کی شخصیت سے مرعوب تھے، دہشت زدگان میں میں بھی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ میں درجہ اوّل سے چہارم میں پہنچ گیا، مگر سید صاحب کی اور اپنی مڈبھیڑ ہونے نہ ہونے دی، لیکن اب میں نمایاں ہو چکا تھا، اور میرا ان کا آمنا سامنا ناگزیر تھا۔

چنانچہ میرا اور سید صاحب کا پہلا سامنا منفی صورت میں ہوا، درس جاری تھا وہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے معائنہ کے لیے تشریف لائے اور طلبہ سے متعدد سوالات شروع کر دئیے جس نے صحیح جواب دیا، اس سے اور ٹیڑھا سوال کیا، جس نے غلط جواب دیا اس کی سرزنش

شروع ہوگئی۔ اب سید صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے، انہیں زحمت سے اور اپنے تئیں مصیبت سے بچانے کے لیے میں نے ایک اہم فیصلہ کیا یعنی ان کے سوال کا جواب دیا "مجھے نہیں معلوم"، انہوں نے جتنے سوالات کیے سب کا جواب ایک ہی تھا، اس جواب سے سید صاحب خفا تو بہت ہوئے، لیکن ظاہر ہے معاملہ یہیں ختم ہوگیا، اور اب اس کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ تھا، اور یہی میرا مقصد تھا۔

ایک روز رات کو کھانے کے بعد بورڈنگ کا دورہ کیا، میں اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، آج شفقت کا رنگ غالب تھا۔ آتے مسکرائے پوچھا، حضرت! آپ نے مومن کی شاعری پر آپ نے مضمون لکھا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، پسندیدگی کا اظہار فرمایا، کہا، نواب صاحب نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے، لیکن آپ کو ادبی مضامین کے بجائے علمی مضامین لکھنے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے۔ میں نے عرض کیا جو کچھ اپنی محنت اور مطالعہ سے حاصل کر سکتا تھا، اس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔ جس چیز کے لیے تعلیم کی تربیت کی رہنمائی کی ضرورت ہے اسے میں از خود کیونکر کر سکتا ہوں، آپ سکھائیے، علمی مضامین لکھانا۔ میں سمجھوں گا، ڈر تھا، اس جواب سے برہم ہو جائیں گے، لیکن خلاف توقع بہت خوش ہوئے، بیٹھ گئے اور علم و ادب سے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمانے لگے۔

کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ سید صاحب بار بار ندوہ آئے، تھوڑے تھوڑے وقفوں سے آتے رہے اور طویل قیام کرتے رہے، دورانِ قیام میں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ بالخصوص تفسیرِ قرآن کا درس بھی، اس حلقہ میں شریک تھا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ ندوہ کی سیاسیات میں، میں اب بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا تھا، سید صاحب سے زیادہ قرب حاصل ہوا، اس قرب نے میرے دل میں ان کی عظمت پیدا کر دی۔

نگار کے ایک پرچہ میں میرا ایک مضمون شائع ہوا، یہ جواب تھا نیاز صاحب کے بعض اعتراضات کا، سید صاحب اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھے، یہ مضمون دیکھ کر ان کی شفقت اور بڑھ گئی، بہت خوش ہوئے، فرمایا بہت اچھا مضمون ہے، لیکن دلائل کی اور زیادہ گنجائش تھی، میں نے عرض کیا، بجا فرمایا، لیکن یہ علمی مضمون بھی میں نے بغیر رہنمائی کے لکھا ہے، آپ تنقید و مشورہ کے بجائے تربیت کیجئے، میں کوتاہی کروں تو شکایت

کیجئے۔ لیکن آپ توجہ نہ کریں پھر بھی میں کچھ نہ کچھ کرتا رہوں تو آپ کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا آپ کو مولانا شبلی نے بنایا، لیکن مجھے، مجھی کو نہیں ہمیں کون سکھاتا ہے؟ کوئی نہیں۔ آپ مہمان کی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آپ ممتحن کی طرح امتحان لیتے ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں کرتے۔ آپ استاد کی طرح ہمیں سکھاتے نہیں، بتاتے نہیں، پڑھاتے نہیں۔ میں بڑے جوش میں تھا، عبدالسلام قدوائی اور حامد علی بھی موجود تھے، یہ گفتگو دراصل نئے گاؤں میں ہوئی تھی، جہاں انہیں خضرراہ کی طرف سے عصرانہ دیا گیا تھا، اور جس میں صرف ہم چند آدمی شریک تھے، میری باتیں سن کر عبدالسلام کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ خوف و دہشت کے عالم میں ان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لیکن سیّد صاحب نے ایک جاں نواز اور دلربا تبسم کے ساتھ اپنے نہایت ہی مخصوص لب و لہجہ میں فرمایا۔ ماشاء اللہ!، مجھے سیّد صاحب سے سب سے بڑی شکایت یہی تھی، ــ اور اب تک ہے ــ کہ وہ لوگوں کو تیار نہیں علامہ شبلی نے ندوہ سے سیّد سلیمان، عبدالسلام، مسعود علی وغیرہ کو پیدا کیا۔ اور سیّد صاحب علامہ شبلی کی پیداوار کے مقابلے میں۔ اب تک کسی سیّد سلیمان، کسی عبدالسلام کسی مسعود علی کو نہ پیدا کر سکے، حالانکہ سید صاحب کے مقابلہ میں علامہ مرحوم مکروہات دنیا میں زیادہ پھنسے ہوئے تھے۔ لہٰذا جب کبھی مجھے موقع ملتا تھا میں یہ شکایت بے جھجک ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اور وہ پوری شفقت اور مرحمت کے ساتھ میری شکایت سُن لیتے تھے۔

میں پان کھانے کا ہمیشہ سے عادی ہوں، سالانہ امتحان ہو رہا تھا، میں کاپی پر جوابات لکھ رہا تھا، اسٹیج پر شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اور سید صاحب وغیرہ رونق افروز تھے، ایک پان میرے منہ میں تھا اور کئی پان کاغذ کی ایک پڑیا میں لپیٹے ہوئے سامنے رکھے تھے پان میں تمباکو بھی تھا، اس لیے پیک کا تھوکنا ناگزیر تھا، میں نے اصغر (چپراسی) سے کہا "اگالدان لاؤ!،، وہ دفتر سے اگالدان لایا، اور میرے سامنے رکھ دیا، سید صاحب نے یہ حرکت دیکھ لی، فوراً تشریف لائے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کتنے پان کھاتے ہیں،، میں نے پوری سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، دو روپیہ مہینے کے، اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

اب میں درجہ ششم میں پہنچ چکا تھا، اب تک میں سید صاحب کی شخصیت اور ان کی قدر و قیمت سے پورے طور پر واقف نہیں تھا، لیکن اب دل میں ان کی قابلیت، ہمہ دانی، ہمہ گیری

تقدس اور پاکیزگی کا رعب بیٹھ رہا تھا، وہ قرآن کی تفسیر پڑھاتے تو ایسا معلوم ہوتا، اس فن کے امام ہیں، وہ فلسفہ قدیمہ پر گفتگو کرتے، تو اندازہ ہوتا۔ یہ فن بھی

روندا ہوا ہے کوکبۂ شہریار کا

وہ صرف و نحو پر باتیں کرتے تو معلوم ہوتا سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، وہ ادب عربی فصاحت و بلاغت پر گفتگو کرتے تو اندازہ ہوتا جاحظ اور جرجانی سامنے موجود ہیں۔ فلسفے کے ہمارے مولانا حفیظ اللہ صاحب مسلم اور مستند استاد تھے، بوعلی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ درس میں تھی، اور وہی پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ اس کتاب کا ایک سبق سید صاحب نے پڑھایا، آنکھیں کھل گئیں علم کیا ہوتا ہے، علم کی گہرائی کیا ہوتی ہے، یہ آج معلوم ہوا، حدیث کے فن میں مولانا حیدر حسن صاحب مغفور امام وقت تھے، لیکن سید صاحب اگر بخاری یا مسلم کے درس میں کبھی اپنے نکات بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں سید صاحب نے صرف کی ہے، فقہ اور اصول فقہ میں مولانا شبلی فقیہہ مرحوم کا کوئی ہمسر نہ تھا، لیکن طبیعت حاضر ہوتی تو اس فن پر سید صاحب کے معلومات حیرت انگیز ثابت ہوتے، غرض کوئی فن ایسا نہ تھا، جس پر سید صاحب درس نہ دے سکتے ہوں اور اسرار و غوامض کی عقدہ کشائی نہ کر سکتے ہوں، پھر ان سب کے ساتھ مذہبیت نظری نہیں عملی، نماز بھی اور تسبیح و تہلیل بھی ذکر و شغل بھی، اور پھر مذہبیت کے ساتھ تقدس، سیاہ داڑھی اب سفید نورانی داڑھی میں تبدیل ہو چکی تھی، ذرا ذرا سی باتوں میں تقوے اور خشیہ کی کارفرمائی، پھر تقدس کے ساتھ حب رسولؐ کی نعمت سے مالا مال ساری عمر سیرۃ النبیؐ لکھنے میں گزار دی، اور اس موضوع پر ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا تیار کر دی، دنیا کی کسی زبان میں حتیٰ کہ عربی میں بھی سیرۃ نبوی پر اتنا معتبر، مستند اور بہترین ذخیرہ یکجا نہیں ملے گا۔ یہ مذہبیت یہ تقدس، حب رسولؐ بالا بالا نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ وقت کے مشہور صوفی حضرت شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رویا کی بنا پہ بشارت دی، کہ دربار نبوی میں یہ کتاب مقبول ہو چکی ہے۔

اے خوشا روز سے و خرّم روزگار سے!

سن ۳۲ء کی عظیم الشان اسٹرائک میں سید صاحب بغیر بلائے ہوئے تشریف لائے۔ اس معاملہ فہمی، محبت، شفقت اور اپنائیت کے ساتھ گفتگو کی کہ معاملات سلجھ گئے، طلبہ سٹرائک ختم کر دینے پر راضی ہو گئے، لیکن سید صاحب کا فارمولا نواب صاحب نے نہ مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ سٹرائک

ٹوٹتے ٹوٹتے پھر پوری شدت کے ساتھ جاری ہوگئی۔

اس اسٹرائک کے سلسلہ میں عبد السلام قدوائی اور راقم الحروف ممنوع الادخال ہو چکے تھے لیکن بعض عہدہ داران دار العلوم کی سخت مخالفت کے باوجود سید صاحب نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیکر ہم دونوں کے داخلہ کا حکم دے دیا، لیکن بعد میں یہ حکم نواب صاحب نے منسوخ کردیا۔ اب سید صاحب بے بس ہوگئے، انھوں نے ایک پُرزور سفارشی خط لکھ کر ہمیں جامعہ بھیج دیا۔ ابھی نہیں جامعہ کے دور ابتلا میں ہمدردی و محبت، شفقت و مرحمت، تسکین و تسلی سے بھرے ہوئے کئی خط آئے، بعض خطوں میں تو اپنی جیب خاص سے مالی امداد تک کرنے کے عزم کا اظہار تھا، دلی سے لکھنؤ اکثر آنا ہوتا رہتا اور سید صاحب سے ملاقات بھی اکثر ہوتی رہتی، گھنٹوں اور پہروں ندوہ کے مستقبل پر اس کے تعمیری مسائل پر گفتگو فرماتے کہیں سے یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ دل میں گذشتہ خام کاریوں، اور گستاخیوں کی یاد باقی ہے رحمت اور عطوفت کا ایک سیل رواں تھا جو ہر بھی کو، ناراضی کو، خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا تھا، باغی دل نے یہ سلوک دیکھا، اور وہ عقیدت و عظمت کا مرکز بن گیا!

سنہ ۱۹۳۵ء میں پھر ایک اسٹرائک ہوئی، بمبئی میں مجھے جو اطلاعات ملیں ان کی بناء پر اربابِ انتظام کے خلاف میں نے پھر ایک مضمون لکھا، اس سیل خیالات کے دو ایک چھینٹے سید صاحب کے دامن تک بھی پہنچ گئے، بجائے خفگی اور برہمی کے پر شفقت اور وقار کے خیال سے مخاطب ہوکر ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا، جس میں اصل واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور آخری جملہ یہ تھا کہ کیا تم بھی مجھے ایسا سمجھتے ہو، یعنی:

> خندہ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
> تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

میں بہت متاثر ہوا، ندوہ کے مسئلہ میں بہت زیادہ جذباتی ہوں لیکن سنبھل گیا، سید صاحب کے خط کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اگر کوئی غلطی بھی کرتے ہیں، تو دیانت داری سے اور نیک نیتی سے کرتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے دل کو نہ دکھاؤں، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس عزم پر قائم ہوں اور خدا سے دعا ہے کہ ہمیشہ قائم رہوں!

مولانا شبیر احمد عثمانی

طبقۂ علماء کی ایک برگزیدہ ہستی!

سنہ ۳۳ء کا واقعہ ہے، جامعہ ملیہ میں ایک روز غلغلہ مچا کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی تشریف لائے ہیں، اور لائبریری کے ہال میں ان کی تقریر ہوگی۔

ہم سب اپنے اپنے درجوں سے نکل کر لائبریری کے ہال میں پہنچے، تھوڑی دیر میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی معیت میں گاڑھے کے لباس میں ملبوس دوہرا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، نورانی داڑھی، آنکھیں نیچی، لیکن چہرہ پر ایک رعب وجلال، آہستہ آہستہ خراماں خراماں ایک صاحب تشریف لائے، یہی جانشین شیخ الہند مفسر قرآن اور شارح حدیث مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔

ہم سب کو اشتیاق تھا کہ مولانا اپنی خطابت کے جوہر دکھائیں گے، الفاظ سے کھیلیں گے، اور فصاحت بیان وطلاقت لسان کے اعجاز کا مظاہرہ فرمائیں گے لیکن انہوں نے فرمایا، میں آپ کے سامنے کوئی تقریر نہیں کرنا چاہتا، صرف ایک بات کہتا ہوں، اسے تقریر سمجھ لیجئے، نصیحت سمجھ لیجئے، جو چاہے سمجھ لیجئے، وہ بات یہ ہے:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو

اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکثر احباب مایوس ہوئے کہ مولانا نے تقریر نہیں فرمائی، لیکن میرے دل نے کہا، کوئی تقریر بھی اس جامع ومانع تقریر سے مؤثر ہو سکتی تھی، ان چند الفاظ میں مولانا نے وہ کہہ دیا جو دوسرے لوگ گھنٹوں میں بھی نہیں کہہ پاتے۔

پھر ایک عرصہ گزر گیا، مولانا کا دیدار نہیں ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں مسٹر قطب الدین صدیقی نے بمبئی میں خلافت کانفرنس کا اہتمام کیا، طے یہ ہوا کہ صدارت کی دعوت مولانا عثمانی کو دی

جائے۔ مولانا ڈابھیل کی جامعہ اسلامیہ میں قیام پذیر تھے، یہ خدمت میرے اور جناب غازی محی الدین صاحب اجمیری، آنریری سیکرٹری سنٹرل خلافت کمیٹی کے سپرد ہوئی کہ ڈابھیل جائیں، اور مولانا کو صدارت قبول کرنے کی دعوت دیں۔

ہم دونوں سورت اور راندیر اور نوساری کی سیر کرتے ہوئے ڈابھیل پہنچے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مغربی ہند میں علوم اسلامیہ وعربیہ کی تعلیم و تدریس کا اتنا بڑا اور شاندار دارالعلوم مولانا اور ان کے رفقاء کار کی ہمت اور حوصلہ نے قائم کر رکھا ہے۔

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد، ہم دونوں باریاب ہوئے، اسلامی ہند کا یہ بہت بڑا مفسّر اور شارح حدیث، مشہور خطیب اور بلند پایہ واعظ، فاضل اجل اور علامہ بے بدل، فقہ و اصول کا ماہر، اور دینیات و اسلامیات کا اُستاد، ایک معمولی سے کمرے میں ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا نہ نظر فریب فرنیچر تھا، نہ شاندار عمارت، لیکن اس سادگی میں بھی ایک جلال تھا، اس خاکساری میں بھی ایک وقار تھا، اس فروتنی میں بھی ایک دبدبہ تھا۔

ہم لوگوں نے اپنے معروضات پیش کئے، مولانا نے اپنی علالت کا عذر پیش کیا ہمارا نیاز مندانہ اصرار بڑھا، تو نہایت درجہ وسعتِ قلب سے کام لے کر دعوت قبول فرمالی، اور وقت مقررہ پر بمبئی تشریف لے آئے۔

خلافت کانفرنس میں مولانا نے کوئی لکھا ہوا خطبہ نہیں پڑھا، ایک برجستہ تقریر فرمائی، جلسہ میں مخالف بھی تھے اور موافق بھی، نکتہ چیں بھی اور مداح بھی لیکن سب کا عالم یہ تھا، کہ علم و معرفت کے اس بحر مواج کا تلاطم دیکھ رہے تھے، اور محوِ حیرت تھے۔

تقریباً دو گھنٹہ تک مولانا کی تقریر جاری رہی، اس مدت میں مولانا نے حقیقت و معرفت کے جو جواہر پارے بکھیرے، کوئی دامن ایسا نہ تھا، جو ان سے خالی رہا ہو، یہ معلوم ہوتا تھا سیاست اور شریعت کا ایک دریا ہے جو اُمنڈا چلا آ رہا ہے، تاثر کی کیفیت یہ تھی، کہ سناٹا چھایا ہوا تھا تقریر ختم ہونے کے بعد بھی، کچھ دیر تک دفور تاثر کی جو کیفیت لوگوں پر طاری رہی الفاظ میں یارا نہیں، کہ اس کی تصویر کھینچ سکیں۔

مُلّا طاہر سیف الدین

نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

بوہرہ قوم کے روحانی تاجدار، دنیاوی سردار، اور اس کی اصلاح و فلاح کے واحد ذمہ دار اور علمبردار ہزہولی نس سیدنا مُلّا طاہر سیف الدین کے اسم گرامی سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، بوہرہ قوم ایک پراسرار قوم ہے، اس قوم کے افراد ملتے سب سے ہیں، شریک حال سب کے ہیں، معاشرتی طور پر بڑے خلیق، بامروّت اور مرنجاں مرنج ہوتے ہیں، لیکن ان کے اصل عقائد کیا ہیں؟ خیالات کیا ہیں؟ مذہبی بنیاد و اساس کیا ہے؟ معتقدات و خیالات کا سرچشمہ اور منبع کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب آپ کو کوئی بوہرہ نہیں دے گا، مسکرا کر بات ٹال دے گا، یا زیادہ صاف گو ہوگا تو کہہ دے گا، یہ باتیں ہم لوگ نہیں بتایا کرتے۔ آپ کو اگر زیادہ کاوش اور جستجو ہے، تو سراغرسانی سے کام لیجیے یا قیاس آرائی ہے، کسی بوہرہ کی خدمات سے آپ اس سلسلہ میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

بمبئی آئے اور یہاں کے مستقل قیام کے بعد بوہرہ اصحاب سے ملنے جلنے کا بھی اتفاق ہوا، اور خوجہ صاحبان سے بھی، بوہروں کے پیشوا ملّا صاحب ہیں، اور خوجوں کے سر آغا خان، یہ دونوں فرقے دراصل فرقۂ شیعہ کی شاخ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن دونوں کی تنظیم بھی جدا ہے، اور اصول حیات بھی، عامۂ مسلمین سے بھی یہ کچھ زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتے، بلکہ ایک حد تک کھچے کھچے، اور الگ الگ سے رہتے ہیں، اس کے باوجود مجھے یہ دیکھ کر تعجب آمیز مسرت ہوئی کہ بوہرہ اصحاب نسبتہً نماز کے زیادہ پابند ہیں، اس ترقی کے دور میں بھی داڑھی رکھتے ہیں، اور ذرا شرم نہیں محسوس کرتے، مذہب بیزاری، اور روشن خیالی کے اس "دورِ جدید" میں بھی، یہ "عہد عتیق" کے باشندے معلوم ہوتے ہیں، کوئی کام بغیر "امام" کی مرضی کے نہیں کرتے، مرگ و شادی تجارت اور کاروبار، سیاست اور اخلاق، غرض دین اور دنیا کے ہر معاملہ میں یہ اپنے امام کے

سچے پیرو اور جاں نثار معتقد ہیں۔

صرف یہی نہیں، امام کے دیدار کے متوالے، اس کے احکام کے پروانے، اس کے فرمان کے دیوانے، یہ تاجر قوم ہے، اس کے افراد لاکھوں کروڑوں روپیہ حکومت کو انکم ٹیکس، سوپر ٹیکس اور ایکسس پرافٹ ٹیکس کی صورت میں دیتے ہیں، لیکن یہ لوگ بڑی خندہ جبینی سے "زکوات" کی رقم بھی نکالتے ہیں، اور ملاجی کے عائد کئے ہوئے دوسرے "محاصل" بھی ادا کرتے ہیں، اور اس طرح "قیصر کا حق قیصر کو، دینے کے بعد کلیسا کا حق کلیسا کو" بھی بڑی فراخدلی سے دیتے ہیں۔

اس قوم (خوجہ اور بوہرہ دونوں) کے مورث اعلیٰ حسن بن صباح صاحب قلعۃ الموط، اور ان کے یکتائے روزگار "فدائیوں" کی تاریخ سے، اسلامی تاریخ کا ہر متعلم واقف ہے مجھے نہیں معلوم آغاخان کے ہاں فدائیوں کا کوئی سلسلہ ہے۔ یا نہیں؟ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں، بوہروں میں اب تک ایسے فدائی اپنے امام کے موجود ہیں، جو اس کے ایک اشارہ پر یا بلغیر کسی اشارہ کے اپنے جوش عقیدت سے مجبور ہو کر مخالف کی جان لے کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں، اور ذرا بھی نہیں جھجکتے۔

اس قوم کا وطن ہندوستان ہے، اس کے امام کا اپنے آبائے عرب سے اب کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا ہے، لیکن یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی، کہ ملا صاحب کی سرکاری زبان "عربی" ہی اب بھی ہے، ان کے ہاں سے احکام ومراسلات، فرامین وارشادات، ہدایات ونصائح غرض جو کچھ بھی شائع ہوگا، وہ عربی میں، یا کم از کم اس طرح کہ زبان گجراتی، مگر رسم الخط عربی، خود ملا صاحب عربی زبان کے صاحب طرز ادیب ہیں، وہ عربی لکھتے بھی بہت اچھی ہیں اور بولتے بھی بہت اچھی ہیں، عربی میں شعر بھی کہتے ہیں، انداز کلام پر قدامت کا رنگ غالب ہے لیکن جہاں تک زور کلام ادبیت، اور فصاحت وبلاغت کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ ادیب کامل ہیں، ملا صاحب کی متوازی حکومت میں بہت سے عہدیدار ہیں، وزیر بھی ہیں اور مشیر بھی، ڈائرکٹر تعلیمات بھی، اور پولیٹیکل ایڈوائزر بھی، ان کا ایک مستقل نظام ہے، کئی سو مدرسے اس نظام کے ماتحت چلتے ہیں، ہزاروں آدمیوں کی استحقاق کی بنا پر مالی امداد کی جاتی ہے، اور مستحقوں سے امداد بھی لی جاتی ہے، ملا صاحب کا باقاعدہ دربار لگتا ہے، اور اس میں اپنے اپنے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق لوگ نشست پاتے ہیں، عوام کے جوش عقیدت کا یہ حال ہے کہ وہ صرف دیدار کیلئے اپنا سب کچھ لٹا دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، سرمایہ داروں کے

طبقہ میں ملا صاحب کے عائد کیے ہوئے محاصل کی ادائی میں کچھ ہچل ہو تو ہو لیکن عوام ان محاصل کو گھر کی پونجی بیچ کر بھی ادا کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

بوہروں میں ایک جماعت مخالفین کی بھی پیدا ہو چکی ہے، جو ایک عرصہ سے اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہے، اس جماعت کے سرگردہ سر آدم جی بھائی تھے لیکن انہیں اپنی قوت کا بہت غلط اندازہ تھا، مقابلہ کر کے اس طرح تباہ ہوئے کہ آج ملا جی کے تصرفات روحانی میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

دل میں ایک عرصہ سے اشتیاق تھا، شرف نیاز حاصل کرنے کا، لیکن

راہ میں وہ ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

ایک مرتبہ بالکل اچانک ملاقات ہو گئی۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے،

میں فورٹ سے واپس آ رہا تھا، کہ ایک دوست راستہ میں ملے، انہوں نے کہا آپ سے ملا صاحب کے وزیر تعلیمات ملنا چاہتے ہیں، چلئے ذرا ان سے مل لیجئے، بدری محل ملا صاحب کا سامنے ہی تھا۔ میں نے بغیر کسی تامل کے کہا چلیے۔

وزیر تعلیمات صاحب بہت اخلاق سے پیش آئے، اور سیاسی و مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے، میرے بعض مقالات ان کی نظر سے گزرے تھے اور وہ انہیں پسند آئے تھے اسی لیے انہوں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا، میری ان کی ملاقات ابھی جاری تھی کہ بدری محل میں ایک ہل چل سی مچ گئی، اتنے میں نقیب نے گرجدار آواز میں نعرہ لگایا :۔ امام المومنین خلیفۃ المسلمین، اعلیحضرت سیدنا ملا طاہر سیف الدین تشریف لاتے ہیں، ایک ہیبت سی چھائی ہوئی تھی، بدری محل کے در و دیوار پر لرزتے ہیں، میں نے دیکھا، ملا صاحب اپنے جان نثاروں اور فدائیوں کے ساتھ اپنے کورٹ میں چلے گئے، معلوم ہوا کہ نماز فجر و عصر کی امامت ملا صاحب یہیں فرماتے ہیں۔

دل میں شوق ملاقات کا پرانا جذبہ پھر ابھرا، میں نے بے تکلف وزیر تعلیمات صاحب سے عرض کیا، میں ملا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، وہ فوراً مجھے اپنے کمرہ میں چھوڑ کر ملا صاحب کے پاس پہنچے، اور ان سے اجازت لے کر آئے، اور مجھے لے گئے۔

ایک نہایت وسیع اور کشادہ کمرہ، سادہ فرش، ملا صاحب اتنے بڑے کمرہ میں تن تنہا

گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، میں سامنے پہنچا مسکرا کر خیر مقدم کیا، اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، پھر اشارہ کر کے اپنے پاس بٹھالیا، نحیف و نزار جسم، عمر پچاس سے متجاوز، آواز میں ملائمت اور شیرینی، انداز گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا، ایک بلند پایہ شخصیت ہے، جسے اپنے مجد و وقار کا بہت خیال ہے، اور اپنی گفتگو، حرکات، سکنات عمل، ہر چیز میں اس مجد و وقار کی شان اور آن باقی رکھنا چاہتی ہے، کلام میں پیش قدمی خود کم کرتے تھے، جواب میں خاموشی کی ساری کسر اپنے اخلاق سے نکال دیتے تھے۔

دس پندرہ منٹ بیٹھ کر میں نے اجازت چاہی، جب میں رخصت ہونے لگا تو ایک صافہ مجھے مرحمت ہوا، یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ ملا صاحب نے نوازش فرمائی۔ سرفراز فرمایا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے کئی بار سوچا، ملّا صاحب جس نظام کے حامل ہیں، اس میں کچھ شخصی اور ذاتی خرابیاں ہوں یہ الگ چیز ہے، لیکن اس کی افادیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن کیا اس نئے زمانہ میں یہ پرانا نظام زندہ رہنے کی سکت رکھتا ہے؟

مولانا عبدالماجد دریابادی

ایک کامل العیار انسان

ایک زمانہ تھا کہ مولانا عبدالماجد ایک بہترین ادیب اور انشا پرداز، ایک صاحب طرز مصنف اور مؤلف، ایک سنجیدہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور انام اور مرجع خواص بنے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ مذہب کے منکر تھے، ارتیاب، تشکک، اور الحاد و دہریت کے علمبردار تھے، لیکن ان کی لامذہبی، آزاد خیالی اور "ترقی پسندی" بھی اپنے اندر ایک آن رکھتی تھی، اس میں ایک وزن تھا وقار تھا، وہ مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے تھے، اس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے، انہوں نے علامہ شبلی کی "الکلام پر ایک تنقیدی نظر" "ایک طالب علم" کی حیثیت سے ڈالی، اور سنجیدگی، متانت، اور وقار علم کے ساتھ ان کے مذہبی دلائل کی ایسی مخالفت کی، کہ وہ بھی ان کی ذہانت، قوت فکر اور جولانی طبع کے قائل ہو گئے۔

پھر وہ دور آیا، کہ

دہی ریاض جو تھے بُت پرست و بادہ پرست
خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے؟

مذہب نے ان پر اثر کیا، اور ان کا اوڑھنا بچھونا مذہب بن گیا، تاریخ ہو یا فلسفہ، سیاست ہو یا معاشرت ہر چیز کو وہ خالص اسلامی حیثیت سے دیکھنے اور پرکھنے لگے، داڑھی منڈی تھی بڑھ گئی، کوٹ پتلون نے کنارہ کشی اختیار کر لی، موٹے کھدر کا کرتہ اور پاجامہ، ٹوپی اور عبا ان عناصر اربعہ نے مستقل لباس کی صورت اختیار کر لی، بزم و انجمن کی رنگینیاں رخصت ہو گئیں مسجد و خانقاہ سے دل ملنے لگا، علوم عصریہ اور افکار جدیدہ اور حوادث حاضرہ کے مطالعہ و مشاہدہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن زیادہ وقت اب صرف ہونے لگا، قرآن پر، تفسیر پر، حدیث رسولؐ پر، سیرت نبویؐ پر، حیات صحابہ و تابعین پر، پہلے فلسفہ پر ایک فن کار کی

حیثیت سے لکھتے تھے، اب اس فن کو ایک بڑے مقصد — اسلام — کی تائید میں صرف
کرنے لگے، جب تک لامذہب تھے، دوسروں کو اپنانے سے بے نیاز تھے "مسلمان"
ہوئے تو ساری دنیا کو اسی دین پر عمل پیرا دیکھنے کی آرزو کرنے لگے، قلم میں قدرت
نے بے پناہ کشش اور قوت ودیعت کر دی تھی "فلسفۂ جذبات" ہو یا "تصوف اسلام" یہ
کشش ہر جگہ میں موجود ہے۔

مجھے جب کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور میں ان کے نام نامی و
اسم گرامی سے واقف ہوا، تو یہ مسٹر سے مولانا بن چکے تھے، کچھ دنوں کے بعد ان کا یگانہ
اور منفرد اخبار "سچ" جس کا نام اب "صدق" ہے — نکلا، پہلا نمبر دیکھا، طرزِ تحریر ایسا
بھایا کہ میں اس کے مستقل قارئین میں شامل ہو گیا، ان کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اور ایک ایک
حرف کو والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتا، مجنونانہ جوش و خروش کے ساتھ دوستوں کو سناتا۔

یوپی کی حکومت نے ہندوستانی اکاڈمی کے نام سے ایک علمی و ادبی ادارہ قائم کیا، اس
کے جو ممبر سرکار نے نامزد کیے، ان میں مولانا عبدالماجد بھی تھے مجھے ایک سرکاری ادارہ میں
ان کی شرکت پسند نہ آئی، جذبہ عقیدت کو ٹھیس سی لگی، فوراً ایک خط لکھا کہ "آپ محرم کے
زمانہ میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ حسین ابن علی کے نقشِ قدم پر چلیں، باطل سے
مقابلہ کریں اور ناحق سے برسرِ جنگ ہوں، یزید کے لشکر اور دہشت سے مرعوب نہ ہوں
دوسری طرف خود آپ وقت کے یزیدوں اور فرعونوں کے بنائے ہوئے اداروں میں شریک
ہوتے ہیں، آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے؟ . . ." یہ خط میں نے "مقتدر حسین جعفری" کے نام سے
لکھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا انہیں میرا نام معلوم ہو، ورنہ اگر انہوں نے سید صاحب یا ناظم
صاحب سے شکایت کر کے ندوہ سے میرا نام خارج کرا دیا تو اور مصیبت آئے گی، دوسرے
پرچہ میں "مقتدر حسین صاحب جعفری" سے خطاب کیا گیا، کہ آپ اپنا پتہ لکھئے تو آپ کو جواب
دیا جائے گا! میں نے اپنے دوست حامد علی مدیر "خضرِ راہ" کے ذریعہ جواب مانگا، جواب آیا،
ملاقات کیجئے، تو گفتگو ہو، اب مقتدر حسین کا حجاب حائل اٹھتا نظر آ رہا تھا، بڑی کشمکش میں
تھا ملوں یا نہ ملوں؟ آخر ہرچہ باداباد کہہ کر، میں نے پھر ایک خط لکھا کہ میرا نام مقتدر حسین
نہیں، رئیس احمد ہے۔ میں ندوہ کا طالب علم ہوں، مصلحتاً میں نے نام بدل دیا تھا، اگر آپ
خفا نہ ہوں تو ملنے آؤں، فوراً جواب آیا "خفا؟ آپ ایک نوعمر عزیز کی حیثیت سے ملنے

آ بیٹھے، خفگی کی کیا بات ہے؟"

اب ذرا ڈھارس بندھی، اور دوسرے روز، خاتون منزل سے گولہ گنج ... میں پہنچا، اوپر اطلاع کرائی، تھوڑی دیر کے بعد طلبی ہوئی، دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر پہنچا، بزرگانہ شفقت اور محبت سے پیش آئے، دہشت نکل گئی، انس سا پیدا ہو گیا، میں نے دیکھا ایک ہاتھ زخمی سا نظر آ رہا ہے، پٹی بندھی ہوئی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا۔ عہد طفلی میں ہاتھ پر اپنا نام گدوایا تھا پھر تجدید اسلام کے بعد کتب مذاہب میں اس کے خلاف وعیدیں دیکھیں، فوراً ڈاکٹر کو بلایا، ہاتھ اس کے سامنے بڑھا دیا کہ اس کی اپنج کے لیے اور چوڑے حصہ کی اتنی پوری کھال کو کھرچ دو، تراش دو، ڈاکٹر نے ابہام و تفہیم کی کوشش کی، لیکن ناکام ہوا، اور آخر اسے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ یہ وہی زخم تھا جس کی کئی دنوں سے ڈریسنگ ہو رہی تھی اور جس کے مندمل ہونے میں ابھی کئی ہفتوں کی مدت باقی تھی زخم دیکھ کر اور زخم سے زیادہ یہ عزم و استقامت فی الدین دیکھ کر حیرت زدہ تھی، رونگٹے کھڑے ہو گئے، دل نے کہا، یہ ہے وہ خضر راہ، تحت الشعور میں جس کی تلاش تھی، خوش قسمتی دیکھیے آج وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

ڈریسنگ اور علاج کے سلسلہ میں جب تک مولانا لکھنؤ میں مقیم رہے، میں بڑی پابندی اور کثرت سے ملتا رہا، رفتہ رفتہ وہ تعلق پیدا ہو گیا، جو ایک خادم اور مخدوم میں، خورد اور بزرگ میں ہوتا ہے اور خدا کے فضل سے یہ تعلق اور اختصاص روز بروز پائندہ تر اور مستحکم تر ہوتا گیا۔

میں گیا تھا ایک باغی کی حیثیت سے، واپس آیا تو وہاں عظمت اور محبت کا سرچشمہ بن چکا تھا۔

مولانا کی تربیت کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ مخاطب کو "عبد ذلیل" اور اپنے تئیں "رب جلیل" سمجھ کر گفتگو نہیں کرتے۔ گفتگو میں واعظانہ اور ناصحانہ رنگ غالب ہوتا ہے، وہ باتوں باتوں میں نہایت سادگی کے ساتھ، اپنا خیال اس طرح آپ کے دل میں پیوست کر دیں گے کہ وہ آپ کا خیال بن جائے گا، کچھ عرصہ تک اگر ان کے فیض صحبت سے کسی کو مستفید ہونے کا موقع ملے، تو وہ ان کی آنکھوں سے کچھ دیکھنے لگے گا، ان کے کانوں سے سننے لگے گا، ان کے دماغ سے سوچنے لگے گا اس لیے کہ یہ اس دلسوزی اور اپنایت سے شکوک دور کرتے ہیں، اس خلوص اور سچائی سے دلائل پیش کرتے ہیں اور تحقیق اور تفصیل سے صورت مسئلہ [illegible]

کرتے ہیں، کہ ان کی بصارت مخاطب کی بصارت بن جاتی ہے، ان کی ذکاوت اس کی ذکاوت بن جاتی ہے، یہ اپنے خیالات کسی پر ٹھونستے نہیں، اپنے خیالات کا جال اس خوبی سے پھیلاتے ہیں، کہ اس سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں، نثر میں "رعایت لفظی" اس کمال سے یہ استعمال کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا مزا آ جاتا ہے، طرز تحریر اتنا دل نشیں کہ

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ایسا ہی رکھیں گے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو، ایک ہی قلم ہے جس نے "تاریخ اخلاق یورپ" بھی لکھی، اور "فلسفہ جذبات بھی" جس نے "تصوف اسلام" بھی لکھی، اور فلسفہ اجتماع" بھی جس نے "مثنوی بحر المحبت (مصحفی)" بھی مرتب و مہذب کی، اور "مقالات بر محل" بھی، جس نے "سفر نامہ حجاز" بھی لکھا، اور جو "سچی باتیں" بھی لکھتا ہے، ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان سے قائم ہے طرز تحریر کہیں معلّم کا ہے، کہیں مترجم کا، کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا کہیں ادیب کا، تاریخ اخلاق یورپ، شستہ اور رواں ترجمہ ہے، فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کا انداز تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے، تصوف اسلام اور فیہ مافیہ، میں تصوف کی متانت غالب ہے، سفر نامہ حجاز میں قلم ایک ایسے مصوّر کا مو قلم بن جاتا ہے، جو دل کے جذبات کو، تصوّر کی نقش آرائیوں کو عقیدت اور احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فلاسفہ کی خشک مزاجی علما کی تمکنت اور صوفیا کی
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

مشہور ہے، ہمارے مولانا ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، عالم بھی ہیں، اور صوفی بھی، ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، صوفی کا سکوت سب کچھ ہے، لیکن حد کے اندر۔ ان سے آپ گفتگو کیجئے، انکی مجلس میں بیٹھیے، کسی طرح ان سے قرب کا شرف حاصل

کر لیجیے، پھر آپ دیکھیں گے، یہ ملک کا بہت بڑا فلسفی کتنا شگفتہ مزاج ہے، یہ قرآن کا مترجم اور مفسر کتنا بذلہ سنج ہے، یہ اسرار تصوف کا رمز آشنا اپنی گفتگو میں شوخی کی چاشنی طنز کے تیر، رعایت لفظی کی صنعت غرض کیا کچھ نہیں رکھتا؛ پھر موقع موقع سے اساتذہ کے اشعار ہر رنگ شاعری کے ادا شناس، مثنوی مولانا روم سے لے کر، اقبال کے ارمغان حجاز تک، اور میر سے لیکر مثنوی زہر عشق تک، حالی سے لیکر اکبر تک، امانت سے لے کر داغ تک ہر استاد کے اشعار یاد۔

ادب ہو یا لٹریچر، فن ہو یا آرٹ، مشین ہو یا آلہ، اخبار ہو یا رسالہ، کتاب ہو یا مخطوطہ، سیاست ہو یا صحافت، یہ سب سے اپنا کام لیتے ہیں۔ کسی کے آلہ کار نہیں بنتے، ریڈیو رکھتے ہیں، لیکن صرف خبریں اور مضامین سنتے ہیں، کبھی کبھی سینما بھی دیکھتے ہیں، لیکن حظ نفس کیلئے نہیں شیطان کی ترقیاں دیکھنے کے لیے لندن اور امریکہ کے نسوانی رسالے، خیاطی کے میگزین، آرٹسٹوں اور فن کاروں کے صحائف دیکھتے ہیں، اور بغور دیکھتے ہیں، لیکن صرف اس لیے کہ معلوم کریں دختران مغرب کا اخلاقی زوال کس حد عروج تک پہنچ چکا ہے، نت نئے فیشنوں نے کیسے بھیانک اقتصادی اور اخلاقی زوال کی بنیاد ڈال دی ہے، آرٹ اور فن کے نام پر، آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں؟

علماء کا احترام کرتے ہیں، بزرگوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن تقلید اعمیٰ سے گریز کرتے ہیں، اور اپنی رائے بے خوف لومتہ لائم، پورے استقلال و استقامت بیباکی اور صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں، نہ جھجکتے ہیں نہ تامل کرتے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں، لیکن سیاسیات میں ان کے مسلک سے سخت اختلاف رکھتے ہیں، اور اس کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے، مولانا اشرف علی ان کی نظر میں "حکیم الامت" تھے، تھانہ بھون ہر سال کسب فیض کے لیے جایا کرتے تھے اور ہفتوں رہتے تھے، لیکن اس عقیدت کے باوجود متعدد ایسے امور اور مسائل تھے، جن میں حکیم الامت کا مسلک کچھ اور تھا، اور ہمارے مولانا کا کچھ اور، اور اس کے اظہار میں انہوں نے کبھی مداہنت نہیں کی، محمد علی سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی،

جب نام ترا لیجئے، تب چشم بھر آوے

جس دن سے ان کا انتقال ہوا ہے، ملی سیاست سے عملی طور پر ایک قلم دستکش ہو چکے ہیں۔ ان

کی دیانت و امانت اور اصابت رائے کا لوہا مانتے تھے، لیکن کئی ایسی باتیں تھیں، جن میں ان دونوں کے درمیان کبھی نہ بنی۔

میدان جنگ میں بڑی مشکل سے کودتے ہیں، لیکن جب کودتے ہیں تو جب تک ایسے سر نہ کر لیں، باہر نہیں آتے۔ شروع میں صبر و برداشت سے کام لیتے ہیں، پھر افہام و تفہیم سے معاملہ کو درگزر کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے بعد قلم کا برچھا، اور طنز لطیف کی تلوار لے کر میدان میں تشریف لاتے ہیں اور ڈٹ جاتے ہیں، قاضی عبدالغفار کی تجدد پرستی اور مولانا شوکت علی کے خلاف ان کی زہر چکانی کو عرصہ تک برداشت کرتے رہے، لیکن جب انہوں نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو یہ میدان میں آگئے، مدت ہوئی کہ قاضی صاحب تاب مقاومت نہ لا کر میدان سے روپوش ہیں، لیکن صدق کا طبل جنگ ہے، ورنگ بج رہا ہے، اور وہ ہیں کہ الامان والحفیظ پکارے جا رہے ہیں، الفرقان کے ایڈیٹر نے مولانا کی سینما بینی پر اعتراض کیا، اعتراض اس پر زیادہ تھا کہ اس "جرم" کا خود مولانا نے اقرار کیوں کیا، یہ اعتراض رفتہ رفتہ حملہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا، پھر مولانا نے مدافعت میں وہ وہ امثال و نظائر پیش کیے ہیں، کہ آخر ایڈیٹر صاحب کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

ایک بڑی چیز ہے توازن، کم لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ ور ہوں، یا افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں، مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتی فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے، وہ بڑے کٹر حنفی ہیں لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں، وہ سیاسیات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل ہیں، لیکن نیشنلسٹوں کو اچھوت نہیں سمجھتے، وہ اپنے سنی ہونے پر ناز کرتے ہیں، لیکن شیعوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، جس کے مخالف ہیں اس کی حمایت کر سکتے ہیں، وہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں اور باطن کو بھی، وہ ان میں سے کسی ایک پر فیصلہ نہیں کر دیتے، ان کا فیصلہ ہر دو پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں، ہنستے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، روتے ہیں تو آنکھوں سے آبدار موتیوں کی بارش ہونے لگتی ہے، ہنساتے ہیں تو فضا کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں، رلاتے ہیں تو دل میں گداز و سوز پیدا کر دیتے ہیں، ان کے پاس نشاط حیات بھی ہے اور فکر آخرت بھی، وہ فکر آخرت پر نشاط حیات کو قربان نہیں کرتے اور نشاط حیات کے مقابلہ میں فکر آخرت کو فراموش

نہیں کرتے، وہ آخرت کی فکر بھی کرتے ہیں اور زندگی سے لطف بھی لیتے ہیں، وہ ورزش بھی کرتے ہیں، واکنگ بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ رات کو جاگتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں، دن کو آرام بھی کرتے ہیں اور کام بھی، جاگنے کے وقت جاگتے ہیں، سونے کے وقت سوتے ہیں، آرام کے وقت آرام کرتے ہیں اور کام کے وقت کام، غرض ان کی ہر بات میں، ہر چیز میں ایک اعتدال ہے توازن ہے۔ ایک کامل العیار انسان ہیں، اس سے زیادہ اور کیا صفات ہو سکتے ہیں؟

مولانا عرفان

سرحد کا ایک پٹھان جو عالم بھی تھا اور مجاہد بھی

مولانا محمد علی کی وفات کے بعد، جب مولانا شوکت علی لندن سے واپس آئے، تو دہلی میں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تاکہ مسلمانوں کی طرف سے ان کی خدمت میں تعزیت پیش کی جائے۔ جلسہ کے اختتام کے بعد، لیڈروں کے نکلنے والے دروازہ سے ایک صاحب برآمد ہوئے، علی گڑھ کٹ کا پاجامہ، کھدر کی سفید اچکن، سر پر استرخان کی ٹوپی۔ داڑھی کے بال سفید تھے، لیکن خضاب اس ہنرمندی سے لگایا تھا کہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سفید رنگ کی قیمتی گرگابی پاؤں کی زینت۔ آنکھیں عینک کا نقاب پہنے ہوئے دوہرا جسم، لیکن بھدا نہیں۔ سڈول اور خوبصورت۔ بلند و بالا قد۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ لیکن نگاہ اوپر تھی، ایک مرتبہ گرتے گرتے بچے، پھر سنبھلے۔ ہاتھ میں اخروٹ کے کچھ دانے تھے، بے پروائی اور بے تکلفی سے انہیں آیا ئے دہن کے حوالہ کرتے ہوئے نیچے آگئے۔ ایک صاحب نے کہا "دیکھو مولانا عرفان"، ہو نہ ہو یہ ہیں مولانا عرفان محمد علی کے چہیتے، شوکت علی کے لاڈلے! بنارس جیل کے اسٹیٹ پرزنر، شاہی قیدی!

کون اخبار بین ہوگا جو اس مجاہد پیشہ عالم سے واقف نہ ہو، بہت بڑے عالم تھے، جامع منقول و معقول، بہترین معلم تھے، فلسفہ کو اس طرح سمجھاتے کہ سہل ممتنع معلوم ہونے لگے، حافظہ کا یہ عالم کہ عربی کے ہزارہا اشعار یاد، ممالک عربیہ کا سفر کئی بار کر چکے تھے، عربی عربوں کی طرح بالکل ان کے لب و لہجہ میں بولتے تھے، انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، لیکن خود اعتمادی اتنی تھی کہ اگر کسی انگریز سے بھی سامنا ہو جائے تو "آئی"، "او" "یو" سے کام نکال کر، اس کا مافی الضمیر سمجھیں یا نہ سمجھیں، اپنا ضرور سمجھا دیا کرتے۔ سرحد کے رہنے والے تھے، مزاج لکھنؤ والوں کا پایا تھا، نشست و برخاست میں اول و آخر پٹھان تھے۔ شدھی و سنگٹھن کی تحریک کے زمانہ میں فاقے کر کر

کے چنے پھانک پھانک کے، پا پیادہ چل چل کے، گرمی کی دوپہر اور لُو کے طوفانوں میں ملکانہ راجپوتوں کو شدھی سے بچانے کی مہم بغیر کسی مزد وصلہ کی تمنا کے مہینوں غایت درجہ استقلال اور پامردی کے ساتھ نام و نمود اور شہرت سے بے نیاز ہو کر جاری رکھی، کئی برس تک دہلی کی جمعیتہ علما کے سکرٹری رہے، آنریری، کپڑا دست بنوا دیتے تھے، کھانا دفتر میں کھالیتے تھے۔

دنیا داری بشرط استواری اصل ایمان ہے

یہ ان کا اصول حیات تھا، ارباب جمیعتہ سے ان کے بڑے گہرے روابط تھے، لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا، کہ ارباب جمیعتہ یا ارباب خلافت میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں، تو وہ بے تامل ارباب جمیعتہ کی گرد سے علی برادران کے دل میں آکر بیٹھ گئے، جس نے محمد علی شوکت علی کے خلاف کچھ کہا، اس سے لڑنے مرنے کو تیار رہتے، محمد علی شوکت علی نے جو کہا اسے بے چون وچرا مان لیا، تعلقات مساویانہ تھے۔ علی برادران ان کے علم وفضل، ایثار وقربانی جرأت واستقامت کا احترام کرتے تھے، اور یہ غیر مشروط طور پر انہیں اپنا قائد ورہنما مانتے تھے، محمد علی کا جب انتقال ہو گیا، تو یہ عقیدت شوکت کی ذات میں مرکوز ہو گئی۔

میں خلافت کا ایڈیٹر ہو کر بمبئی آیا، مجھے وہ کمرہ خلافت ہاؤس میں رہنے کو ملا، جس میں مولانا عرفان رہتے تھے، میں نے اپنا سامان کمرہ میں ٹھیک ٹھاک کر لیا، لیکن ابھی تک مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا، میں اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا، کہ ملازم نے اطلاع دی کہ چلئے کھانا تیار ہے، خلافت نہ شاف خلافت کے میس میں شریک تھا، میں اترا اور کھانے کے کمرے میں پہنچا، غازی صاحب، قطب صاحب، صادق صاحب مولانا عزیز الرحمٰن سب ہی لوگ موجود تھے، آج سب لوگ بہت خوش تھے، دال کھاتے کھاتے عاجز آچکے تھے، آج گوشت پکا تھا، اگرچہ گنی بوٹی ما بنا شوربہ، کا معاملہ تھا، لیکن یہ اطمینان تو تھا کہ آج گوشت لذت کام ودہن کا سبب بنے گا، اتنے میں مولانا عرفان تشریف لے آئے، ان کے آتے ہی ایک سراسیمگی سی حاضرین پر طاری ہو گئی، کئی لوگوں نے ہاتھوں سے گوشت کی پلیٹ مضبوط پکڑ لی، مولانا بیچ میں تھے، داہنی طرف میں تھا، بائیں طرف ایک دوسرے صاحب، انہوں نے جیسے ہی مولانا کی ہم نشینی محسوس کی، بڑی تیزی سے اپنی پلیٹ لے کر اٹھے، اور بالکل کونہ کی آخری کرسی پر جا کر بیٹھ گئے، میں حیران تھا یا اللہ یہ معاملہ کیا ہے؟ مولانا اس بے پروائی سے یہ حرکتیں دیکھ رہے تھے، گویا کوئی غیر معمولی

بات نہیں ہے، اب تک مولانا سے صرف رسمی تعارف ہوا تھا، اس لیے خاموش تھا، ورنہ بار بار جی چاہتا تھا، پوچھوں، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟

میں اسی حیص و بیص میں آہستہ آہستہ لقمے اٹھا رہا تھا، کہ مولانا نے تین چار لقموں میں اپنی پلیٹ صاف کر دی، اور ملازم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "جا اور لے آ"، ملازم کو یہ فرمائش ناگوار تو گذری، اس لیے کہ اس کا اثر اس کے حصہ پر پڑنے کا اندیشہ تھا، لیکن مجبوراً تعمیل کیلئے روانہ ہوا، لئیے ادھر بیچ کہ وہ میری طرف متوجہ ہوئے، اور بغیر کسی تمہید کے ایک بڑے سے لقمے میں ایک مسلّم بوٹی رکھ کر تناول فرما گئے، میں اس اچانک حملہ سے گھبرایا ضرور، لیکن کچھ کہنے کا کیا موقع تھا؟ خاموش رہا، پلیٹ میں ۴۔۵ بوٹیاں تھیں، میرے حصہ میں کئی ٹکڑوں کی صورت میں ایک بوٹی آئی، باقی مولانا صاف کر گئے، دل کو ڈھارس تھی کہ اب مولانا کی پلیٹ آتی ہوگی تو تلافیٔ مافات کی کچھ صورت نکلے گی، لیجئے پلیٹ آگئی مولانا نے ایک روٹی کے دو ٹکڑے کیئے، دو نوالے بنائے، ایک نوالے میں آدھی پلیٹ، بقیہ دوسرے نوالہ میں، پہلا نوالہ منہ میں رکھ لیا، دوسرا ہاتھ میں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے، لیجئے صاحب ہم تو کھا چکے، دروازہ تک پہنچتے پہنچتے دوسرا نوالہ بھی منہ میں پہنچ گیا، باہر پہنچتے پہنچتے اسے بھی ختم کیا اور باہر آئے، اطمینان سے ایک ڈکار لی اور سگریٹ پینے لگے، ان کے تشریف لے جانے کے بعد، میس کے کئی رفقا تعزیت اور صبر جمیل کی تلقین کے لیے میرے پاس تشریف لائے اور بہت تفصیل کے ساتھ مولانا کی ترکتازیوں کی داستان سنا کر، میس پر شرف ہمنشینی سے کنارہ کشی کی ہدائت کی۔

مولانا کے علم و فضل، ایثار و قربانی سے میں بہت مرعوب تھا، کھانے کے بعد میں ان کے پاس آکر بیٹھ گیا، ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے، اور مولانا انہی سے گفتگو کر رہے تھے، گفتگو بہت زیادہ دوستانہ اور بے تکلفانہ رنگ میں ہو رہی تھی، مولانا موج میں تھے اور بڑی صفائی، روانی اور خوبی کے ساتھ نئی نئی اور نو ایجاد گالیاں بے دھڑک استعمال کر رہے تھے، آپ کو جو بڑی سے بڑی گالی یاد ہو وہ ان گالیوں کے آگے بالکل معمولی تھی، پہلے دن تو مولانا کی یہ اردوئے معلّٰی سن کر میں بہت حیران ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ عادی ہوگیا، اور پھر لطف آنے لگا، وہ گالیاں دشمنی اور برہمی میں نہیں دیتے تھے، محبت اور پیار کے عالم میں دیا کرتے تھے، جب وہ گالی دے رہے ہوں تو سمجھئے بہت خوش ہیں، جس وقت مہذب گفتگو کر رہے ہوں، تو سمجھ لیجیے، اس وقت متفکر اور پریشان ہیں، ان کی خوشی اور ناخوشی

کا یہی پیمانہ تھا۔

دل کے بہت صاف تھے، اور اسی مناسبت سے کان کے کچے تھے، آپ سے بہت خوش ہیں، سینما جا رہے ہیں تو آپ کو کھینچ رہے ہیں۔ کسی پارٹی میں جا رہے ہیں، تو آپ کے بغیر جانے سے انکار کر دیں گے، کوئی دلچسپی اور تفریح ہو، آپ کے بغیر وہ جنبش نہیں کریں گے، رات کو بڑی دیر تک لطف و ربط کی باتیں آپ سے کرتے رہے، آپ اطمینان سے سو گئے، صبح اٹھ کر حسب معمول آپ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ آپ کو دیکھ کر انھوں نے خیر مقدم نہیں کیا، بیزاری کے ساتھ اٹھے، اور کسی دوسری جگہ جا بیٹھ گئے۔ جا کر آپ بالکل نہیں سمجھے اس کا مطلب کیا ہے؟ آپ وہاں پہنچے اور خود ہی کوئی بات چھیڑ دی، یا تو جواب نہیں دیا، یا دیا تو نہایت مختصر اور مہذب، اور فوراً پھر مقام مجلس آرائی بدل دیا، اب آپ کے دل میں اضطراب پیدا ہوا، آپ نے پھر انہیں پکڑا، مولانا آخر بات کیا ہے؟ آپ خفا ہیں کچھ؟ منہ پھلا کر، آنکھوں سے آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا، بھلا ایک "بدمعاش" آپ سے خفا ہونے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟ آپ کو سکتہ سا ہو گیا، لیکن ذرا سنبھل کر آپ نے پوچھا "کیا مطلب؟" ٹھنڈی سانس لیکر جواب دیا، میں تو آپ کی نظر میں بدمعاش ہوں نا!، مزید گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ رات کے بارہ بجے جب مولانا سونے جا رہے تھے، تو کسی نے اطلاع دی کہ آپ تو مولانا کو "بدمعاش" سمجھتے ہیں، مولانا نے فوراً یقین کر لیا، اور آپ سے خفا ہو گئے، اب آپ نے صفائی دی، مولانا نے فوراً دل صاف کر لیا، اور پھر اسی طرح گھل مل گئے۔

گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا!

جتنی جلدی خفا ہوتے تھے، اتنی ہی جلدی من جاتے تھے، نہ خفا ہونے میں دیر لگتی تھی نہ منتے میں۔

ساری زندگی تجرد کے عالم میں گذار دی، لیکن شادی کی آرزو سے دل کبھی خالی نہ ہوا۔

وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے!

اسکیمیں بناتے تھے، اور توڑ دیتے تھے، جس شوق سے اسکیمیں بناتے تھے، اسی بے پروائی سے انہیں توڑ دیتے تھے، شادی کے لیے ان کی شرط تھی کہ ایک ہزار ماہوار کی آمدنی ہو تاکہ بیوی آرام سے رہ سکے، نہ یہ شرط پوری ہوئی، نہ انہوں نے شادی کی! جس نے اپنی ساری زندگی قوم کی "آنریری" خدمت میں گزار دی، وہ ایک ہزار ماہوار کہاں سے پیدا

کرسکتا تھا؟ سوا اس کے کہ مٹی کے گھروندے بناتے، اور توڑ دیتے، امید کے قلعے تیار کرتے اور منہدم کر دیتے۔

تہور، شجاعت، دلاوری، ہمت مردانگی، بہادری اتنے الفاظ کے مجموعہ سے جس بہادری کا تصور کیا جا سکتا ہے، وہ بدرجۂ اتم مولانا کی ذات میں موجود تھی۔ وہ کئی مرتبہ جیل ہو آئے تھے، اور پھانسی کے تختہ پر لٹکنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، یہ بھی بہادری ہے، لیکن مولانا نے جس ناقابل تصور بہادری کا ریکارڈ قائم کیا تھا، وہ ایک دوسری چیز تھی۔

بمبئی میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی، مسلمان ہندوؤں پر حملے کر رہے تھے ہندو مسلمانوں کو تاک تاک کر مار رہے تھے، بہت سے مسلمان ہندو آبادی کے علاقہ میں اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ پھنس گئے۔ مولانا عرفان نے پستول اپنی جیب میں رکھا، موٹر میں بیٹھے، اور خود اسے ڈرائیو کرتے ہوئے لال باغ پہنچ گئے، مشتعل ہندو مجمع نے پتھراؤ کیا، موٹر روک لی، پستول دکھایا، مجمع پیچھے ہٹا، اور یہ پھر آگے بڑھ گئے اور اس عمارت کے دروازہ پر پہنچ گئے جہاں کوئی مسلمان خاندان پھنسا ہوا تھا۔ یہ دندناتے ہوئے اوپر چڑھ گئے، پولیس ساتھ ہو یا نہ ہو، اس کی انھوں نے کبھی پروا نہیں کی، مصیبت زدہ خاندان کو ساتھ لیا اور موٹر میں بٹھا کر، کسی پناہ کی جگہ پہنچا دیا، بعض دفعہ ایسا ہوا کہ پولیس نے ساتھ دینے سے اور ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ یہ تن تنہا اپنی ذمہ داری پر موقعہ واردات پر پہنچے اور گرفتار بلا مسلمانوں کو نکال لائے۔

ایک مرتبہ ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا، ایک انگریز بھنڈی بازار کی طرف جا رہا تھا، اس کے کتے نے کسی مسلمان کے ساتھ شرارت کی۔ اس نے وہیں کتے کو ڈھیر کر دیا، انگریز نے پستول چلا دیا، فوراً ایک بلوہ کی سی صورت پیدا ہو گئی، پولیس کی بہت بڑی تعداد مسلح ہو کر موقع واردات پر پہنچ گئی، اس نے پولیس کمشنر کے حکم سے وارننگ دی کہ اگر مجمع منتشر نہ ہوا تو فائرنگ کر دی جائے گی، مشتعل مجمع کسی طرح منتشر ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، بلکہ بعض پُر جوش نوجوان پولیس کے حکام بلکہ پولیس کمشنر تک پر کنکر پھینک پھینک کر چیلنج دے رہے تھے، اب مولانا عرفان پہنچے، پولیس کمشنر نے ایک شخص کی شرارت اور بد تمیزی سے برہم ہو کر اس پر پستول چلانا چاہا۔ اس کا ہاتھ لبلبی تک پہنچ چکا تھا کہ ایک مضبوط سرحدی ہاتھ نے اس سے پستول چھین لیا، یہ ہاتھ مولانا عرفان کا تھا۔ بلاشبہ پولیس کمشنر سے مولانا کے مراسم تھے، لیکن لاکھ مراسم ہوں، سرکاری ڈیوٹی کی بجا آوری میں مداخلت کوئی افسر نہیں برداشت کر سکتا نہ کہ ایک انگریز چنانچہ

وہ بگڑا لیکن مولانا نے اسے سمجھایا کہ بغیر فائرنگ کے بس مجمع منتشر کیے دیتا ہوں، بندگانِ خدا کی جان لینے پر تمہیں اصرار کیوں ہے؟ پولیس کمشنر نے مولانا کو موقع دیا اور واقعی مولانا نے مجمع پر ایسا منتر پھونکا، کہ یک چشم زدن میدان صاف تھا، اب پولیس پارٹی بھی منتشر ہو گئی۔

نہ نادر بجا ماند نے نادری

یہ تھی مولانا کی دلفریب اور محبوب انام شخصیت۔

۱۶ مارچ ۱۹۲۹ء کو صبح دس بجے مولانا نے سیر ہو کر کھانا کھایا، گیارہ بجے مسلم لیگ کے آفس میں جلسہ تھا، وہاں گئے، گھنٹہ بعد پھر واپس آئے، معلوم ہوا خون کی قے ہوئی ہے، آئے اور لیٹ گئے، پھر ایک قے ہوئی، اب غسل خانہ سے بستر تک نہ پہنچ سکے پلنگ کی پائتی کے پاس گر پڑے، اٹھا کر لٹائے گئے۔ تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، ڈاکٹر مسانی آئے، اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ حرکت قلب بند ہو گئی۔

خلافت ہاؤس میں سب سے زیادہ تنومند، صحت ور، مضبوط اور توانا ہستی مولانا کی تھی، وہ بیمار بہت کم پڑتے تھے، لیکن جب وقت آگیا تو دفعتہً وہ بھی اسی طرح رخصت ہو گئے اس دنیا سے، جیسے برسوں کے بیمار رخصت ہوتے ہیں۔

ایسا حادثہ میری نظر سے کوئی نہیں گزرا تھا، ایک جھٹکا سا لگا میرے دل پر وہ دن ہے اور آج کا دن، کہ اختلاج کا مستقل مریض ہوں، اب بھی جب تصور کرتا ہوں، مولانا کی ناگہانی وفات کا تو دل ہل جاتا ہے، خدا ان کی مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

خواجہ کمال الدین

اک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

۱۹۲۴ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) صدارت کے لیے حیدر آباد سے تشریف لائے تھے، ندوہ کے طلبہ نے تحریک خلافت اور کانگریس میں نمایاں حصّہ لیا تھا، سیاسی لیڈروں کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی، جن میں مبلغ اسلام مولانا شوکت علی پیش پیش تھے۔

میں ندوہ کے درجہ اوّل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، امتحان سالانہ ختم ہو چکا تھا چھوٹے بچوں کو عام اجازت تھی کہ وہ تعطیل سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے گھر چلے جائیں لیکن اس اجلاس کی کشش ایسی غالب تھی کہ میں وطن نہیں گیا، اور اختتام اجلاس تک ندوہ ہی میں رہا۔

میں ہال کے بغلی برآمدہ میں کھڑا ہوا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا "چلو خواجہ کمال الدین صاحب تقریر کر رہے ہیں" یہ سنتے ہی میں ان کے ساتھ چل پڑا، اسٹیج پر ایک وجیہہ اور بارُعب شخص کھڑا دادِ خطابت دے رہا تھا۔ آواز اتنی گرجدار کہ ہال کے آخری کونہ تک تقریر کا ایک ایک حرف سنا جا رہا تھا، بھرا بھرا چہرہ، سیاہ داڑھی، شرعی پاجامہ، اچکن کے بجائے کوٹ زیب تن، سر پر ایک طرہ دار صافہ، تقریر کا موضوع تھا "تبلیغ اسلام"، تقریر اتنی مؤثر اور دلنشیں تھی، کہ ہر شخص محوِ حیرت بنا ہوا سن رہا تھا۔

قادیانیوں کے بارے میں عام خیال یہ تھا، کہ وہ کافر، ہوتے ہیں، خواجہ صاحب بھی اسی مسلک کے پیرو تھے، حیرت تھی کہ ایک "کافر" کے دل میں اسلام کا یہ درد، تبلیغ اسلام کا یہ ولولہ" اشاعت اسلام کا یہ جذبہ کیسے آ گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ یورپ میں خواجہ صاحب نے تبلیغ اسلام کا ایک مستقل ادارہ قائم کر رکھا ہے، وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کر چکے ہیں اور یورپ میں بہت سے لوگوں کو قبول اسلام کی سعادت سے مشرف بھی کر چکے ہیں، انگریزی میں ایک رسالہ بھی

نکالتے ہیں، اور اس کا ماہوار اردو ترجمہ "اشاعت اسلام" کے نام سے ہر ماہ لاہور سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب احمدی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ جماعت مرزا غلام احمد صاحب کو نبی نہیں مانتی، صرف مجدد مانتی ہے۔ بہرحال آگے چل کر جیسے جیسے خواجہ صاحب کی اسلامی سرگرمیوں کا علم ہوتا گیا، ان کی عزت و عظمت دل میں بڑھتی گئی۔ اور دل نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ قبول نہ کیا کہ وہ خدا نخواستہ "کافر" ہیں۔ اگرچہ اکثر لوگ انہیں "کافر" ہی سمجھتے تھے، اور ان کے اسلام کے نہایت سختی کے ساتھ منکر تھے۔

خواجہ صاحب کو پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا، لیکن ایک واقعہ ان کی زندگی کا میں نے ایسا دیکھا، جو مجھے آج تک یاد ہے، اور شاید ہمیشہ یاد رہے گا۔

خواجہ صاحب کی تقریر کے بعد اجلاس دوسرے روز کیلئے ملتوی ہو گیا۔ تمام مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے آئے، ایک کمرہ خواجہ صاحب کیلئے بھی مخصوص تھا وہ اس میں تشریف لائے۔ اجلاس کے ختم ہونے کے بعد میں گھومتا گھامتا خواجہ صاحب کے کمرہ کی طرف سے گذرا، اس وقت بالکل سناٹا تھا، گیلری میں میرے سوا کوئی دوسرا آدمی نہ تھا، میں نے دیکھا خواجہ صاحب اپنے کمرہ میں تنہا عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں، بڑے اور چھوٹے، عالم و جاہل ہر طرح کے لوگوں کو میں نے نماز پڑھتے دیکھا ہے، لیکن جس استغراق، محویت اور خضوع و خشوع سے میں نے خواجہ صاحب کو نماز پڑھتے دیکھا، اس نے میرے دل پر بڑا گہرا اثر کیا اور ایک ایسا نقش قائم کر دیا جو آج تک موجود ہے۔

نماز کی تعریف یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ محسوس نہ کر سکے تو یہ خیال تو ضرور اپنے دل میں قائم کر لے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، خواجہ صاحب کی نماز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، بغیر اس احساس کے وہ محویت، وہ استغراق، وہ خضوع و خشوع کی کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی، جس کے ایک مجسم پیکر خواجہ صاحب نظر آ رہے تھے۔

ممکن ہے کچھ لوگ اب بھی انہیں کافر سمجھتے ہوں، لیکن میرے دل پر ان کے اسلام کا ایک ایسا نقش مرتسم ہو چکا ہے۔ جسے حوادث دہر بھی نہ مٹا سکے!

مولانا معین الدین اجمیری

بوریۂ فقر پر بیٹھنے والا سلطانِ علم و فضل

جامعہ ملیہ کے محمد علی ہوسٹل اور طبیہ کالج کے بورڈنگ میں چند قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا، میں جامعہ میں پڑھتا تھا اور طبیہ کالج میں ندوہ کے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے محبوب دوست نصیر الدین صاحب اجمیری تعلیم حاصل کرتے تھے، اُن کا اکثر وقت محمد علی ہوسٹل میں بسر ہوتا تھا، وہ کہیں بھی جائیں میرا ان کے ساتھ ہونا ناگزیر تھا، اکثر ایسا ہوتا وہ شام کو آتے، اصرار کر کے اپنے ساتھ لے جاتے، میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاتا، اور صبح کا ناشتہ کر کے واپس آتا، یہ واقعہ ۱۹۳۰ کا ہے، ۱۹۳۱ میں وہ اجمیر گئے، حکم ہوا ساتھ چلو، معذرت کی، قبول ہو گئی، فرمایا لیکن آنا ضرور، اب نہ سہی کچھ عرصہ بعد، وعدہ کر لیا، چند روز بعد اجمیر سے تار آیا فوراً آؤ، تار کا جواب خط سے دیا اور پھر معذرت کی، خط کا جواب پھر تار سے آیا، اور ارشاد ہوا، کہ تار دیکھتے ہی عازم اجمیر ہو جاؤ، تار اور خط کے اس تبادلہ میں رخصت ختم ہو گئی، اور وہ دہلی واپس آگئے۔

۱۹۳۲ میں پھر عید کرنے کے لیے اجمیر جانے کی تیاریاں کرنے لگے، مجھ سے پوچھا اسٹیشن تک پہنچانے چلو گے؟ میں نے کہا ضرور، چنانچہ میں حسب وعدہ وقت مقررہ پر اسٹیشن پہنچ گیا، بڑے تپاک سے ملے۔ سیٹ پر بستر جما ہوا تھا، وہیں بڑی محبت سے بٹھا لیا، اور باتیں شروع کر دیں۔ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی، میں اٹھا، اُنہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا، اور کہا جب گاڑی چلے تب اُتر جانا، میں پھر بیٹھ گیا، اب گاڑی چلی، میں پھر اُٹھا، اُنہوں نے پھر پوری قوت سے مجھے بٹھا لیا، اسی کشمکش میں گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی، میں نے جھنجھلا کر کہا اُب کیا ہو گا؟ اُنہوں نے

نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا، "اب تم اجمیر چلو گے اور کیا ہوگا؟" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے دو ٹکٹ نکالے اور کہا ایک میرا ہے دوسرا تمہارا، پارسال تم نے مجھے دھوکا دیا۔ اس سال میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔

اجمیر پہنچنے کے بعد نصیر صاحب نے وہاں کی تمام قابل دید چیزیں دکھائیں، پھر کہنے لگے چلو تمہیں یہاں کی سب سے اہم اور قابل دید چیز دکھالاؤں، میں ساتھ ہو لیا، تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ویران مسجد کے احاطہ میں داخل ہوئے، پھر ایک سنسان قبرستان میں پہنچے، اس قبرستان میں ایک معمولی سا مکان بھی دکھائی دیا اس مکان کے باہر دروازہ کے پاس آکر کھڑے ہوئے، میں باہر کھڑا رہا، نصیر صاحب اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے ساتھ ایک مرد بزرگ برآمد ہوئے کھدر کے لباس میں ملبوس، سراپا انکسار و تواضع، یہ میرے میزبان کے حقیقی چچا اور ہندوستان کے مشہور و مایہ ناز عالم، مولانا معین الدین صاحب سابق صدر جمعیتہ علمائے ہند تھے۔

مولینا کو اس حالت اور اس رنگ میں دیکھ کر میں بہت حیران ہوا، مولینا کی جلالت علم پایۂ کمال اور تبحر فن کی ایک دنیا قائل تھی، ان کے ایثار، قربانی خدمتِ قومی دہلی کے کارناموں سے بھی ایک دنیا واقف تھی، ہندوستان کے جلیل القدر رہنما اور لیڈر ان کے آگے سر جھکانا باعثِ عزت سمجھتے تھے، مولانا محمد علی جیسا منچلا اور کسی سے نہ دبنے والا لیڈر فروتنی اور عجز کے ساتھ، ان کے خلوص، صداقت اور فضل و کمال کا معترف تھا، اتنا بڑا شخص، اور اس حالت میں، با تحقیق جو کی تو معلوم ہوا، مولانا کی خودداری دستِ طلب سے بے نیاز ہے، مدرسہ میں درس دیتے ہیں، وہاں سے ایک حقیر تنخواہ قبول فرماتے ہیں، اور اسی میں صبر و شکر کر کے گزارہ کرتے ہیں، اور پھر بھی حالت یہ ہے کہ:

رند قانع متوکل ہے خدا دیتا ہے
جب وہ پاتا ہے تو پیتا ہے پلا دیتا ہے

اس قلیل تنخواہ میں بھی دعوتیں بڑی سیر چشمی اور اولوالعزمی سے کرتے ہیں، محتاجوں اور ضرورتمندوں کی مدد سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ خود فاقہ کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی کو مایوس واپس نہیں ہونے دیتے۔

مولینا نصیر صاحب کو بے حد چاہتے تھے' اور یہ معلوم کر کے کہ میں ان کا عزیز دوست ہوں، مجھ پر بھی کرم بے حساب فرمانے لگے تھے، دوسرے روز بڑی پُر تکلف دعوت کی، اور دعوت کے بعد اپنی نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ دکھایا میں جب تک اجمیر میں رہا، تقریباً روزانہ مولینا کے دولتکدہ پر حاضری دیتا رہا، اور اس چند روزہ قیام میں میں نے دیکھا کہ مولانا بہت بڑے عالم ہیں، لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے انسان ہیں، ایسے انسان قدرت روز روز نہیں پیدا کرتی۔

مولانا محمد السورتی

عربی زبان کا یگانۂ روزگار محقق

مولینا محمد السورتی صاحب مرحوم و مغفور کی شبیہہ مبارک اس وقت آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، پستہ قد، ضرورت سے بہت زیادہ موٹے، بڑی بڑی آنکھیں، سینہ حدیث نبوی کا گنجینہ، دماغ، لسان نبوی کا مرکز "بسطۃً فی العلم والجسم" کے صحیح مصداق جس طرح فارس کے لوگ ہندوستان کے بہترین فارسی شعراکی زبان "غیر مستند" سمجھتے ہیں، یہی حال اہل عرب کا ہے، عربوں کو اپنی زباندانی، فصاحت و بلاغت، قوت بیان، زور زبان پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے سوا ساری دُنیا کو عجم "(گونگا)" کہتے تھے، چنانچہ عربوں نے کبھی ہندوستان کے عجمیوں کی عربیت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، لیکن چند مستثنیات ہیں، ایک نمایاں اور ممتاز ہستی، مولینا محمد سورتی کی بھی تھی جنہیں عرب اہل زبان، فن نعت و امثال کا امام تسلیم کرتے تھے، میں نے خود مولینا محمد خلیل عرب صاحب ندوی کی زبان سے سُنا ہے کہ "وہ یکتا شخص تھا ہندوستان نے پیدا کیا"، مولینا خلیل عرب صاحب یہی نہیں کہ عرب ہیں، بلکہ عربی زبان کے مشہور ادیب بھی ہیں۔

مولانا سورتی نے تحصیل علم ہندوستان ہی کی، یہیں ان کی بود و باش رہی، لیکن یہاں رہ کر، اپنے مطالعہ، عرق ریزی، کاوش اور محنت سے اُنھوں نے عربی زبان میں وہ دستگاہ حاصل کر لی جو بہت سے عربوں کیلئے قابل رشک تھی۔

تحریک خلافت کے پر آشوب زمانہ میں جب مولانا محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنا ڈالی، تو مولانا سورتی بھی تشریف لے آئے اور شعبہ عربی کی "چیئر" ان کے حوالہ کر دی گئی، کئی برس تک وہ جامعہ سے وابستہ رہے، جامعہ کے ارباب کار انہیں اپنا بزرگ سمجھتے تھے، اور وہ بھی ان پر شفقت کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے، جامعہ میں رہ کر اُنھوں نے

بڑی کڑیاں جھیلیں، فاقے کئے، دکھ اٹھائے، مصیبتیں سہیں، لیکن اپنی استقامت کے دامن پر دھبہ نہ پڑنے دیا بعد میں کسی بات پر خفا ہو کر ۸ ـــ ۹ برس کا تعلق دفعتہً منقطع کردیا۔ لوگوں نے لاکھ لاکھ التجائیں کیں، منتیں کیں، لیکن ان کی نہیں کو ہاں سے کوئی نہ بدل سکا۔

بڑے منچلے آدمی تھے، قلندرانہ خصائل کے مالک، طبیعت بڑی مستغنی اور خوددار پائی تھی، کثیر العیال تھے، کثیر المصارف تھے، حوصلہ بلند، مزاج شاہانہ، مستقبل تاریک، حال یاس انگیز، جیب خالی، لیکن ہونٹوں پر قلندرانہ تبسم،

موقع ہوا تو فاقہ بھی کرلیا، اور کسی محنت کا صلہ مل گیا، تو گل چھرے اڑ رہے ہیں، دعوتیں دی جا رہی ہیں، کئی کئی قسم کے کھانے پک رہے ہیں، کھائے جا رہے ہیں، اور کھلائے جا رہے ہیں۔

میں ۱۹۳۰؁ میں داخل ہوا، اس وقت مولانا جامعہ سے الگ ہو چکے تھے، لیکن رہتے دلّی میں تھے، کہیں اور بھی نہیں قرول باغ ہی میں، جامعہ میں برابر آتے جاتے رہتے تھے، مذہب اہلحدیث کے پیرو تھے، اور اپنے مسلک میں بڑے متشدد جب وہ آجاتے تو بڑے بڑوں کے انگریزی بال خطرہ میں پڑ جاتے تھے، اور نماز جماعت میں وہ لوگ بھی نظر آتے تھے، جو

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

کے قائل تھے، ان کی شخصیت ہی ایسی تھی وہ یکسر جلال و جمال تھے، لیکن ان کا جلال بھی دل غریب تھا، اور جمال کا تو کہنا کیا!

وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے!

جامعہ کے مشہور استاد اور ملک کے مشہور مصنف مولانا اسلم جیراج پوری حدیث کو حجت نہیں مانتے، وہ سارا زور صرف قرآن کی حجت پر دیتے ہیں۔ اپنے مسلک کی تائید میں انہوں نے کئی مقالات رسالہ جامعہ میں لکھے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ارشاد پر میں نے ان مضامین کا جواب دیا "انکار حدیث" کے عنوان سے لکھا، شفیق صاحب اور شیخ الجامعہ صاحب مدظلہ، ڈاکٹر ذاکر حسین) کی رائے ہوئی کہ پہلے میرا مقالہ اہل علم کے مجمع میں پڑھا جائے، وہاں سے اگر منظور ہو جائے تو جامعہ میں شائع ہو، ایک مشہور فاضل کے مقابلہ

میں ایک کمترین طالب علم کا ایک اہم ترین موضوع پر جوابی مقالہ شائع کرتے ہوئے وہ
ہچکچاتے تھے، چنانچہ ایک روز نماز عصر کے بعد اہل علم کی مجلس بیٹھی جس میں خود
مولانا اسلم صاحب اور جامعہ کے دوسرے اساتذہ کرام تشریف فرما تھے مولانا
سورتی صاحب بھی خاص طور پر بلائے گئے تھے، وہ اپنی مخصوص شان سے بے تکلفی
اور بیباکی کے ساتھ تشریف لائے، اور خواجہ عبدالحی صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

میں نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا، سب سے زیادہ
مرعوب اور دہشت زدہ، میں مولانا سورتی ہی سے تھا، امتحان بڑا سخت تھا، لیکن
اس سے بہرحال گزرنا تھا، مقالہ خاصا طویل تھا، میں نے اسے پڑھا اور سب سے
زیادہ اس کی داد مولانا سورتی ہی نے دی، بڑی تسکین ہوئی، مولانا اسلم صاحب نے
بھی ازراہ شفقت بزرگانہ اسے سراہا، اور جامعہ میں شائع کرنے پر اصرار کیا، چنانچہ
وہ جامعہ کے دوسرے پرچہ میں شائع ہو گیا۔

اس مجلس میں جھجک نکل گئی تو حوصلہ پیدا ہوا، ایک روز میری اور عبدالسلام
صاحب قدوائی کی سازش ہوئی اور طے پایا کہ مولانا سے قاعدہ ادب عربی کا درس
لیا جائے، دوسرے روز ہم لوگ، مولانا کے در دولت پر پہنچے، بڑے اخلاق اور
تپاک سے پیش آئے، ہماری درخواست سنی، اور اسے منظور بھی فرما لیا، تین بجے سہ پہر
کا وقت مقرر فرمایا، اور ہم پابندی کے ساتھ جانے لگے۔

مولانا وقت کے بھی بڑے پابند تھے، اور اصول کے بھی، اور ہم دونوں ان ہر
دو نعمتوں سے محروم تھے، شروع شروع میں تو بڑے ذوق و شوق سے وقت پر
جاتے بھی رہے، اور ان کا دیا ہوا کام بھی کرتے تھے، پھر کبھی کبھی ناغہ کرنے لگے،
کبھی دیر سے پہنچنے لگے، اور دیا ہوا کام اکثر لکھنے کی بجائے "منہ زبانی" کرنے لگے،
مولانا کچھ روز تک تو چڑھی ہوئی تیوریوں کے ساتھ یہ حرکتیں گوارا کرلیں، اور آخر ایک
روز ہم دونوں گنہگاروں کو اس طرح دھتکارا جیسے کتے کو دھتکارا جاتا ہے، ہم نے
سوچا کسی طرح فرار ہو، پر فرار کیسے کیا جائے۔

کیونکہ تیور کہہ رہے تھے اگر فوراً رخصت نہ ہوئے، تو مولانا قول کی منزل سے
گزر کر عمل کی منزل سر کرنے کو بھی تیار ہیں، جاتے جاتے مولانا کی آواز میرے کان میں

پڑی "ادب الجاحظ" بھیجدے۔ میں یہ کتاب مولانا سے بغرض مطالعہ کل ہی لایا تھا، اس حکم کے بعد اس کا رکھنا ناممکن تھا، یقین تھا، شام تک انتظار کریں گے، صبح کسی کو بھیجکر منگالیں گے، مجھے یہ کتاب بہت پسند آئی تھی، محمد علی ہوسٹل پہنچکر میں نے عبدالسلام سے کہا، میں تو اس کا ترجمہ کرتا ہوں بیٹھ کر، وہ مسکرائے اور کھیل سے دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود فیلڈ چلے گئے، میں ترجمہ کرنے بیٹھ گیا، دن کا باقی حصہ اور ساری رات اور دوسرے روز ۹ بجے صبح تک میں پوری مستعدی سے تلخیص و ترجمہ میں لگا رہا، ترجمہ کرکے اٹھا تھا، کہ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے پہنچے "کتاب دیجئے"؟ میں نے شکریہ کے ساتھ کتاب واپس کردی، یہ طویل مقالہ بھی جامعہ میں شائع ہو چکا ہے، پھر کبھی مولانا سے ملاقات کی ہمت نہ پڑی، یہاں تک کہ مولینا کا انتقال ہو گیا:

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مولانا مسعود علی ندوی

دل جوش میں لا فریاد نہ کر، تاثیر دکھا تقریر نہ کر

ہندوستان کے طبقۂ علماء میں مولینا مسعود علی ندوی اپنی تعمیری قوتوں کے اعتبار سے ”وحدہٗ لاشریک لہٗ“ مانے جائیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا، بدقسمتی سے طبقۂ علماء کی سرگرمیاں یا تو درس و تدریس تک محدود ہیں، یا قال اقول تک، یا بہت زیادہ آگے بڑھے تو بقول اقبال کے

کار ”کافر“ فکر تدبیر و جہاد
کار ”ملا“ فی سبیل اللہ فساد!

لیکن مولینا مسعود علی ایسے عالم ہیں جنہوں نے ندوہ سے سند فروغ حاصل کرنے کے بعد نہ مسندِ درس کو زینت دی، نہ میدان رزم و قتال کو، نہ بزمِ بحث و مناظرہ کو، نہ گوشۂ تحریر و تصنیف کو، وہ ایک معمار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور بہت جلد اپنے لازوال تعمیری کارناموں کی بنا پر اُنھوں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا کہ وہ رشک کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔

وہ ندوہ سے فارغ ہوئے تو اُنھوں نے ”انجمن طلبائے قدیم“ کی بنیاد ڈالی اور اس انجمن نے، ندوہ کی اس مشہور اسٹرائک کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی حصہ لیا، جس کے سرپرستوں اور داعیوں میں علامہ شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور نواب علی حسن خاں وغیرہ تھے، اس اسٹرائک نے مولینا مسعود علی کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

پھر علامہ شبلی کے انتقال کے بعد علامہ کے جانشین کی حیثیت سے مولینا سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ تشریف لائے اور ایک اُجڑے ہوئے باغ کو بغیر کسی سرمایہ اور قومی چندہ

کے، شبلی اکاڈمی اور دار المصنفین کا نام دیکر بیٹھ گئے۔

طبل بلند بانگ در باطن ہیچ

کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل تھی۔

سید صاحب اپنے علم کے اعتبار سے یگانہ روزگار، اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے یکتائے زمانہ، اپنی تصنیفی و تالیفی قابلیت کی حیثیت سے نازش ارباب نظر لیکن یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ اس اجڑے ہوئے باغ کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیں اس خرابہ کو جو انہیں علمی وراثت میں ملا تھا، دار العلوم و الفنون بنا دیں، اس ویرانہ میں شاندار اور دلفریب عمارتیں کھڑی کر دیں، اور یہ سب کچھ ارباب دول کی سرپرستی اور چندہ عام کی اعانت کے بغیر کر لیں، لیکن جب انہوں نے اپنی سب سے بڑی مراد پوری کر لی یعنی مولینا مسعود علی ندوی کا برادرانہ تعاون اور مخلصانہ اشتراک حاصل کر لیا، تو واقعی اس شخص نے گویا الف لیلہ کا علاء الدین کا چراغ لے کر ہتھیلی میں رگڑا، اور پلک جھپکاتے یہ ویرانہ آباد ہو گیا، اس خرابہ میں باد مراد، نسیم بہار بن کر اٹھکھیلیاں کرنے لگی، یہ اجڑا ہوا باغ، ملک کا سب سے بڑا شاندار، باوقار اور مستند تصنیفی ادارہ بن گیا۔

اپنے حسن انتظام سے مولینا مسعود علی ندوی نے، پہلے پریس کو ترقی دی، پھر تجارتی حیثیت سے دار المصنفین کے گراں مایہ مطبوعات کو عام کیا، خود فاقے کیے اور سید صاحب کو بھی کرائے، آمدنی کے باوجود امکان و استطاعت کے باوجود نہ اپنی تنخواہ دہائیوں سے آگے بڑھنے دی، نہ سید صاحب کی، اور ساری آمدنی سارا نفع، ساری توفیر، دار المصنفین کی تعمیر میں صرف کرنے لگے اور آج یہ عالم ہے کہ دار المصنفین میں رفقاء کے لیے آرام دہ، اور خوبصورت کوارٹر تعمیر ہو چکے ہیں، ناظم اور منیجر کے لیے دلکش اور پرفضا مکانات تیار ہو چکے ہیں، کتب خانہ کی وسیع اور کشادہ عمارت عالم خیال سے عالم وجود میں آ چکی ہے، خدا کو یاد کرنے اور سجدے کرنے کے لیے قلب مومن کی طرح صاف، شفاف اور خوبصورت مسجد بن چکی ہے، اور دار المصنفین کا بجٹ اپنی کمائی، اور حسن انتظام کی بدولت سے علمی اداروں کے لیے باعث رشک و حیرت بنا ہوا ہے

تحریک خلافت کے عالم آشوب زمانہ میں مولینا مسعود علی کچھ عرصہ کے لیے پبلک پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور آتے ہی ابر باراں کی طرح چھا گئے، اعظم گڑھ جیسی چھوٹی

سی غریب بستی سے پچاس ہزار سے زیادہ روپیہ، خلافت اور انگورہ فنڈ کیلیے فراہم کر کے "بڑے میا" (مولینا شوکت علی مغفور) کی طویل و عریض جھولی میں ڈال دیا، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے محبوب بن گئے، بعد میں ان کے دل پر کچوکے بھی لگائے، لیکن ان کی نگاہ مہر نہ بدلی، وہ خود عملی آدمی تھے اور عملی آدمی کی قدر کرنا بھی خوب جانتے تھے، وہ اسے کبھی نہ بھول سکے، کہ یہ وہ لاڈلا سپوت ہے، جس نے ایک کورِ دہ مقام سے خلافت کو وہ مدد دی، جو بڑے سے بڑے شہروں کے بڑے بڑے لیڈر بھی نہ دے سکے۔

۱۹۲۳ء کی اسٹرائک میں عبدالسلام قدوائی کا اور میرا اخراج ہوا، ہم لوگ دلی پہنچے، اور جامعہ میں داخل ہو گئے، اور یہاں داخل ہو کر، ندوہ کے ارباب انتظام پر گولہ باری کی اسکیمیں تیار کرنے لگے، سب سے کامیاب حربہ انجمن طلبائے قدیم کا احیا تھا، چنانچہ ہم نے دہلی میں بیٹھ کر انجمن طلبائے قدیم کے جسد بے روح میں حیات تازہ کا انجکشن دیا، اور وہ ایک انگڑائی لیکر شیر غراں کی طرح دھاڑتی ہوئی اور گرجتی ہوئی اٹھ بیٹھی، اور اس کے اُٹھنے کے ساتھ ہی، ندوہ کے مضبوط در و دیوار لرزنے لگے، ارباب انتظام میں سرگوشیاں ہونے لگیں، اور طلبائے جدید میں چہل پہل شروع ہو گئی، زہر کو زہر سے کاٹنے کے لیے ارباب انتظام میں سے بھی چند لوگوں کو ہم نے مستانہ جگہ دی پہلے سالانہ جلسہ کا صدر مولینا سید سلیمان ندوی کو اور صدر استقبالیہ ڈاکٹر عبدالعلی کو بنایا دوسرے ہنگامہ خیز سالانہ جلسہ کا صدر، مولینا مسعود علی ندوی کو: اور صدر مجلس استقبالیہ مولینا عبدالماجد دریابادی کو بنایا، مولینا مسعود علی نے، صدارت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور یہ اڑ گیا کہ صدر آپ ہی بنیں گے، میں چھوٹا تھا، بہت چھوٹا، وہ بڑے تھے، بہت بڑے، لیکن جنگ چھڑ گئی، زبانی بھی، اور بذریعہ خط و کتابت بھی، ساتھ ہی ساتھ بزرگانہ اور خوردانہ طنزیات لطیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، آخر مولینا مسعود علی صدارت پر راضی ہو گئے، انجمن طلبائے قدیم ۱۹۳۳ء کا یہ سالانہ جلسہ جتنا شاندار اور کامیاب رہا، ندوہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ مولینا ہی کی صدارت کا اثر تھا کہ ہم سرکشوں اور باغیوں میں، اور ندوہ کے ارباب انتظام میں سچائی کے ساتھ صفائی ہو گئی، اور یہ دونوں گروہ پورے خلوص اور شرافت کے ساتھ اشتراک و تعاون پر آمادہ ہو گئے۔

۱۹۳۴ء میں ندوہ کے ارباب انتظام کو یہ احساس ہوا کہ ندوہ کے دارالعلوم اور

بورڈنگ ہاؤس کے مابین ایک شایان شان مسجد تعمیر ہونی چاہیئے، بڑا مبارک خیال تھا، لیکن اسے عمل میں لانا سب سے زیادہ مشکل تھا، سرمایہ کہاں سے آئے! اور اگر آجائے تو کفایت سے کیسے صرف ہو؟ تعمیرات کی نگرانی کون کرے؟ نقشہ کون بنائے؟ مزدوروں سے کام کون لے؟ یہ کام اگر کسی ٹھیکہ دار کے سپرد کیا جاتا ہے تو خرچ بہت ہوگا، اور کام ناقص ہوگا، آخر لوگوں کی نگاہِ انتخاب مولینا مسعود علی پر پڑی، انہوں نے دارالمصنفین سے کئی مہینہ کی رخصت لی، ایک بے آب و گیاہ میدان میں خیمہ ڈالا، اور انجینئر، نقشہ نویس، معمار، مزدور، مستری کے فرائض بیک وقت انجام دینا شروع کر دیئے، ایک شاندار مسجد کی طرح پڑ گئی۔

ندوہ والوں نے جو روپیہ جمع کیا تھا، وہ بہت کم تھا، اس لیے بہت جلد ختم ہو گیا، آسان اور روایتی اور موروثی صورت تو یہی تھی کہ تعمیر کا کام نامکمل حالت میں چھوڑ دیا جائے جس طرح دارالعلوم کی عمارت ابتک نامکمل پڑی ہوئی ہے، لیکن یہ کام مولینا مسعود علی نے شروع کیا تھا، اور وہ نامکمل طور پر کام کرنا جانتے ہی نہیں، یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے اپنے احباب کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا، طلبہ کو سفارت کے کام پر بھیجا، اخبارات میں اپیل کی، اور چھنا چھن روپیہ آنا شروع ہو گیا، اور چند ہی روز میں ایک شاندار، دلآویز اور حسین و جمیل مسجد، مولینا کی مساعی جمیلہ کی بدولت بن کر قائم ہو گئی، جس میں تسبیح و تہلیل کا غلغلہ بلند ہونے لگا، میں نے اس مسجد کا نام "جامع مسعود" تجویز کیا تھا، لیکن مولانا نے مجھے جھڑک دیا، حالانکہ مثال میں، میں نے بیت المقدس کی "مسجد عمر" اور مصر کی جامع عمرو بن العاص وغیرہ کے نام بھی پیش کیے، لیکن مولانا کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے سپر ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، نہ کہ میں!

مولینا مسعود علی ندوی کی اپیل کے جواب میں، میں نے خلافت میں ایک شذرہ لکھا اور تائید کرنے کی بجائے مخالفت کی، مجھے ندوہ کے ارباب انتظام کے تساہل و تغافل پر غصہ آرہا تھا، مولینا کا فوراً ایک عتاب نامہ آیا کہ اگر اب تم نے کچھ لکھا تو میں سارا کام چھوڑ چھاڑ کر جاتا ہوں، مخالفت کا یہ موقع نہیں ہے۔ ساتھ ہی (مولینا) عمران خاں کا خط آیا کہ مولینا بہت خفا ہیں اور جب تک تم تلافی نہ کروگے خوش نہیں ہونگے، آخر میں نے ایک پورا مقالہ افتتاحیہ لکھ کر تلافی کی، اور مولینا خوش ہو گئے، اور ان کی مسکراتی آنکھیں میری نگاہ تصور میں

بھرنے لگیں۔

۱۹۴۴ء میں پھر ندوہ میں ایک سخت اسٹرائک ہوئی، مجھے اطلاع ملی کہ طلبہ پر بڑا ظلم ہوا ہے، اور یہ ظلم مولینا مسعود علی کی سرپرستی میں ہوا ہے، حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی ہوا، میں نے روزنامہ انقلاب میں چند مقالات اس صورت حالات کے خلاف لکھے، ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہونے والا تھا، میں نے چند ارکان انتظامی کو، جن میں مولینا سید سلیمان اور مولینا اکرام اللہ خاں ندوی بھی تھے، خصوط لکھے اور اُن کو اُبھارا کہ وہ مظلوموں کی حمایت کریں، اگرچہ انہیں دوستی کا رشتہ (اشارہ مولینا مسعود علی کی طرف تھا) قطع کرنا پڑے، سید صاحب کا گرامی نامہ آیا، کہ تمہیں غلط فہمی ہے، مولینا مسعود علی ایک عرصہ سے انتظامی معاملات سے الگ تھلگ ہیں، خود مولینا مسعود علی کا بھی مکتوب شرف صدور لایا، جس میں مولانا نے فرمایا تھا، میں نے اس اسٹرائک میں نفیاً یا اثباتاً کوئی حصہ نہیں لیا، نہ ندوہ گیا، تم میرے خلاف مورچہ قائم کرکے میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہو، اب مجھے صحیح معلومات مل چکے، اور مولینا کے بیان کی تصدیق ہو چکی تھی، خدانخواستہ مولینا سے مجھے دشمنی نہ تھی، دل سے گرد غبار صاف ہو گئی، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، مولینا کا دل بھی آئینہ کی طرح صاف ہو گیا، اگرچہ وہ ناصاف کبھی بھی نہ تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی

شریعت اور طریقت کا سنگم

۱۹۳۲ء کے موسم سرما میں، مولینا عبدالماجد دریابادی دہلی کے اسٹیشن سے گزرے، اسٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا، مولینا نے ارشاد فرمایا، میں تھانہ بھون جارہا ہوں، دس پندرہ روز قیام کا ارادہ ہے، کہو تم کب آتے ہو؟ مولینا عرصہ سے یہ فرمائش کر رہے تھے، میں ٹال رہا تھا، اس دفعہ بھی خاموش ہو گیا، "فلسفہ جذبات" کے مصنف نے کچھ سوچا، پھر فرمایا، تم جامعہ کے طالب علم ہو، یہاں کے مصارف ندوہ سے زیادہ ہیں، لیکن تم ہچکچاتے کیوں ہو؟ دعوت تو میں دے رہا ہوں مصارف آمد و رفت میرے ذمہ۔

چند روز بعد میں بھون روانہ ہو گیا، اسٹیشن پر مولینا عبدالماجد بہ نفس نفیس موجود تھے، ذرہ کا استقبال آفتاب عالم تاب کر رہا تھا، مولینا نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، ہم لوگ وہاں پہنچے، چائے پی، اور خانقاہ اشرفیہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مولینا عبدالماجد کے بزرگانہ اصرار سے میں چلا تو آیا تھا مگر دل خوش نہ تھا مولانا اشرف علی کی اتنی برائیاں سن چکا تھا کہ انہیں پیکر صدق و صفا ماننے پر دل آمادہ نہیں ہوتا تھا، میں نے بہت سے نام نہاد عالم دیکھے تھے، میں نے کئی صوفیان با صفا کا نظارہ کیا تھا، اس مشاہدہ اور نظارہ نے بڑی حد تک عالموں اور صوفیوں سے بد گمان کر دیا تھا، قدم خانقاہ اشرفیہ کی طرف اٹھ رہے تھے، دل نہ جانے کہاں تھا، چند لمحوں میں مسافت طے ہو گئی، اور ہم خانقاہ اشرفیہ میں پہنچ گئے۔

ایک مختصر سا دالان، چند لوگوں کے بیچ میں ایک سراپا نور، قدرت کاملہ کا ظہور آنکھوں کے سامنے متمکن نظر آیا، نہ مشیخت، نہ تکبر، نہ پندار، نہ نخوت، سراپا عجز، خاکساری، فروتنی! عجز نمائش سے خالی، خاکساری تصنع سے مبرا، فروتنی کبر کی آمیزش سے پاک! میں گیا مصافحہ

کیا، اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا، یہ دربار شاہانہ نہیں تھا کہ مجال دم زدن نہ ہوتی، یہ پیشہ در صوفی کا حجرہ نہیں تھا کہ حال وقال کی مجلس گرم ہوتی، یہ اس بوریہ نشین کی خانقاہ تھی، جو واقعی پیکر صدق وصفا تھا، سرچشمہ ہدیٰ تھا، نگاہ سے نگاہ ملتے ہی دل کھینچا، ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہی، دل جس سے بغاوت کر رہا تھا، اس کی عقیدت سے لبریز ہوگیا، ابھی تک کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، لیکن دل پر اس سادگی کا جلال اثر کر رہا تھا۔

حکیم الامت وقت کے بڑے پابند تھے، یہ وقت ان کے ملنے کا نہیں تھا، مولانا عبدالماجد نے موصوف کو میری حاضری سے ایک روز قبل "حدیث اور وضع حدیث" "انکار حدیث" وغیرہ میرے وہ مقالات دکھا دئیے تھے، جو ابھی حال میں رسالہ جامعہ میں شائع ہوئے تھے، حکیم الامت انہیں ملاحظہ فرما کر مسرور ہوئے تھے، اور اس ناوقت ملاقات کی عزت سے اسی لیے سرفراز فرمایا گیا کہ یہ اختصاص سند خوشنودی کا کام دے۔

ہم لوگ ظہر کے بعد پہنچے تھے، عصر تک نشست رہی، اس دوران میں عجیب عجیب مناظر آنکھوں نے دیکھے، کوئی آیت قرآنی زیر بحث تھی، اور حکیم الامت کی زبان حق ترجمان، حقائق و معارف کے دریا بہا رہی تھی۔

عصر کا وقت تھا، مجلس برخاست ہوئی، حکیم الامت نے مولانا سے پوچھا "یہ ٹھہرے کہاں ہیں؟" مولانا نے فرمایا، میرے ہاں، ارشاد ہوا، نہیں یہ ہمارے مہمان ہیں، خانقاہ کے بالاخانہ پر ایک کمرہ مرحمت ہوا، دل ابھی کچھ دیر پہلے تک خانقاہ اشرفیہ کے تصور سے مکدر ہوتا تھا، اب خانقاہ کا مکین بننے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھ رہا تھا۔

آپ کی نظر سے بہت سے صوفی اور رہبر گزرے ہوں گے، اور ان میں زیادہ تر ایسے نفوس قدسیہ دکھائی دئیے ہوں گے جو فقیری میں شاہی کے مزے کرتے ہیں، جن کا بوریۂ فقر مسند سلطانی سے کم نہیں ہوتا، جن کے متقربین، مصاحبوں کے فرائض پورے "آرٹ" کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جو چلتے ہیں، تو جاں نثاروں کے جلو میں، بیٹھتے ہیں تو عقیدت کیشوں کے مجمع میں، جن کے جوتے لوگ سروں پر اٹھاتے ہیں، جن کا پس خوردہ، لوگ، من وسلویٰ سے بہتر سمجھتے ہیں، جن کے پاؤں دبانا مریدوں کی خواتین نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر پیش کرنا ہر مرید اپنا فرض سمجھتا ہے، جو ارباب ثروت کے سامنے ہمہ تن نیاز، اور کنگالوں اور مفلسوں کے سامنے ہمہ جلال و کبریائی نظر آتے ہیں، مریدوں

کی بے راہ روی کو نظر انداز کرتے ہیں۔

لیکن خانقاہ اشرفیہ کا حال ہی کچھ اور تھا، یہاں اگر ایک طرف بڑے بڑے زمیندار اور گریجویٹ، پی سی ایس اور آئی سی ایس، پروفیسر اور ماہر علوم نمازیوں کے جوتے سیدھے کرتے، اور نمازیوں کیلئے پانی بھرتے نظر آئیں گے، تو دوسری طرف، یہاں کنگال اور مفلس نوازے جائیں گے، ان کی عزت افزائی کی جائے گی، ان کا دل ہاتھ میں لیا جائے گا، ان سے مساوات کا سلوک کیا جائے گا، احتیاط اور تقویٰ کا یہ عالم کہ کسی مرید کو اجازت نہیں کہ وہ مرشد کا جوتا سیدھا کر دے، اس کے وضو کے لیے پانی لاکر رکھ دے، خاص طور پر اس کے پیچھے پیچھے چلے، کالج کا پروفیسر ہو یا عدالت کا حاکم، علاقہ کا مالک ہو یا دولت مند اور سرمایہ دار، کوئی بھی خانقاہ کے اصول کو توڑ نہیں سکتا، جو وابستہ ہو گیا، وہ "رسم و رہ خانقہی" پر عمل پیرا ضرور ہو گا۔

میں نے بڑے بڑے صوفیوں کو دیکھا ہے کہ ان کے مرید، اپنے مرشد کی سرپرستی میں خلاف شرع رسوم پر عمل کرتے ہیں، انہوں نے ایک چیز کا نام رکھ لیا ہے "طریقت" اور اس اصلاح کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ ہر وہ چیز جس کا صدور ان سے ہوتا ہو، لیکن جس کی تائید شرع سے نہ ہوتی ہو، وہ طریقت ہے! لیکن خانقاہ اشرفیہ میں طریقت وہی تھی، جو شریعت تھی، یہاں شریعت اور طریقت کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں تھا،

وہ پیر بھی میں نے دیکھے ہیں، جو اپنے حلقہ کی توسیع کیلئے مساعی رہتے ہیں، جو اس کے منتظر رہتے ہیں، لوگ ان کے مرید ہوں، لیکن خانقاہ اشرفیہ میں میں نے یہ دیکھا کہ ایک شخص آسام سے جذبۂ عقیدت میں چور، ولولۂ عشق سے معمور، تھانہ بھون پہنچا، اس شدِ رحال سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حکیم الامت کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لے، سرکاری ملازم تھا، چند روز کی چھٹی بدقت ملی تھی، اس لیے واپس بھی جلد جانا چاہتا تھا، حکیم الامت نے اسے مرید کرنے سے انکار کر دیا، فرمایا، میں نے تمہارے متعلق رائے نہیں قائم کی، تم نے مجھے نہیں سمجھا، پھر بیعت کیونکر ہو سکتی ہے؟ بیعت کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کچھ عرصہ تک قیام کرو، میں تمہیں جان لوں، تم مجھے پرکھ لو، پھر اگر دونوں کی رائے ہو، کہ بیعت ہونی چاہیئے تو ہو گی، ورنہ نہیں، اس نے بہت اصرار کیا، لیکن حکیم الامت کا انکار قائم رہا۔

میں بالاخانہ کے کمرہ میں مغرب کے بعد چلا گیا، چارپائی پر بستر بچھا ہوا موجود تھا کوئی

عربی کی کتاب بھی تھی، اس کا مطالعہ کرنے لگا، اتنے میں میرے کان میں کھنکھار کی آواز آئی، معلوم ہوا مولینا عبدالماجد تشریف لاتے ہیں، میں سنبھل کر بیٹھ گیا مولینا تشریف لائے، کچھ دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے، پھر میں نے عرض کیا آپ اس قدر رُکتے ہوئے، اور اپنی تشریف آوری کا الارم دیتے ہوئے کیوں تشریف لائے؟ فرمایا، مولینا کی ایک ہدایت یہ بھی ہے، کہ جب کسی کے کمرہ میں گھر میں جاؤ تو داخل ہونے سے پہلے یا اجازت طلب کرو، اور یا کم ازکم اسے کسی طرح اپنے آنے سے خبردار کرو، نہ معلوم وہ کس حالت میں ہو، نہ معلوم وہ کیا کر رہا ہو؟ نہ معلوم وہ ملنا چاہتا ہو، نہ معلوم، وہ کوئی ایسا کام کر رہا ہو، جیسے تمہارے سامنے وہ نہ کرنا چاہتا ہو!

حکیم الامت اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں کے تحائف اور نذرانے بہت کم قبول کرتے تھے اور قبول فرماتے تھے، تو خاص شرائط کے ساتھ، میں نے دیکھا کہیں سے کوئی چیز آئی، حکیم الامت نے اس کے دو حصے کئے اور اپنے کسی خادم کے حوالہ کر دیئے، بعد میں میں نے مولینا عبدالماجد سے اس کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا، حکیم الامت کی دو بیویاں ہیں اور حکم قرآنی کی تعمیل میں عدل و مساوات کا اتنا لحاظ ہے کہ دونوں گھروں میں ہر چیز یکساں بھیجی جائیگی، کپڑا، کھانے، دستی مصارف، کسی معاملہ میں بھی کسی گھر کے ساتھ امتیاز نہیں ہے، ایک روز ایک گھر میں آرام فرمائیں گے، دوسرے روز دوسرے گھر میں، ایک تیسرا گھر بھی موجود ہے اور وہ اس لیے ہے کہ اگر کسی وجہ سے جس گھر میں رہنے کی باری ہو وہاں نہ جا سکیں، تو دوسرے گھر میں نہیں جائیں گے، اس تیسرے گھر میں تنہا آرام فرمائیں گے۔

نظام اوقات کی جو پابندی میں نے حکیم الامت کے ہاں دیکھی، وہ کہیں نہیں دیکھی، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ سینکڑوں کتابوں کے مصنف تھے، اور درجنوں خطوط کے جوابات بالعموم اپنے دستِ مبارک سے روزانہ تحریر فرمایا کرتے تھے۔

میانہ قد، نورانی چہرہ، بال کچھ سفید کچھ کالے، آواز میں ایک خاص قسم کا اثر، سر پر صافہ، باتیں جب کرتے تو آنکھیں جھکا لیتے، گفتگو میں تازگی اور رعنائی یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی زاہد خشک کی محفل میں بیٹھے ہیں، ساری مجلس پر ایک عجیب شگفتگی سی طاری رہتی تھی۔

خانقاہ کے ماتحت ایک مدرسہ بھی تھا، خانقاہ اور مدرسہ کے لیے عطایا اور نذرانے قبول کئے جاتے تھے، لیکن خاص شرائط کے ساتھ، ایک شرط یہ تھی، کہ مدرسہ اور خانقاہ کی مالی امداد وہی کرے، جو پورا اعتبار رکھتا ہو، اسے یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ حساب طلب کرے، دوسری شرط یہ تھی کہ کوئی شخص، اپنی آمدنی کا کل یا بڑا حصہ نہیں دے سکتا، آمدنی کا کم سے کم حصہ دے گا، جس کی شرح مقرر کردی گئی تھی، تیسری شرط یہ تھی کہ مالی امداد بغیر اجازت کے نہیں دی جاسکتی، لوگ ہزاروں لاتے تھے، مگر وہ لوٹا دیے جاتے تھے۔ بعض چند سکے لاتے تھے مگر وہ قبول کر لیے جاتے تھے۔

زائرین کے ساتھ، دوستوں کے ساتھ، عامۃ المسلمین کے ساتھ حکیم الامت کا طرز عمل اخوت اسلامیہ کے عین مطابق تھا، لیکن مریدین کیساتھ معاملہ دوسرا تھا، ان سے ——— عام اس سے کہ وہ رئیس ابن رئیس ہوں یا فقیر ابن فقیر، دولتمند ہوں یا مفلس، تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل ——— باز پرس ہوتی تھی، سزا دی جاتی تھی، ان کے امراض روحانی کا علاج کیا جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس کی کمزوریوں کو پرکھنے میں حکیم الامت کو وہ ملکہ حاصل تھا، جو کسی ماہر طبیب کو امراض جسمانی کے پہچاننے میں حاصل ہوتا ہے، اور ان امراض کا علاج وہ اتنا تیر بہدف کرتے تھے کہ بڑے بڑے خود سر اور سخت جان ان کے دار الشفا میں پہنچنے کے بعد چنگے ہو گئے، ان کی بیماری جاتی رہی، ایک صاحب حسد کے مرض میں مبتلا تھے، فرمایا جس سے تم حسد رکھتے ہو اس کی اعلانیہ تعریف کیا کرو، اس کی اچھائیوں کو نمایاں کر کے بیان کیا کرو، یہ مرض جاتا رہے گا، غور کیجئے کتنا نفسیاتی علاج ہے۔

ہندوستان میں آپ کو کوئی صوفی بھی ایسا نہیں ملے گا، جس کے مرید اتنے پابند شرع ہوں، جتنے حکیم الامت کے، خانقاہ اشرفیہ کے متوسلین میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے، ان میں گریجویٹ بھی تھے، اور عالمان دین بھی، دنیا دار بھی اور دیندار بھی، تاجر بھی اور زمیندار بھی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جس کی زندگی شرعی زندگی نہ ہو، جو پوری شدت کیساتھ شعائر اسلامیہ پر عمل پیرا نہ ہو۔

یہ بات آپ حکیم الامت ہی کے مریدوں میں دیکھیں گے کہ کالج کے پروفیسر ہیں، انگریزی کے ادیب، لکھ پتی تاجر ہیں، کہیں کے ڈپٹی کلکٹر یا کمشنر ہیں، کہیں کے زمیندار یا تعلقہ دار

ہیں، مگر نماز پابندی سے پڑھ رہے ہیں، گھر میں نہیں مسجد میں اور وہ بھی با جماعت، روزے پوری پابندی سے رکھ رہے ہیں زکواۃ باقاعدہ نکال رہے ہیں، داڑھی پوری مولویانہ شان سے رکھے ہوئے ہیں، گھر میں کوئی رسم نہیں ہونے دیں گے، جو خلاف شرع ہو، کیا حکیم الامت کی روحانی تربیت کا یہ سب سے بڑا ثبوت نہیں ہے۔

تھانہ بھون میں صرف دو روز قیام رہا، لیکن یہ دو روزہ زندگی کے وہ دن ہیں جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔

خواجہ حسن نظامی

ایک سحر طراز اور دلفریب شخصیت

ندوہ کی طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں جس مصنف کی کتابیں سب سے زیادہ میں نے پڑھیں اور جس کی شخصیت سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا، وہ خواجہ حسن نظامی کی ذاتِ گرامی تھی، ان کے لکھے ہوئے "غدر دہلی کے افسانے" میں نے کئی بار پڑھے ان کی آپ بیتی، آتالیق خطوط نویسی، سیپارہ دل، غرض جتنی کتابیں بھی الاصلاح میں تھیں، سب میں نے پڑھ ڈالیں۔

الاصلاح کی لائبریری میں، مُلا واحدی کا اخبار درویش آتا تھا، جس میں خواجہ صاحب کا روزنامچہ بھی ہوتا تھا خطیب وغیرہ کے پرانے پرچوں کی جلدیں بھی تھیں اور ان میں خواجہ صاحب کے بکثرت مضامین تھے، ان جلدوں کا مطالعہ بھی میں نے بڑی مستعدی سے کر ڈالا۔

اب خواجہ صاحب پنڈت مالوی اور سوامی شردھانند کے مقابلہ میں آچکے تھے اور تحریک تبلیغ کے علمبردار کی حیثیت سے ایک طرف مسلمانوں میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کر رہے تھے دوسری طرف ہندوؤں کی آنکھ میں بُری طرح کھٹکنے لگے تھے ان کی اس تحریک نے مجھے اور زیادہ ان کا عقیدت کیش بنا دیا، مجھے یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ تبلیغ فنڈ میں خواجہ صاحب کو، اپنے جیب خرچ سے بچا کر ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجا تھا، اور ایک خط لکھ کر ان سے دریافت کیا تھا کہ میں ہر مہینہ آپ کو چار آنے بھیجنا چاہتا ہوں، کیا آپ قبول فرمالیں گے؟ فوراً "حامی اسلام" کے تخاطب کے ساتھ خود خواجہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب ملا، جس میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ دیا گیا تھا کہ یہ رقم ٹکٹوں کی صورت میں بھیجی جا سکتی ہے میں یہ خط پا کر پھولا نہ سمایا، ایک حقیر کم مایہ، اور ناقابل التفات

طالب علم کو، تحریک تبلیغ کا علمبردار اپنے ہاتھ سے خط لکھ رہا ہے، بلکہ اسے "حامی اسلام" کے خطاب سے نوازا ہے۔

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید!

شکیل صاحب اور سعید اشرف صاحب مجھ سے کئی سال سینیئر تھے، اور میں ان سے بہت زیادہ جونیئر تھا، پھر بھی، یہ دونوں مجھ پر بہت مہربان تھے، اور میں ان کی عطا پاشیوں کے باعث

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ!

کا نمونہ بن گیا تھا، ایک روز بر سبیل تذکرہ، خواجہ صاحب کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور شکیل صاحب نے خواجہ صاحب کے بارے میں ناملائم الفاظ استعمال کئے، یہ سنتے ہی دفور غضب سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا، اور میں نے گفتگو یک لخت ترک کر دی شکیل صاحب حساس آدمی تھے، میرے خیالات و جذبات سے واقف تھے سمجھ گئے معاملہ کیا ہے، انہوں نے فوراً معذرت کی، اور میں نے کافی تامل کے بعد ان کی معذرت قبول کی،

پھر ۱۹۲۶ء میں مولینا محمد علی مرحوم نے اپنے اخبار ہمدرد دہلی میں "ایک عجیب و غریب انکشاف" کے عنوان سے خواجہ صاحب کے خلاف ایک مضمون لکھا، جس میں ان پر حضور نظام کے خلاف جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا، مولانا محمد علی کی میرے دل میں بہت عزت تھی، اب تک میں نے خواجہ صاحب اور مولینا محمد علی کی محبت کا موازنہ نہیں کیا تھا، لیکن اس مقالہ کے بعد، اور پھر مسلسل مقالات کے مطالعہ کے بعد، دل مولینا محمد علی کے استدلال کو قبول کرتا گیا، اور خواجہ صاحب کی عقیدت، حرف غلط کی طرح صفحۂ دل سے محو ہوتی گئی۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولینا محمد علی کا لندن میں انتقال ہو گیا، میں جامعہ میں زیر تعلیم تھا، مکتبہ جامعہ کے منیجر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ایک مختصر سی کتاب مولینا محمد علی پر لکھوں، یہ میرا محبوب ترین عنوان تھا، اپنے کام میں لگ گیا، ادھر ادھر سے مواد جمع کیا، اور دو مہینہ میں "سیرۃ محمد علی" مکمل کر ڈالی، یہ میری پہلی تصنیفی کوشش تھی، جو امید سے زیادہ سراہی گئی۔

سیرۃ محمد علی کا ایک باب "حدیث حسن صحیح" بھی تھا، اور یہ تھا محمد علی اور خواجہ صاحب کی آویزش کے بارے میں، میں نے ذاتی طور پر اس نازک مسئلہ پر کچھ لکھنے سے اپنا دامن

بچایا، اور صرف محمد علی، اور خواجہ صاحب، کے ملفوظات سے اقتباس دے کر یہ باب مکمل کیا۔

اس کتاب کی جہاں بہت سے حلقوں سے تعریف و تحسین ہوئی وہاں بعض حلقوں سے اس کی مخالفت ہوئی اور ان حلقوں میں ایک حلقہ خواجہ صاحب کا بھی تھا، پیشوا اور دوسرے اخبارات میں سیرت محمد علی پر تبصرے ہوئے، اور مجھ غریب کی ذات کے خلاف ایسی ایسی گل افشانیاں کی گئیں جن سے میں خود ناواقف تھا۔

۱۹۲۴ء میں مولینا شوکت علی مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے، اور انہوں نے روزنامہ خلافت کا مجھے ایڈیٹر بنا دیا، چند روز بعد سلطان ابن سعود اور امام یحییٰ فرمانروائے یمن میں جنگ چھڑی اور سلطان کی فوجوں نے یمن کے مشہور بندرگاہ حدیدہ پر قبضہ کر لیا، میں نے خلافت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں نجد و یمن کی اس جنگ کے دور رس نتائج پر بسط و تفصیل سے روشنی ڈالی تھی، چند روز بعد، اجنبی سواد میں [illegible] لفافہ ملا کھولا تو نیچے خواجہ حسن نظامی کے دستخط تھے خط پڑھا، تو جی کھول کر نجد و یمن کی جنگ والے مقالہ کی داد دی گئی تھی، طرز تحریر کی بھی، اور استنباط نتائج کی بھی، چند روز بعد منادی ملا، تو اس میں بھی یہی ذکر، اور کافی حوصلہ افزا الفاظ کے ساتھ، حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، یہ حوصلہ افزائی اس شخص کی، کی جا رہی تھی، جو علانیہ "دشمن" سمجھا جا رہا تھا۔

۱۹۳۵ء میں خلافت کا محمد علی نمبر میں نے شان و شکوہ کے ساتھ نکالا، جن "بڑے" آدمیوں اور محمد علی کے عزیزوں اور دوستوں کو اس نمبر کے لیے مقالات لکھنے کی دعوت دی گئی تھی، ان میں سے اکثر نے جواب دیا، بعض نے کثرت کار کے باعث معذرت کی، لیکن سب سے پہلے میرے خط کا مع مقالہ کے جس کی طرف سے جواب موصول ہوا، وہ خواجہ صاحب تھے، مولانا محمد علی اور خواجہ صاحب کے مابین، جو جنگ عظیم برپا ہوئی تھی اس سے کون ناواقف ہے، سچ پوچھیے تو اب تک خواجہ صاحب کا دل علی برادران سے صاف نہیں ہوا ہے، حالانکہ دونوں کے انتقال کو کئی برس گذر گئے ہیں، پھر بھی میری درخواست پر ایک مضمون فوراً لکھ کر بھیج دینا، خواجہ صاحب کا ایسا دل موہ لینے والا کارنامہ تھا جس نے پھر میرے دل میں خواجہ صاحب کی عزت اور محبت پیدا کر دی۔

چند روز بعد خواجہ صاحب کا خط ملا کہ فلاں تاریخ کو حیدر آباد سے بمبئی آرہا ہوں، فلاں جگہ قیام ہوگا، میں عمداً ملنے نہیں گیا، مولینا شوکت علی اور خواجہ صاحب کے تعلقات بھی کچھ خوشگوار نہیں تھے، میں نے خیال کیا ممکن ہے خواجہ صاحب سے ملنے جاؤں تو لوگ مولینا شوکت علی کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش شروع کر دیں، اور بعض لوگ ایسے نادر موقع کی تاک میں رہتے تھے، لیکن دوسرے روز دیکھتا کیا ہوں، میرے کمرے میں خواجہ صاحب موجود ہیں، وہ خلافت ہاؤس آئے خلافت کے کسی لیڈر سے نہیں ملے سیدھے میرے کمرے میں آئے، اور اس طرح ملے، اس تپاک سے پیش آئے، گویا ایک عرصہ سے مجھے جانتے ہیں اور مجھ پر مہربان ہیں، سچ تو یہ ہے خواجہ صاحب کے اس اخلاق اور کردار بلند نے میرے دل میں خواجہ صاحب کی عظمت پھر پیدا کر دی، کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے خواجہ صاحب کے کسی بیان کے خلاف، ان کی کسی تحریک کے خلاف اپنے خیالات کا صفائی کے ساتھ اظہار کیا، لیکن انھوں نے شفقت و محبت کی جو وضع قائم کر دی تھی، اس میں کبھی فرق نہ آیا، آج تک ان کا یہ معمول ہے، جب بمبئی آئیں گے، ضرور اطلاع دیں گے، اور اسی مہر و محبت سے ملیں گے، جو انھی کا حصہ ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ریڈیو میں ملازمت کی کوشش کی، خواجہ صاحب نے اس سلسلہ میں بالواسطہ طور پر جو کوشش فرمائی، میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا، دہلی میں اگر میرا کوئی قریب ترین عزیز ہوتا، وہ بھی اس سرگرمی و مستعدی سے میرے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا تھا۔

دہلی میں، میری تقریب نکاح کے موقع پر بھی خواجہ صاحب شریک ہوئے اور اسطرح شریک ہوئے کہ بیمار تھے، بواسیر کی شکایت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا بہت سا خون بہہ چکا تھا، پھر بھی نہ صرف شرکت کی بلکہ آخر وقت تک موجود رہے اگرچہ میں ان کی شفقت و محبت کا عادی ہو چکا تھا لیکن اتنی اُمید مجھے بھی نہیں تھی واقعہ یہ ہے کہ وضعداری اور وضع کا نباہ خواجہ صاحب پر ختم ہے اس کردار اور اس سیرت کے لوگ دنیا ہر روز نہیں پیدا کرتی۔

۱۹۴۵ء کے یادگار صوبائی انتخاب کے سلسلہ میں میں نے خواجہ صاحب کو ایک امر خاص کی طرف متوجہ کیا، خواجہ صاحب میرا خط لیکر گئے تھے، ان کا جواب مجھے اب تک نہیں

ملا تھا لیکن خواجہ صاحب کا خط آگیا، جس میں تحریر تھا کہ :-

"آپ کا خط پاتے ہی، شدید مصروفیت اور علالت کے باوجود میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کے گھر پر گیا اور انہیں مذکورہ امر کی طرف پوری توجہ دلادی، اُمید ہے وہ آپ کے خیالات کو پورے طور پر پیش نظر رکھیں گے"

مجھے سب سے پہلے خواجہ صاحب نے یہ بات سمجھائی اور سمجھائی ——————— برت کر ——— کہ دشمنوں کو دوست کیونکر بنایا جاتا ہے، مخالفوں کے دل پر قبضہ کس طرح کیا جاتا ہے، شدید ترین اختلاف کے باوجود بھی، اور اختلاف کے حدود میں رہتے ہوئے بھی آپس کے تعلقات کس طرح قائم رکھے جاتے ہیں، کاش ہندوستان کا ہر بڑا آدمی اس سبق کو سیکھ لے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت نہایت دل آویز ہے، ان کی باتیں بڑی من موہن ہیں، بہ حیثیت شخص کے وہ نہایت باوقار اور بلند پایہ حیثیت کے مالک ہیں، ان کے بعض خیالات سے بہتوں کو اختلاف ہو سکتا ہے، خود مجھے ہے، لیکن ان کی محبوب اور دل ویز شخصیت کی سحر انگیزی اور سحر طرازی کا ان کا بدترین دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

مولانا عین القضاۃ

ایک گوشہ نشین خادمِ اسلام

عہد حاضر کے علماءِ سوء اور بد باطن صوفیاء سے مجھے ہمیشہ سے نفرت رہی، لیکن چند شخصیتیں میری نظر سے ایسی گزریں جو اسلام کا معیاری نمونہ کہی جا سکتی ہیں، اس طرح کی شخصیتیں آج بھی بے شمشیر وسنان، صرف اپنے عمل صالح، اپنی پاکیزہ زندگی، اپنے بلند کردار، اپنی للہیت، بے نفسی اور بے لوثی سے اشاعت اسلام کا کام بہترین اسلوب سے انجام دے سکتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے آج سے صدیوں پہلے، سچے صوفیوں ہی نے اسلام کو ہندوستان میں بڑھایا، پھیلایا اور فروغ دیا انھیں شخصیتوں میں سے ایک مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی۔

مولانا عین القضاۃ کو جب میں نے دیکھا وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ داڑھی دودھ کی طرح سفید، لمبا قد، دبلا بدن، سر پر گاڑھے کی ایک چوگوشیہ ٹوپی، بدن پر گاڑھے کا لمبا کرتا، اور ٹخنوں سے اونچا پائجامہ، پاؤں میں نرمی کا جوتہ، رنگ ایسا روشن جس سے "دیدہ مہ وانجم فروغ گیر" بھویں اور پلکیں بھی کسی حد تک سفید تھیں، گفتگو بہت آہستہ آہستہ فرماتے تھے، اور وہ بھی ٹھہر ٹھہر کر!

مولانا کا معمول یہ تھا، کہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے، مدرسہ کی وسیع اور کشادہ عمارت میں ایک بالاخانہ تھا، جسے انھوں نے اپنی قیام گاہ بنا رکھا تھا، بالاخانہ صرف ایک لمبے کمرہ پر مشتمل تھا، بیچ کی کھڑکی کے سامنے ایک کمبل کا فرش تھا، مولانا اسی پر رونق افروز ہوتے تھے، کمرہ میں سیتل پاٹی بچھی ہوئی تھی، اس کے علاوہ نہ کوئی چارپائی، نہ میز، نہ کرسی، نہ بستر، مولانا اسی کمرہ میں استراحت بھی فرماتے تھے، فجر کے بعد حلقہ کے لوگوں کو اذن باریابی ملتا تھا، ایک گھنٹہ کے بعد حلقہ برخاست ہو جاتا تھا، پھر

مولینا اپنے کمرے میں معتکف ہو جاتے تھے اب ان سے کوئی نہیں مل سکتا تھا عصر کے
بعد ہر شخص حاضر ہو سکتا تھا، اس وقت بعض اہل علم بھی کبھی کبھی آجاتے تھے، مولینا فلسفہ
میں غیر معمولی درک رکھتے تھے، میبذی کی انہوں نے شرح بھی عربی زبان میں لکھی تھی، کبھی
کبھی فلسفیانہ مسائل پر بھی گفتگو فرما لیتے تھے، خود کہیں آتے جاتے نہیں تھے جو آتا تھا اس
سے کام کی باتیں کرتے اور رخصت کر دیتے، پانچ منٹ سے زیادہ بیٹھنے کی بالعموم کسی
کو اجازت نہ تھی۔

مولینا کی شاہ خرچیوں کی کوئی حد ہی نہیں، پہلے سال میں چار بار، اور اب آخر میں سال
میں دو بار، سارے شہر کی دعوت عام کرتے تھے جس کا سلسلہ تقریباً ۲۴ گھنٹے جاری رہتا
تھا، کھانا اتنا نفیس، لذیذ اور مرغن ہوتا تھا، کہ چند نوالے کھانے کے بعد نیت بھر جاتی تھی،
ہر دعوت پر کئی ہزار روپے صرف ہو جاتے تھے، اس دعوت کا بیتابی سے انتظار کیا
کرتے تھے۔

حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ہر سال سو پچاس لڑکوں کی ایک
کھیپ بھیجتے تھے، یہ لڑکے وہاں جا کر قرآن خوانی کرتے تھے، ریل کا ایک ڈبہ ریزرو کرا
لیا جاتا تھا، سارے مصارف راہ و قیام مولینا ادا کرتے تھے۔

شہر میں بالغ سینکڑوں یتیموں، بیواؤں، بے روزگاروں، سفید پوش شریفوں اور
ناداروں کے وظائف مقرر تھے جو ایک مقررہ وقت پر سب کو مل جاتے تھے غریبوں سے مولانا
کو بڑی محبت تھی، فرماتے تھے، یہ دربار حبیب کے رہنے والے ہیں، ان کی خدمت ہمارا
فرض ہے، ضرورتمند اور بے ضرورت غریبوں کو سینکڑوں ہزاروں روپیہ مولینا دے دیتے
تھے، ان کے ماہوار مناسب مقرر کر دیتے تھے، لکھنؤ میں درجنوں غریب خاندان مولینا کے
زیر سایہ پرورش پاتے تھے۔

مدرسہ فرقانیہ کا خرچ سات آٹھ ہزار ماہوار سے ہرگز کم نہ ہوگا، گرانقدر تنخواہوں پر
بڑے بڑے قاریوں اور حافظوں کو مولینا نے بلا کر اپنے مدرسہ میں رکھا تھا، مدرسہ کے
۸۰ فیصدی طلبہ کو مولینا کی طرف سے دونوں وقت کھانا ملتا تھا سال میں چار جوڑے کپڑے
ملتے تھے، ایک جوڑا جوتا دیا جاتا تھا، جاڑوں میں ایک کمبل ملتا تھا، اس کے علاوہ پنسل،
قلم، دوات، کاغذ جیسی ضروریات کی چیزیں بھی دی جاتی تھیں، بیماری کی صورت میں

بڑے مصارف، پر ہر طالب علم کا مدرسہ کی طرف سے علاج کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ کسی کو ایک روپیہ، کسی کو دو روپیہ ماہوار جیب خرچ دیا جاتا تھا، اس شاہ خرچی، اولو العزمی اور دریا دلی کے باوجود مولینا کا ذاتی خرچ کیا تھا؟ مشکل سے دس بارہ روپیہ ماہوار جس میں کھانا کپڑا، جملہ ضروریات شامل ہیں۔

مدرسہ کے، اور وظائف کے، اور شاہ خرچیوں کے یہ مصارف پورے کہاں سے ہوتے تھے؟ یہ ایک راز ہے اور شاید ہمیشہ راز رہیگا کسی کو نہیں معلوم مولینا کے پاس یہ روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ سی، آئی، ڈی نے بھی اپنا زور صرف کر ڈالا، وہ بھی پتہ نہ چلا سکی، انکم ٹیکس والوں نے بھی بہت چھان بین کی، وہ بھی ناکام رہے، مولینا اشرف علی تھانوی کی ایک مرتبہ مولینا نے دعوت کی، انہوں نے اس لیے دعوت قبول نہیں فرمائی کہ مولینا کا ذریعہ آمدنی مجہول تھا، مولانا نے فرمایا میں کوئی ناجائز آمدنی نہیں رکھتا، میری مالی حالت ذاتی طور پر یہ ہے کہ مجھ پر زکواۃ بھی واجب نہیں ہے، بظاہر مولینا نے کبھی مدرسہ کیلئے کسی کا چندہ یا عطیہ بھی قبول نہیں فرمایا، مولینا کے والد ایک بڑے عامل کیمیا گر تھے، وہ سونا چاندی بنا لیتے تھے، مولینا فرمایا کرتے تھے۔ والد سے میں نے یہ فن نہیں سیکھا، اگر سیکھتا تو جو پوچھتا اسے بتا دیتا۔

نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال موجودہ نواب صاحب بھوپال کے ساتھ ان کی ولی عہدی کے سلسلہ میں لندن جا رہی تھیں، لکھنؤ آئیں، اور گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہریں، بیگم صاحبہ کی خدمت میں علماء اور صوفیا کی ایک بڑی جماعت روز حاضر ہوتی تھی، موصوفہ نے مولینا کی زیارت کرنا چاہی، مولینا نے تشریف لے جانے سے انکار کر دیا۔

بیگم صاحبہ خود مولینا کی بارگاہ پر حاضر ہوئیں، پردہ کا انتظام ہو گیا، پانچ منٹ تک باتیں کر کے مولینا نے انہیں رخصت کر دیا، انہوں نے مدرسہ کو کچھ عطیہ دینا چاہا، مولینا نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا، مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس زمانہ میں، میں ندوہ کا ایک چھوٹا سا طالب علم تھا، مولینا عبد الرحمن نگرامی مرحوم نے طلبہ کے ایک مخصوص اجتماع میں اس واقعہ کو بڑے موثر انداز میں بیان فرمایا، اور بتایا کہ اہل دل، اور اہل علم کس طرح، دولت اور فقر سلطانی سے بے نیاز رہتے ہیں۔

غالباً ۲۶ سنہ میں مولینا کا انتقال ہوا، صورت یہ ہوئی کہ عراق کے چند اصحاب ان سے

ملنے آئے، وہ کھسک کر بالکل مولینا کے سامنے آ گئے، مولانا نے کہا، ذرا ہٹ کے بیٹھیے، یہ بات انہیں ناگوار ہوئی، اُنھوں نے دنیا کی بے ثباتی پر، حضرت علی علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ پڑھا، مولینا پر کیفیت طاری ہوئی، آپ نے سر جھکا لیا، اب جو دیکھتے ہیں تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے، اللہ اللہ کیا زندگی تھی، اور کیا موت؟

سبک بار مردم سبک تر روند!

قائدِ اعظم جناح

بچّے کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں

حکومت بمبئی نے ۱۹۳۶ء میں روزنامہ خلافت کی تین ہزار کی ضمانت ضبط کر کے مزید چھ ہزار کی ضمانت طلب کر لی، شوکت صاحب بمبئی سے باہر تھے، اتنی بڑی رقم کا انتظام میرے بس سے باہر تھا، انڈیا ایکٹ کے ماتحت صوبائی مجالس آئین ساز کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں، مولانا عرفان صاحب بھی اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے الیکشن کی اُلجھنوں میں گرفتار تھے، اس لیے وہ بھی کوئی جدوجہد نہ کر سکے۔

وقت مقررہ پر حکومت کے خزانہ میں ضمانت نہ داخل ہو سکی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی اشاعت ملتوی ہو گئی، مولانا شوکت علی مسلم لیگی اُمیدواروں کی تائید و حمایت کے سلسلہ میں یو۔پی کا دورہ کر رہے تھے، میں نے انہیں ایک مفصل خط لکھ کر استدعا کی کہ رقم ضمانت کی فراہمی کا جلد از جلد بندوبست کیا جائے ورنہ غیر معمولی نقصان کاروبار کو پہنچے گا، لکھنؤ سے مولانا کا ایک طویل مکتوب مجھے موصول ہوا۔ اس خط میں ایک پرچہ مسٹر جناح کے نام بھی تھا، کہ یہ انہیں دیکر ان سے چھ ہزار روپیہ قرض لے لو، ضمانت داخل کر کے اخبار پھر جاری کر دو۔

دوسرے روز، میں بمبئی ہائیکورٹ گیا۔ وہاں مسٹر جناح کے چیمبر کا پتہ لگا کر اندر پہنچا، وہ بیٹھے ہوئے مسٹر ڈی ٹی بڑودہ والا بیرسٹرایٹ لا سے گفتگو کر رہے تھے، میں نے مولینا شوکت علی کا خط دیا۔ اسے پڑھا اور فرمایا، بمبئی اسمبلی کا انتخاب چند روز میں ختم ہو جائے گا، پھر تم میرے پاس آنا، میں روپیہ کا انتظام کر دونگا۔

انتخاب کے ختم ہونے کے بعد میں مالابارہل مسٹر جناح کے دولتکدہ پر پہنچا، سر علی محمد خاں، مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر موجود تھے، چونکہ کانگرس نے اکثریت میں ہونے کے باوجود تشکیل وزارت سے انکار کر دیا تھا، اس لیے گورنر نے دوسری بڑی پارٹی (مسلم لیگ) کے لیڈر سر علی محمد خاں

کو تشکیل وزارت کی دعوت دی تھی، اور وہ مسٹر جناح سے اجازت لینے آئے تھے کہ اگر حکم ہو تو وزارت قبول کر لی جائے اور اس آبدار موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

مسٹر جناح نے سر علی محمد خاں کی باتیں غور سے سنیں، پھر پوچھا، کل اگر کانگریس کی حکومت سے صلح ہو جائے تو تمہاری وزارت کیا کرے گی؟ کیا وہ مستعفی ہونے پر مجبور نہ ہو گی؟ سر علی محمد خاں نے جواب دیا، ایسی صورت میں سوا استعفیٰ دینے کے اور چارہ کار ہی کیا ہو گا؟ مسٹر جناح نے فرمایا، میں ہرگز آپ کو ایسی وزارت قائم کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا جو دوسروں کے رحم و کرم پر ہو، آپ اس وقت تک وزارت قائم کرنے کا خیال بھی نہ کیجیے، جب تک "ورکنگ میجارٹی" آپ کو حاصل نہ ہو جائے اور چونکہ بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا گورنر سے صاف الفاظ میں تشکیل وزارت کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیجیے۔

سر علی محمد خاں نے مسٹر جناح کا یہ مشورہ بادل نخواستہ قبول کر لیا۔ لیکن میرے دل میں اس اصول پروری کی بنا پر مسٹر جناح کی عظمت اور بڑھ گئی، اس وقت تک مسلم لیگ، مسلم ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت نہیں تھی، ابھر رہی تھی، لیکن اب تک اس میں اتنی قوت نہیں آئی تھی، کہ وہ عوام پر حکومت کر سکے، اور اپنے ممبروں کو قابو میں رکھ سکے، اس طرح کی کمزور جماعتیں موقع سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوتی ہیں، اور جب انہیں کوئی "چانس" مل جاتا ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں، لیکن اس کمزوری، بدنظمی اور ابتری کے عالم میں بھی جناح کے تیور وہی تھے جو آج ہیں، جناح کے اس دو ٹوک فیصلہ کو سُن کر میں دنگ رہ گیا، اور میرے دل نے کہا، جو شخص جاہ و منصب کو اس شان خودداری کے ساتھ ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ نہ کبھی دھوکا کھا سکتا ہے، نہ اپنی ملت کی غلط رہنمائی کر سکتا ہے۔

بالائے سرش زہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

صاف معلوم ہو رہا تھا، آگے چل کر یہ شخص آن بان کے ساتھ مسلم ہندوستان کی رہنمائی کریگا، نہ ترغیب سے متاثر ہو گا، نہ تہدید سے لرزہ براندام ہو گا۔

آخر سر علی محمد خاں نے مسٹر جناح کے حسب الحکم تشکیل وزارت سے انکار کر دیا اور مسٹر دھنجی شاہ کوپر نے عارضی وزارت قائم کر لی، اس وزارت کے ایک رکن مسٹر حسین علی رحمۃ اللہ بھی تھے، یہ اگرچہ اسمبلی کے ممبر نہیں تھے، لیکن مسلم لیگ کے رکن تھے، اس جرم میں مسٹر جناح نے پورے

حوصلہ کے ساتھ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی، اور انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا، مسٹر حسن علی کی وزارت سے خلافت کو فائدہ پہنچا، یہ قطب صاحب کے دوست تھے، اور اُنہوں نے ان سے پہلا کام یہ لیا، کہ خلافت کی سابقہ ضمانت واپس کرا دی، اور تازہ ضمانت منسوخ کرا دی، پھر جناح سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

حسرت موہانی

جنگ آزما سپاہی، من چلا لیڈر!

آج سے ۱۸ برس پہلے کی بات ہے، اس وقت کے وزیر ہند برکین ہیڈ نے ہندوستانیوں کو طعنہ دیا تھا، کہ یہ قوم آزادی کیا لے گی، اس میں تو اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ ایک متفقہ دستور اساسی اپنے لیے بنا سکے۔

یہ طعنہ ہندوستان کے حریت مآبوں اور قوم پروروں کو بہت گراں گزرا، مئی ۱۹۲۸ء میں کانگرس نے ایک مجلس موتی لال نہرو کی صدارت میں ترتیب دی، جس کا کام یہ تھا، کہ آزاد ہندوستان کا ایک دستور اساسی تیار کرے، اس کے مسلمان ممبروں میں شعیب قریشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کے متفقہ دستور اساسی کے لیے ضروری تھا کہ ملک کی تمام قابل ذکر اور اہم جماعتیں اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کریں، کانگرس اس وقت ملک کا سب سے بڑا اور منظم ادارہ تھا، لیکن پھر بھی وہ سارا ہندوستان تو نہ تھا، مجلس کی رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے شائع ہوئی، کانگرس کی طرف سے لکھنؤ میں ایک "آل پارٹیز کانفرنس" طلب کی گئی، تاکہ نہرو رپورٹ کی تائید ہر پارٹی سے حاصل کی جائے، اور پھر اسے وزیر ہند کی خدمت میں پیش کر دیا جائے، کہ یہ ہے ہمارا متفقہ دستور اساسی،

دیکھنا ہے عذاب دہ پیش فرماتے ہیں کیا؟

یہ جلسہ قیصر باغ کی مشہور بارہ دری میں منعقد ہوا، مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد میزبان تھے، اور شہر کا کی بہت بڑی تعداد ان کی مہمان، اس جلسہ میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندہ موجود تھے، ملک کے تمام سربرآوردہ حضرات تشریف رکھتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری، مہاراجہ محمود آباد، سر علی امام، لالہ لاجپت، پنڈت مدن موہن مالوی،

سر تیج بہادر سپرو، مسٹر سین گپتا، سو بھاش چندر بوس، مولینا ظفر علی خاں، مولینا حسرت موہانی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر عالم، جسٹس چاگلا، مولینا ابوالکلام آزاد، اور مسٹر بپن چندر پال، غرض نرم اور گرم، معتدل اور انتہا پسند، کانگرسی اور مسلم لیگی، مہاسبھائی اور خلافتی سب ہی موجود تھے، مسٹر جناح اور مولینا محمد علی مرحوم، یورپ میں تھے، ان کی عدم شرکت بہت محسوس کی جارہی تھی۔

میں اس زمانہ میں ندوۃ العلما کا ایک طالب علم تھا، ایسے مواقع پر ندوہ کے طلبہ رضا کار کی حیثیت سے طلب کئے جاتے تھے، ندوی رضا کاروں کا ایک فرد میں بھی تھا، اتفاق سے میری ڈیوٹی ڈائس کے قریب تھی، اس لیے رہنماؤں کی نقل وحرکت، گفت وشنید اور کانا پھوسی براہ راست میرے علم میں تھی،

جلسہ میں سب سے پہلے جو تجویز پیش ہوئی وہ شکریہ کی تھی، حاضرین نہرو رپورٹ کے واضعین کی محنت اور سعی وجستجو کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے، شکریہ کی تجویز غیر اخلاقی تجویز تھی، اس تجویز کی تائید وہ بھی کر رہے تھے، جو نہرو رپورٹ سے اختلاف رکھتے تھے، اور آگے چل کر اپنے اختلاف کا اظہار کرنے والے تھے، مثلاً مولینا شوکت علی اور پنڈت جواہر لال نہرو۔

غرض تجویز پیش ہوئی، تائید ہوئی، جلسہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا، جو تائید عام کا غماز تھا، اتنے میں چھوٹے قد اور دوہرے بدن کا ایک شخص اظہار اختلاف کے لیے کھڑا ہوا، سب کی نظریں اٹھ گئیں، یہ مرد ضعیف سب کا مرکز نگاہ بن گیا، یہی تھے مولانا حسرت موہانی۔ بعض چہروں پر حقارت کا تبسم اور لبوں پر طنز کے جملے تھے، حسرت موہانی نے طنز وحقارت کی پروا کئے بغیر اپنی نقرئی اور بر بجی آواز (یعنی وہ آواز جو کسی ہلکے برتن کے گرنے سے پیدا ہوتی ہے) کے ساتھ نعرہ لگایا، کہ نہرو رپورٹ کے واضعین ہرگز کسی شکریہ و سپاس کے مستحق نہیں ہیں، یہ ملک کے غدار ہیں، انہوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا ہے، گزشتہ سال مدراس میں کانگرس آزادی کامل کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے، اور اب صرف ۶-۷ مہینے کی قلیل مدت کے بعد نہرو رپورٹ ہمارے سامنے درجہ مستعمرات و نوآبادیات (ڈومینین اسٹیٹس) کا نصب العین پیش کرتی ہے، ہم اس نصب العین کو قبول نہیں کر سکتے، ہم اس

نصب العین کے پیش کرنے والوں کا رسمی اور اخلاقی شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے، یہ نفرت و ملامت کے مستحق ہیں، نہ کہ شکر و سپاس کے۔

تجویز سپاس کی تائید کرنے والوں نے حسرت کا خوب مذاق اڑایا، لیکن وہ اپنی تجویز پر اڑے رہے، منتظمین جلسہ کی خواہش یہی تھی، کہ شکریہ کی تجویز بالاتفاق منظور ہو، حسرت پہ زور ڈالا گیا، کہ وہ اپنی تجویز واپس لے لیں، اصرار کیا گیا، التجا کی گئی، لیکن

نہ بہ زاری، نہ بہ زورے، نہ بہ زرمی آید

والا معاملہ تھا، حسرت موہانی نے اپنی تجویز واپس لینے سے انکار کر دیا، رائے شماری ہوئی، قیصر باغ کی وسیع بارہ دری کے انبوہ اور ہجوم میں حسرت موہانی کی تائید میں صرف ایک ہاتھ بلند ہوا، وہ ہاتھ خود حسرت موہانی کا تھا، شکریہ کی تجویز تالیوں کی گونج میں تقریباً بالاتفاق منظور ہو گئی۔

موتی لال نے تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد حسرت موہانی سے کہا، حسرت صاحب میں آپ کی تائید کرتا ہوں، لیکن مجھے بڑا افسوس ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں ہم اور آپ بہت بڑی اقلیت میں ہیں۔

حسرت موہانی نے چبھتے ہوئے فقرہ کا کوئی جواب نہیں دیا، اور اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد نہرو رپورٹ کی ہر ہر دفعہ پر اظہار خیال کا سلسلہ مخالفانہ اور موافقانہ طور پر شروع ہوا، حسرت موہانی نے بڑا سرگرم حصہ اس مباحثہ میں لیا، زیادہ تر مخالفت ہی کی، کبھی اردو میں تقریر کرتے تھے اور کبھی انگریزی میں، وہ حاضرین کو اپنے دلائل سے قائل کرنا چاہتے تھے، اور حاضرین شخصیت کے بتوں کے سامنے سربسجدہ ہو چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت موہانی کی کوئی ترمیم منظور نہیں ہوئی، ان کی ہر ترمیم قہقہوں کی گونج میں مسترد ہوتی رہی، اس مظاہرۂ طنز و حقارت سے حسرت موہانی میں ذرا بھی بددلی نہیں پیدا ہوئی، وہ ہر دفعہ اپنی ترمیم اس جوش و خروش سے پیش کرتے تھے کہ گویا وہ منظور ہی ہو جائے گی، ہر مرتبہ ناکام ہوتے تھے، مگر ناکامی کا کوئی اثر ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا، ان کی مثال اس جیالے سپاہی کی تھی جو گر گر اٹھتا ہے لیکن میدان جنگ کو نہیں چھوڑتا، کوئی ٹھوکر بھی اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مائل نہیں کرتی، کوئی ضرب اس کی پیٹھ پر نہیں پڑتی، ہر ضرب کا استقبال کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلا رہتا ہے۔

مغرب کا وقت ہوگیا، حسرت موہانی چپکے سے اُٹھے اور بارہ دری کے ایک گوشے میں اپنی اچکن بچھائی، اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی اور مقامی کالج اور اسکولوں کے کچھ طلبہ نے انہیں گھیر لیا، اور اپنی نوٹ بکیں ان کے سامنے کر دیں کہ دستخط کر دیجئے۔

ایک نوٹ بک پر دستخط سے پہلے حسرت موہانی نے یہ شعر لکھا ؎

بندۂ بندگان حضرت عشق
حسرت سرفراز رسوائی

دوسری نوٹ بک پر لکھا:-

میں رسوائے جہان آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں! میں کلام حسرت کی اس معنویت پر غور کرتا رہا، اور حسرت صاحب اپنی جگہ پر جا کر چٹان کی طرح جم گئے۔

حسین شہید سہروردی

چند گزری ہوئی باتوں کی یاد

آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بنگال کے شیر دل اور جواں ہمت، اولوالعزم اور حق گو، بیباک اور نڈر، وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کا نام گونج رہا ہے، اس مردِ حق آگاہ نے جس تہور اور استقامت کے ساتھ مسلم لیگ کو، بنگال میں پروان چڑھایا، اُسے ہر مسلمان تشکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ محسوس کرتا ہے، لیکن میں نے انھیں اس وقت دیکھا ہے، جب ان کا شاندار مستقبل پردۂ عام میں روپوش تھا، مگر دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، اور سمجھنے والے سمجھ رہے تھے۔

ابھی فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگا

۲۸ء میں مجلس خلافت کا ہنگامہ خیز سالانہ اجلاس، کلکتہ میں منعقد ہوا، مسٹر حسین شہید سہروردی اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، صدر کی حیثیت سے انہوں نے خطبہ میں کیا پڑھا، یہ تو یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ ان کے حسن انتظام مستعدی، کارگزاری، اخلاص اور ایثار پسندی پر مولینا شوکت علی نے ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی، اور پیشین گوئی بھی کر دی، کہ یہ نوجوان خوبصورت اور خوب سیرت مجاہد آگے چل کر، کاروانِ ملت اسلامیہ کا بیباک نقیب ہوگا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ شوکت جیسے ضیغم اسلام، اور مردِ مجاہد کی یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی، آج اگر شوکت صاحب زندہ ہوتے تو! حسین شہید کی کامیابیوں پر پھولے نہ سماتے۔

مولینا شوکت علی کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ وہ خلافت کے مخلص اور جانباز کارکنوں کو ہمیشہ اپنے سینہ سے لگائے رہتے تھے، ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور حاضر و غائب ان کی دوستی اور محبت کا دم بھرتے تھے، ان کے محبوبوں اور چہیتوں میں جو لوگ داخل

تھے، ان میں حسین شہید سہروردی بھی تھے، یو، پی میں خلیق الزماں، سی، پی میں عبدالرؤف شاہ بہار میں شفیع داؤدی، سندھ میں حاجی عبداللہ ہارون اور شیخ عبدالمجید، پنجاب میں فیروزالدین، مدراس میں مرتضیٰ بہادر اور بنگال میں حسین شہید سہروردی، ان سب سے وہ بڑی محبت کرتے تھے، اور جب کبھی یہ بمبئی آتے، توان کی دلی تمنا اور بہترین کوشش یہی ہوتی، کہ یہ خلافت ہاؤس میں ٹھہریں۔

۳۴ء میں گول میز کانفرنس کی آخری کڑی جوائنٹ سیلکٹ پارلیمنٹری کمیٹی کا لندن میں اجلاس تھا، اس اجلاس کے سامنے شہادت دینے کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے مختلف لوگ طلب کیے گئے تھے، بنگال سے مسٹر شہید بلائے گئے تھے، چنانچہ عازم لندن ہوکر وہ بمبئی پہنچے، شوکت صاحب اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے، اپنے ساتھ خلافت ہاؤس لے آتے اور بڑی محبت اور چاؤ سے رہے، جب تک رہے، خلافت کی تجدید واحیاء مجالس مخالفت کی تنظیم جدید محمد علی ہال کی تعمیر، اور دستہ رضاکاروں کی ترتیب وتشکیل پر شوکت صاحب سے تبادلہ خیالات کرتے رہے، اور نئے نئے مشورے دیتے رہے۔

جس روز ان کا جہاز روانہ ہو رہا تھا، اس دن انہوں نے غالباً دس روپیہ کا ایک نوٹ شوکت صاحب کے ہاتھ پر رکھا، اور کہا، اسے میری طرف سے خلافت فنڈ میں دے دیجئے۔

یہ واقعہ خلافت ہاؤس کے بالاخانہ پر پیش آیا تھا، شوکت صاحب نے نوٹ لے لیا، اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہوگئے، نیچے مولینا عرفان مرحوم حسب عادت پنچ پر بیٹھے ہوئے تھے، اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے، شوکت صاحب نے آواز دی۔

"عرفان یہ دیکھو!"

نوٹ شوکت صاحب کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا، عرفان نے دیکھا، لیکن سمجھ نہ سکے ماجرا کیا ہے، شوکت صاحب کی پھر آواز آئی "یہ شہید نے خلافت فنڈ میں چندہ دیا ہے، اور وہ لہراتا ہوا مولینا عرفان کی گود میں آکر گر پڑا۔

شہید صاحب یہ منظر دیکھ رہے تھے، وہ اپنے لیڈر، اور بزرگ کا یہ جذبہ دیکھ کر کہ وہ اُن کے دس روپیہ کے نوٹ کو دس ہزار کے برابر سمجھ رہا ہے، بہت متاثر ہوئے،

اور ان کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں

سوال روپیہ کی تعداد کا نہیں تھا، جذبہ کا تھا، جس جذبہ سے دینے والے نے یہ نوٹ دیا تھا، اس جذبہ کی روح تک، لینے والے کے دل کی آنکھ پہنچ گئی تھی:-

---

مسٹر چندریگر

ایک ہنگامہ خیز انتخابی جلسہ کی روداد

احمد آباد وطن ہے، وہیں وکالت کرتے تھے۔ اور اپنے پیشہ میں ضرورت سے زیادہ کامیاب تھے۔ ہندوستان کی دو تحریکوں نے احمد آباد کے دو کامیاب وکیلوں کو بمبئی کھینچ بلایا، کانگریس نے مسٹر نوری کو، اور مسلم لیگ نے مسٹر چندریگر کو، مسٹر نوری نے آتے ہی کانگریس کے وثیقہ پر دستخط کئے اور وزارت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ مسٹر چندریگر کسی تحریص اور ترغیب سے متاثر نہیں ہوئے، وفاداری کے ساتھ مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے، مسٹر نوری بمبئی کانگریس کے نائب صدر بن گئے، مسٹر چندریگر بمبئی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے، مسٹر نوری کو مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کی ذاتی کوششیں بھی کامیاب نہ کر سکیں، وہ انتخاب میں ہار گئے اور وزارت سے محروم ہو گئے مسٹر چندریگر جاہ و منصب سے بے پروا ہو کر اپنی قوم کی خدمت میں لگے رہے، اور آج وہ حکومت ہند کے ممبر تجارت ہیں۔

مجھے مسٹر چندریگر سے ملنے کا اور انہیں دیکھنے کا کئی بار موقع ملا ہے، میں نے ان کی روش پر بارہا، اپنے اخبار میں تلخ اور تیز نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن مسٹر چندریگر کو، کسی موقع پر بھی، میں نے گرم نہیں پایا، صبر و تحمل کا وصف ان میں قابل تقلید حد تک ہے۔ وہ اپنے مخالفوں، بلکہ دشمنوں تک کا نہ صرف یہ کہ برا نہیں چاہتے، بلکہ ان کی تند و تلخ باتیں سنتے ہیں، ان کی ناگوار اور دل دوز نکتہ چینیوں کا وار سہتے ہیں، بعض نامہذب اور بد تمیز قومی کارکنوں کی زبان درازیوں کا شکار بھی بنتے ہیں، لیکن ان کے منہ سے کبھی کوئی سخت بات نہیں نکلتی۔ وہ ہمیشہ صبر و سکون کے ساتھ، ضبط و تحمل کے ساتھ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے اعتراضات سنتے ہیں، سنجیدگی اور ملائمت کے ساتھ ان کا جواب دیتے ہیں۔

دو سال پہلے بمبئی مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ان کا نام پیش ہوا، مقابلہ میں ایک دوسرے صاحب کھڑے ہوئے، اور انہوں نے اپنے ساتھ ایسے غیر ذمہ دار لوگوں کا انبوہ شریک کر لیا، جن کی نہ قوم کی نظر میں کوئی وقعت تھی، نہ خود اپنی جماعت میں، لیکن یہ لوگ ہنگامہ آرائی کے فن سے واقف تھے، اور اسی برتے پر مسٹر چندریگر کو شکست دینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

میں نے اب تک روزنامہ انقلاب میں مسٹر چندریگر کی صدارت کی تائید نہیں کی تھی، بلکہ مخالفت کی تھی، لیکن یہ رنگ دیکھ کر اور ایسے نااہل امیدوار سامنے دیکھ کر میں نے اور حاجی نور محمد احمد صاحب ایم ایل اے نے یہی طے کیا کہ مسٹر چندریگر کی تائید کی جائے ہمیں مسٹر چندریگر سے کچھ شکایتیں تھیں، ہم چاہتے تھے، وہ مسلم لیگ کو زیادہ سے زیادہ وقت دیں، نہ دے سکیں، تو صدارت سے باز آ جائیں، لیکن نئے امیدوار اور ان کے حامیوں کا رنگ دیکھ کر معلوم ہوا مسٹر چندریگر اگر بہت زیادہ وقت نہ دے سکیں، تو بھی ان کی صدارت میں مسلم لیگ تو رہے گی، بازیچہ اطفال تو نہ بن سکے گی۔

مسلم لیگ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے ہنگامہ خیز اور شور انگیز انتخابی جلسہ میں میں بھی شریک ہوا، مخالفین نے اپنی تقریروں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو کہہ سکتے تھے، صدارت مسٹر چندریگر کر رہے تھے، وہ اس طرح بیٹھے تھے، جیسے یہ آتش بیانی اور شعلہ نوائی کا مظاہرہ ان کے کسی دشمن کے خلاف ہو رہا ہے، وہی سکون، وہی تبسم، وہی ملاطفت دوستوں کو حمایت میں بولنے کا موقعہ کم دیتے تھے، دشمنوں کو مخالفت میں بولنے کی پوری آزادی تھی۔

جلسہ میں یہ افواہ گرم تھی، کہ قائد اعظم، مسٹر چندریگر کی صدارت پسند کرتے ہیں مس فاطمہ جناح کی تقریر سے بھی یہی اندازہ ہوا مسٹر چندریگر غیر معمولی کثرت آرا سے کامیاب ہو گئے، میں نے مسٹر انصاری سے جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہا، اس کیرکٹر کے آدمی کو مسٹر جناح اگر پسند کرتے ہیں، تو ان کی نگاہ انتخاب قابل داد ہے۔

سر سکندر حیات خاں

نئی دہلی کا ایک دلچسپ اجتماع

۳۸ء کا واقعہ ہے سر سکندر حیات خاں، وزیر اعظم پنجاب بھی کسی نجی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے، اور نواب زادہ خورشید علی خاں کے ہاں مقیم تھے۔ مسٹر غیاث الدین (آف پنجاب) ممبر مرکزی اسمبلی نے انہیں اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند اور سربرآوردہ اصحاب کو بھی مدعو کیا تھا۔

حاضرین میں مولینا شوکت علی، سر یامین خاں، سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، نواب اسمٰعیل خاں صدر یو۔ پی مسلم لیگ، آنریبل مسٹر حسین امام ممبر کونسل آف سٹیٹ، مسٹر اظہر علی، حاجی رشید احمد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس مجلس میں موضوع گفتگو زیادہ تر سر سکندر حیات خاں کا وہ بیان تھا، جو ابھی چند روز ہوئے انہوں نے ملک برکت علی کے مجوزہ شہید گنج بل کے استرداد کے سلسلہ میں شائع کیا تھا۔ تقریباً تمام اصحاب نے سر سکندر کی اس جرأت آمیز روش پر انہیں مبارکباد دی۔

سر سکندر حیات خاں اس صوبہ سے تعلق رکھتے تھے، جہاں کا ہر فرد بجائے خود لیڈر ہوتا ہے، جہاں عملاً ہر شخص "غیر مقلد" ہے آج تک پنجاب کے مسلمان اپنا کوئی متفقہ زعیم نہ تسلیم کر سکے، قیادت اور اقتدار کی جو کشمکش وہاں نظر آتی ہے مشکل سے کہیں اور اس کی نظیر ملے گی۔ حالانکہ یہاں کی خاک نے بڑے بڑے آتش نوا خطیب سحر نگار، انشا پرداز اور مدبر و مفکر پیدا کئے، اس صوبہ میں صرف سر سکندر حیات کی ایک ایسی شخصیت تھی، جو بڑی حد تک صوبہ کی تمام اقوام میں عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں، سکھ ہوں، مسلمان ہوں، متفق علیہ تھی، سر فضل حسین مرحوم جب گورنمنٹ آف انڈیا سے ریٹائر ہو کر پنجاب پہنچے تو مسلمان بڑی حد تک ان کے جھنڈے کے نیچے آ گئے تھے، لیکن دوسری قومیں طرح طرح کے

خطرات کا اظہار کر رہی تھیں، اس زمانہ میں بھی سر سکندر حیات پر عام طور سے اعتماد کا اظہار کیا جا رہا تھا، انہوں نے اپنے خلوص و وضعداری، شرافت، اخلاص اور سچائی سے صوبہ بھر کو موہ لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ تعاونی اور عدم تعاونی، کانگرسی اور غیر کانگرسی، مسلم اور غیر مسلم سب ان پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اسلامی ہند کے تمام صوبوں میں صرف انہی کی حکومت مضبوط ترین بنیادوں پر قائم تھی، کانگرسی ایڑی چوٹی کا زور لگائیں، احراری لاکھ بل کھائیں، لیکن سر سکندر حیات کی حکومت کو یہ "ملت واحدہ" بھی ڈانواں ڈول نہ کر سکی۔

اس اجتماع میں علی گڑھ کے اولڈ بوائز بھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے، خود سر سکندر حیات خاں علیگ تھے، نواب اسمٰعیل خاں، سر یامین سر ضیاء الدین اور مولینا شوکت علی وغیرہ کی موجودگی نے علی گڑھ کی زندہ دلی بے تکلفی اور اخلاق کی یاد تازہ کر دی، ان میں مولینا شوکت علی پیش پیش تھے، سر یامین بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، سر ضیاء الدین جنہیں عام طور پر خشک مزاج اور بے انتہا سنجیدہ سمجھا جاتا تھا، وہ بھی اپنی زندہ دلی اور شوخ طبعی کا بار بار ثبوت پیش کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک یہاں نشست رہی، مدراس کے ایک ایم۔ایل۔اے آئے تھے، جنہیں سنسکرت زبان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے، موصوف سنسکرت میں شاعری بھی کرتے ہیں، سر یامین کا ان کے لئے بیان تھا، کہ اسمبلی میں بڑے بڑے پنڈت ان کی موجودگی میں اشلوک پڑھتے ہوئے ڈرتے ہیں، اس لئے کہ ناممکن ہے کوئی بڑے سے بڑا مہا مہو پادھیا قسم کا ایم۔ایل۔اے کوئی اشلوک پڑھے اور یہ مدراسی مسلمان اس کی غلطی نہ نکالنے لگے، تلفظ کی، فہم کی، سیاق و سباق کی، ہر طرح کی غلطیاں نکالنے پر یہ ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے فرمائش کی کہ یہ صاحب اپنا سنسکرت کلام سنائیں، اس فرمائش کی انہوں نے تعمیل کی، بڑی دیر تک لوگ ان کے "کلام بلاغت نظام" اور بالخصوص ان کی مدراسی اردو سے محظوظ ہوتے رہے۔

شعیب قریشی

نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

اگست ۱۹۲۸ء میں جمعیتہ مرکزیہ خلافت کا ایک جلسہ محلسرائے فرنگی محل لکھنؤ میں منعقد ہُوا، خلافت کے تمام بڑے بڑے لیڈر اور کارکن شریک تھے، رضاکاروں کی صف میں ان سطروں کا لکھنے والا بھی موجود تھا۔

اجلاس کے دوران میں، ایک صاحب نکل کر کسی کام سے باہر آئے۔ کشیدہ قامت سر پر گھنگریالے بال، سانولا رنگ، صحت و تندرستی کا قابلِ رشک مجسمہ، چوڑی دار پاجامہ، تنزیب کا ایک بیل دار کرتہ، اس پر ململ کا ایک انگرکھا، سر پر اعلیٰ درجہ کی دو پلی ٹوپی، داڑھی منڈھی ہوئی، مونچھیں چڑھی ہوئی، اندازِ گفتگو میں ایک خاص قسم کا وقار اور جاذبیت، میں نے ایک صاحب سے پوچھا، یہ کون صاحب ہیں؟ اُنھوں نے کہا، تم نہیں جانتے؟ مسٹر شعیب قریشی!

یہ نام میں ایک عرصہ سے سُن رہا تھا، لیکن خود اُنہیں دیکھنے کا آج اتفاق ہُوا گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کی ادارت پر فائز رہ چکے تھے، محمد علی کے دستِ راست رہ چکے تھے، آجکل مولانا شوکت علی کے عصائے پیری بنے ہوئے تھے، اور مجلس خلافت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے، لوگ ان کی صورت اور کارناموں کی بنا پر، انھیں ہندوستان کا "انور پاشا" کہتے تھے۔

پھر جب میں بمبئی پہنچا تو مولانا عرفان مرحوم سے ان کی اور بھی بہت سی خوبیاں معلوم ہوئیں، یہ علی گڑھ کے بی، اے اور کیمبرج کے ایم، اے، اور لندن کے بیرسٹر تھے۔ تو یہ چیز میرے لیے کچھ زیادہ مرغوب کن نہ تھی، لیکن یہ معلوم کر کے میں دنگ رہ گیا، کہ خدمت قومی کے سارے دَور میں اس شخص نے قوم کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں ہونے دیا، یہ گاندھی جی کے ساتھ رہے، یہ مولینا محمد علی کے ساتھ رہے، یہ مولینا شوکت علی کے ساتھ

رہے۔ یہ خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہے، لیکن نہ تنخواہ لی، نہ آنریریم، کچھ بچی کھچی جائیداد تھی، اسے بیچ کر اپنا گزارہ کرتے رہے، کام خلافت کا کرتے تھے، کھاتے اپنے پاس سے تھے، اور جب پونجی ختم ہوگئی، تو خدمت قوم سے ایسے دستکش ہوئے کہ اب لوگ ان کا نام بھی بھولتے جاتے ہیں:

نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

نواب صاحب بھوپال سے زمانہ طالب علمی کی دوستی تھی، لندن میں ان سے ملاقات ہوئی اور وہ اپنے ساتھ ریاست کا وزیر بنا کر انہیں لندن کے "دارالہجرت" سے واپس لائے۔ قوم کے خدمت گزار، علانیہ تم پر اپنا بوجھ ڈالتے ہیں۔ لیکن شعیب صاحب کی خودداری اور غیرت نے میرے دل میں اُن کی عزت اور عظمت پیدا کر دی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج تک میری اور شعیب صاحب کی ملاقات نہیں ہوئی ہے حالانکہ وہ اکثر بمبئی آتے رہتے تھے، زیادہ تر خلافت ہاؤس میں شوکت صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے۔ میں خلافت کا ایڈیٹر تھا، شوکت صاحب کا ہمنشین تھا، کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے اور شعیب صاحب نے ایک میز پر شوکت صاحب کے ساتھ کھانا کھایا ہے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں مولینا عرفان کے پاس بیٹھا ہوا ہوں، اور شعیب صاحب تشریف لاتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے ہیں اور پھر بھی میں شرف ملاقات سے محروم ہی رہا، وہ آئے اور لوگ ان کے استقبال میں لگ گئے اور میں اس ہجوم عاشقاں سے ہٹ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا، بیشک شعیب صاحب بہت بڑے آدمی ہیں، بھوپال کے وزیر ہیں، شوکت صاحب کے بھتیجے ہیں، محمد علی کے خویش ہیں لیکن اگر وہ اسلام میں سبقت نہیں کرتے تو میں کیوں کروں؟ وہ مصافحہ کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاتے تو میں کیوں بڑھاؤں، ایک شخص بڑا آدمی نہ ہوا پھر بھی وہ خوددار تو ہو سکتا ہے؟ بس یہ کمی تھی، جو حجاب بن کر حائل رہی میں خلافت ہاؤس میں چھ سال تک رہا، اور اس مدت میں سینکڑوں بار شعیب صاحب نے مجھے اور میں نے انہیں دیکھا، پھر بھی اجنبیت قائم رہی: وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں!

اجنبیت قائم رہے، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ان کے کردار بلند کی میرے دل میں عزت ہے۔ اب وہ کافی کما چکے ہیں، کاش خدا انہیں توفیق دے کہ وہ سیاسیات ملی میں پھر کمی حصہ لینے لگیں!

مولانا ظفرؔ علی خان

تحریک نجد سے لے کر تحریک نیلی پوش تک

آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں مولینا ظفر علی خاں خاص طور پر نمایاں ہو گئے تھے وہ خلافت کے نمائندہ بن کر حجاز پہنچے، لیکن سلطان ابن سعود کے سامنے پہنچ کر، خلافت کی نمائندگی کے بجائے، اپنے جذبات کی نمائندگی کرنے لگے، مجلس خلافت حجاز مقدس میں "منہاج خلافت راشدہ" پر ایک نظام حکومت مرتب کرنا چاہتی تھی جس میں سارے عالم اسلام کی نمائندگی ہو، مولینا ظفر علی خاں ان تکلفات کے قائل نہیں تھے، سلطان ابن سعود کو "ملک الحجاز والنجد و ملحقاہا" تسلیم کر لیا، اور واپس چلے آئے۔

قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود!

یہاں آ کر خلافت والوں نے اعتراض کیا، تو ان سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اسی زمانہ کا قصہ ہے، کہ وہ لکھنؤ تشریف لائے، طلبہ کی انجمن الاصلاح کی طرف سے انہیں ندوہ میں مدعو کیا گیا، تشریف لائے، بڑا سا قد، خشخشی داڑھی، بال کچھ سفید کچھ سیاہ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی، گفتگو کا ایک خاص انداز، تقریر کا ایک خاص ڈھب، بلند آوازی کے ساتھ ساتھ پاؤں کے انگوٹھے سے لیکر پیشانی تک تمام نامی اور غیر نامی اعضاء جوارح میں ایک حرکت ایک اضطراب، ایک ارتعاش، ایک جنبش، باتوں میں ٹھیراؤ، لہجہ میں تبلیغی رنگ غالب، دارالعلوم کے ہال میں ایک پچھے دار تقریر کی، الاصلاح کے دفتر کا معائنہ کیا، طلبہ کے قلمی رسائل کو خاص طور پر سراہا، پھر جیب سے دس دس روپیہ کے بہت سے نوٹ نکالے، پھر انہیں جیب میں رکھتے رکھتے ایک نوٹ الاصلاح کو نذر کیا، یہ دریا دلی دیکھ کر ناظم الاصلاح نے شکایت کی الاصلاح میں تمام اخبارات طول و عرض ہند سے مفت آتے ہیں، لیکن زمیندار نہیں آتا، وعدہ فرمایا کہ اب زمیندار بھی مفت آیا کرے گا، مولینا کے

لاہور پہنچنے کے بعد یہ وعدہ یاد دلایا گیا، کئی بار یاد دلایا گیا، جب یاد دلایا گیا ہفتہ بھر کے لئے زمیندار جاری ہو گیا، اور پھر صدائے برنخاست!

دوسرے سال کانپور میں ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا مسیح الملک حکیم اجمل خاں صدر اجلاس تھے، اس اجلاس میں شرکت کے لئے بڑے بڑے رہنمایان عظام، علمائے کرام صوفیائے ذوی الاحترام تشریف لائے تھے، مولانا محمد علی مرحوم، ڈاکٹر کچلو، مولینا ظفر علی خاں، شاہ سلیمان صاحب پھلواری، سب ہی تھے۔

مولینا ظفر علی خاں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے ایک گرجدار اور پر زور تقریر فرمائی دوران تقریر میں کچھ ایسے خیالات بھی ظاہر فرمائے جو طبقۂ صوفیا کو ناگوار گزرے شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے، فوراً کھڑے ہو کر احتجاج کیا، اور مطالبہ کیا کہ مولینا اپنے الفاظ واپس لے لیں، لیکن مولانا نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ الفاظ واپس لینے سے "انکار اور قطعاً انکار" کر دیا، اب کیا تھا ایک ہنگامۂ کارزار برپا ہو گیا، شاہ سلیمان صاحب اپنے معتقدین کے ساتھ "واک آوٹ" پر تیار ہو گئے اور مولینا ظفر علی خاں نے نہ صرف اپنے الفاظ واپس لینے سے قطعاً انکار کر دیا، بلکہ نہایت استقلال دیک رنگی کے ساتھ وہی الفاظ باربار دہرانے لگے، قریب تھا کہ اسی ہنگامہ کارزار میں جلسہ برخاست ہو جائے کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے کھڑے ہو کر پہلے تو مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی، پھر مولینا ظفر علی خاں نے کہا "آپ کا وقت ختم ہو گیا!" یہ سن کر وہ اپنے الفاظ سابق دہراتے ہوئے اپنی نشست پر آ کر متمکن ہو گئے، پھر حکیم صاحب نے بہ حیثیت صدر کے شاہ سلیمان صاحب سے معذرت کی، اور مولینا ظفر علی خاں کے الفاظ واپس لے لئے۔

۳۶ء میں فلسطین کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی، میں بھی اس میں شریک ہونے کے لئے دہلی گیا، دریا گنج میں مولینا شوکت علی اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم تھے، میں بھی انہی کے ساتھ ٹھہرا، اسی عمارت کے دوسرے بلاک میں مولانا ظفر علی خاں ٹھہرے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مولینا "نیلی پوش" تھے، خود بھی نیلے رنگ کی قمیض پہنتے تھے، اور اپنے رضاکاروں کی وردی بھی انہوں نے یہی مقرر کی تھی، مولانا تحریک نیلی پوش (مسولینی کی تحریک سیاہ پوش کے جواب میں؟) کے علمبردار تھے۔

ایک روز میں نے سویرے سویرے دیکھا، کہ مولینا اپنے چند حواریوں کے ساتھ پسینہ

میں شرابور، ہانپتے تشریف لا رہے ہیں، ایک رفیق سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا، کہ مولینا ہر روز صبح کو کئی میل پاپیادہ چلتے ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ "ساٹھے پاٹھے" نظر آ رہے ہیں، حیرت ہوئی، کہ مسلمان رہنماؤں میں بھی کچھ ایسے ہیں جو اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں!

مولانا ظفر الملک علوی

چہ گردن کشاں رانسر انداز خم

مولینا محمد علی مرحوم انہیں "الدرحق والے بھائی ظفر الملک" کہا کرتے تھے، لوگ کہتے ہیں "الحق مر" یعنی سچ کڑوا ہوتا ہے، یہ سمجھتے ہیں "المر حق" یعنی کڑواہٹ ہی سچائی ہے، لوگ اصولی جنگ لڑتے ہیں، یہ اصول کے ساتھ ذاتیات کی جنگ بھی خوب لڑتے ہیں، بلکہ اس طرز جنگ میں ان کا کوئی حریف نہیں، عام طور پر ذاتیات کی جنگ لڑنے والے بلیک میلر ہوتے ہیں، ان کا دامن اس آلودگی سے بالکل پاک ہے، ان کی دیانت، راست بازی اور حق گوئی شک و شبہ سے بالاتر ہے، پھر بھی یہ ذاتیات کی جنگ لڑتے ہیں، اور اس خوبی سے کہ بلیک میلر بھی پکار اُٹھیں۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے!

علامہ شبلی کی دستار اُنہوں نے اچھالی، مولینا عبدالباری فرنگی محل کے قصر تقدیس پر اُنہوں نے گولہ باری کی، مہاراجہ محمود آباد کی کلاہ شہریاری پر اُنہوں نے ڈھول پھینکی، علی برادران کے کئی کئی گز لمبے چوڑے دامنوں پر اُنہوں نے حملے کیلئے مولانا ابوالکلام آزاد کی تردامنی پر اُنہوں نے شبخون مارا، مولینا ظفر علی خاں کو اُنہوں نے یکے از اقوام جرائم پیشہ ثابت کیا، خواجہ حسن نظامی کے رین بسیرے پر اُنہوں نے چاندماری کی، پھر ذاتیات سے "قومیات" پر آئے تو شیعوں کو اُنہوں نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مختصر یہ کہ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

ان کی جنگ کا سب سے بڑا کمال اور وصف یہ ہے کہ آج تک یہ کسی سے "اپنے" لیے نہیں لڑے، اپنے "مفاد" کیلئے کسی سے دشمنی نہیں کی، جسے قوم کے راستہ میں حائل ہوتے دیکھا، جس کی غلط روی اور غلط کاری کا یقین ہوگیا، جس کے کردار اور عمل میں ــــــ اپنے

نقطۂ نظر سے ـــــ خامی اور کوتاہی پائی، اس سے اعلان جنگ کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگائی، پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ طبل جنگ بجاکر، فوراً بزن اور بکش کے نعرے لگاتے ہوئے میدان میں کود پڑے، جیت ہوئی یا ہار اس مسئلہ پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔

جس کسی کے خلاف انہوں نے اعلان جنگ کیا، اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر عرض کر دیا۔

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

لیکن مولانا محمد علی، مولانا محمد علی تھے، انہیں بھی ان سے کم اپنی رائے کی صحت و دیانت پر بھروسہ نہ تھا، جب یہ اُن سے اُلجھے، تو وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے میدان میں کود پڑے، یہ مہینہ بھر میں ایک مرتبہ الناظر کا "نظرے خوش گزرے" لکھتے تھے، اور وہ روزانہ ہمدرد میں دس دس اور بارہ بارہ کالم تک لکھے ہوئے رکھتے تھے یہ کنکر پھینکتے تھے، وہ پتھر لڑھکا دیتے تھے، یہ چٹکی لیتے تھے، اور وہ بکوٹا لیتے تھے، یہ ان کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے وہ ان کا ہاتھ پکڑتے تھے اور مروڑ دیتے تھے، یہ انہیں مغلوب الغضب کہتے تھے وہ انہیں "المرحق" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

اب دونوں کے اخلاص و دیانت کا کمال دیکھئے، علاج کے سلسلہ میں جب مولانا محمد علی یورپ ۱۹۲۸ء میں گئے تو ہمدرد کی عنان انتظام ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے، جب وہ واپس آئے تو ہمدرد انہیں سونپ کر یہ پھر ان کے خلاف میدانِ کارزار میں کود پڑے، پھر لندن کی گول میز کانفرنس میں ایک معرکہ آرا تقریر کرنے کے بعد جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوگیا تو اس حادثہ جانکاہ پر پھوٹ پھوٹ کے رونے والا ان کا یہی مخالف ظفر الملک تھا، میں نے خود یہ منظر اپنی آنکھوں سے الناظر کے دفتر میں دیکھا ہے، مجھے حیرت ہو رہی تھی جو شخص محمد علی کی سیاست کے ساتھ ساتھ ذات کے خلاف اپنی زبان و قلم کو وقف کئے ہوئے تھا، وہ آج اس طرح پھپک پھپک کر کیوں رو رہا ہے؟ دل نے کہا، اختلاف محمد علی کی سیاست سے تھا، محمد علی سے تھا، لیکن محمد علی کی قربانیوں سے نہ تھا، محمد علی کی صداقت اور دیانت سے نہ تھا، محمد علی کی سچائیوں اور کارناموں سے نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اختلاف کے باوجود دل محبت سے چور تھا، یہ آنسو جھوٹے آنسو نہ تھے، سچے آنسو تھے۔

فیروز خان نون

سرکاری خطابات کو ٹھکرا دینے والا منچلا!

ہندوستانی سیاسیات میں ملک فیروز خاں نون کا نام اتنا مشہور ہو چکا ہے، کہ کوئی پڑھا لکھا شخص اس نام سے ناواقف نہیں ہے، ایک انسان جتنی سربلندیوں کی توقع کر سکتا ہے، وہ تقریباً سب کی سب انہیں حاصل ہو چکی ہیں، مانٹیگو چیمسفورڈ اصطلاحات کے سلسلہ میں جب مجالس آئین ساز قائم ہوئیں، تو پنجاب کے وزراء میں ان کا نام بھی تھا، ہندوستان کے تمام وزیروں میں شائد سب سے زیادہ کمسن یہی تھے، اس وقت سے لیکر ۱۹۴۵ء تک ان کا قدم برابر آگے کی طرف بڑھتا رہا، لندن میں کئی سال تک ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی رہے، اور اس قابلیت سے کام کیا، کہ سب نے داد دی، پھر جب سر سکندر حیات مرحوم نے ان کی واپسی سے خطرہ محسوس کیا، تو لڑ جھگڑ کر انہیں وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر بنایا، اس منصب پر ۱۹۴۵ء کے آخر تک فائز رہے، زندگی بھر سرکاری خدمت کی اور اس وفاداری کے ساتھ کی کہ اگر انہیں "فرزند دلبند سلطنت انگلشیہ" کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا!

وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں بھی ان کا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا، مسلم یونیورسٹی میں ایک تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے صاف الفاظ میں پاکستان کی حمایت کی تھی، جس پر ہندو اخبارات نے بڑا شور مچایا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب یہ وائسرے کی اگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شریک ہوئے تو بہت سے لوگوں کو ان کے خلوص پر شک تھا، عام خیال یہ تھا کہ پنجاب کی وزارت عظمیٰ کی یہ تیاریاں ہیں، لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ خیال غلط تھا، یہ خلوص دیانت اور سچائی کے ساتھ مسلم لیگ میں شریک ہوتے تھے، بے غرضی، بے لوثی، اور جاہ و منصب کی تمنا سے بے نیاز ہو کر میدان میں آئے تھے ایثار قربانی اور بڑی سے بڑی متاع لٹا دینے

کیلئے رزمگاہ سیاست میں کود رہے تھے، انقلابی اور مجاہد بن کر آئے تھے۔

نئے انتخابات کے بعد، پنجاب میں مسلم لیگ کو ۹۵ فیصدی کامیابی حاصل ہوئی بظاہر اس کا پورا امکان تھا کہ مسلم لیگ کی وزارت بنے گی ـــــ اور اگر خضر حیات خاں نے دو تین غداروں کو ملا کر، کانگرس سے سازش نہ کرلی ہوتی تو بن بھی جاتی ـــــ اب سوال پیدا ہوا مسلم لیگ پارٹی کی قیادت کا، اپنے حیرت انگیز اور فقید المثال خدمات کے اعتبار سے خاں ممدوٹ سب سے زیادہ مستحق تھے کہ لیڈر بنائے جائیں، اپنے تجربہ، رسوخ اور اثرات کے اعتبار سے یہ بھی کم مستحق نہیں تھے کانگرسی اخبارات میں اس "کشمکش" کی داستان نمک مرچ لگا لگا کر شائع کی جا رہی تھی، یہاں تک کہ وہ دن آیا، جب مسلم لیگ پارٹی کا جلسہ لیڈر کے انتخاب کیلئے منعقد ہوا، مخالفین بھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ سر فیروز خاں نون اٹھے، اور خان ممدوٹ کا نام لیڈری کے لئے پیش کر دیا، جن لوگوں کو یہ یقین تھا، کہ اگر لیڈر نہ منتخب ہوئے تو یہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں گے، وہ یہ دیکھ کر کہ یہ خود ہی خان ممدوٹ کا نام پیش کر رہے ہیں، حیران و ششدر رہ گئے۔

پھر اپنی پوری فتنہ طرازیوں، اور شر انگیزیوں کے ساتھ کابینہ وفد پیتھک لارنس وزیر ہند کی قیادت میں ہندوستان آیا، ممبران وفد کا رجحان شروع ہی سے پاکستان کے خلاف تھا، دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں پاکستان پر غیر متزلزل ایقان کا اعلان کیا گیا، مقررین میں سر فیروز خاں نون بھی تھے، انہوں نے ایسی پُر جوش، معرکہ آرا اور ہنگامہ خیز تقریر کی، کہ یہ معلوم ہو رہا تھا، جیسے پرکاش نرائن بول رہا ہے، برطانوی حکومت کے خلاف، اس کی سامراجی پالیسی کے خلاف، اس کی شر انگیز حکمت عملی کے خلاف، فیروز خاں نون نے جو آتشیں تقریر کی، وہ آج بھی فضا میں گونج رہی ہے، اور بزم و انجمن میں آج اس کا چرچا ہے۔

پھر وہ وقت آیا، کہ کابینہ وفد نے مسلمانوں کو دھوکا دیا، وائسرائے نے مسلم لیگ اور قائداعظم سے وعدہ شکنی کی، اور مسلم لیگ، مجبور ہوئی، کہ اپنا تعاون کا فیصلہ واپس لے اور اقدام عمل کی تیاریاں شروع کرے، بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ مسٹر جناح کی زیر صدارت منعقد ہوا، اس جلسہ میں بھی سر فیروز خاں نے، ایک دلچسپ پُر مغز اور جوشیلی تقریر کی، تقریر انگریزی میں تھی لیکن نہایت شائستہ اور ستھری "پاکستان ورنہ کچھ نہیں"! اس جملہ پر تقریر ختم کی، اور بیٹھ

گئے اگرا پنی جگہ، میں نے اپنے دل میں کہا، یہ شخص جو ایسی انقلابی، اور جوشیلی تقریریں حکومت برطانیہ کے خلاف کر رہا ہے، اس سے یہ امید تو ہو سکتی ہے کہ سر کا خطاب اور دوسرے خطابات واپس کر دے، پھر دوسری قربانیوں کی اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

اتفاق سے اسی دوسرے روز کونسل نے ترکِ خطابات کی تجویز منظور کی، تو پورے انشراحِ قلب اور نشاطِ خیال کے ساتھ یہ شخص اٹھا، اور بغیر کسی تامل کے اسٹیج پر آ کر اعلان کر دیا، کہ میں اپنے تمام خطابات سے دستبردار ہوتا ہوں، اس اعلان کا اتنا پُر جوش خیر مقدم مجمع نے کیا کہ کئی منٹ تک چیئرز دیئے جاتے رہے، جس دل میں اب تک یہ شخص جگہ نہ حاصل کر سکا تھا، آج یہ اس کا مکین بن گیا!

لیاقت علی خان

مسلم لیگ کے دورِ جدید کا ہیرو

بہت دنوں کی بات ہے، ایک روز ندوہ کے چند دوستوں نے رفاہ عام چلنے پر اصرار کیا، جاڑے کا موسم تھا، اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، میں نے انکار کیا، لیکن وہ نہ مانے اور مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے، آج رفاہ عام میں آل انڈیا بزم مشاعرہ مرتب ہوتی تھی، اور ہندوستان کے نامی گرامی شعرا، جن میں جوش ملیح آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، شرکت کیلئے اطراف و اکناف ہند سے تشریف لاتے تھے، سب سے پہلے صدر صاحب اسٹیج پر نمودار ہوئے، چھریرا بدن، موزوں قد، گفتگو میں شائستگی، انداز میں وقار، وضع و لباس میں ثقاہت انہوں نے بڑے ستھرے انداز میں اپنا تحریری خطبۂ صدارت سنایا، خطبۂ صدارت سے زیادہ ان کی شخصیت، اور ان کا اندازِ تکلم کشش انگیز تھا ——— یہ تھے یو۔ پی لیجسلیٹو کونسل کے نائب صدر، نواب زادہ لیاقت علی خاں،

نواب زادہ کا شمار ہندوستان کے عافیت پسند سیاست دانوں میں تھا اپنے حلقہ میں وہ بہت مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ان کی سیاست، اسمبلی کے ایوان اور اخبارات کے صفحات تک محدود تھی، پبلک سے عوام سے، انہیں کوئی تعلق نہ تھا، پھر ۳۵ء میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا، یہیں سے مسلم لیگ کا دورِ جدید شروع ہوتا ہے، قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح نے نوابزادہ کی صلاحیت اور اہلیت کو بھانپ لیا، اور بمبئی میں، لیگ کے نئے عہدے داروں کا جو انتخاب ہوا، اس میں مسلم لیگ کی سکریٹری شپ نواب زادہ کو تفویض ہوئی، اہلِ دل نے کہا یہ انتخاب کچھ یونہی سا ہے، وقت اور حالات کا تقاضہ یہ ہے، کہ یہ منصب کسی پُرجوش اور فعال آدمی کے سپرد کیا جائے، مسٹر جناح نے انہیں منتخب کر لیا،

سخن فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد

لیکن جیسے جیسے ملت اسلامیہ بیدار ہوتی گئی، اور مسلم لیگ انقلاب کی منزل کی طرف بڑھتی گئی، یہ عافیت کوش سیاستداں بھی برابر آگے بڑھتا رہا، اُس نے نہایت نازک زمانہ میں مسلم لیگ کی عنانِ انتظام ہاتھ میں لی، اور بہت جلد اسے صحیح معنی میں ایک انقلابی اور عوامی جماعت بنا دیا، انسان کو خود اپنی بہت سی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن وقت کا دھارا کبھی کبھی انہیں اُچھال دیتا ہے، تو دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے، اور وہ اعتراف کرتے ہیں۔

خود غلط بود آنچہ پا پندا شتیم

نوابزادہ کا انتخاب، آغاز میں کتنا نامبارک تھا، لیکن اس کا انجام کتنا مبارک و مسعود ثابت ہُوا، اس کا اندازہ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، خود نوابزادہ کو بھی نہ ہوگا۔

پھر جولائی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل بمبئی میں منعقد ہوئی، اور اس نے ترکِ خطابات کا فیصلہ کیا، نوابزادہ خطاب سرکاری خطاب نہ تھا، خاندانی تھا، اور شاہی وقت سے چلا آرہا تھا، لیکن جب دوسرے لوگ اپنے خطابات واپس کر رہے تھے، نوابزادہ کی حمیت نے اسے گوارا نہ کیا، کہ وہ اپنے نامِ نامی کے ساتھ خطاب کا رشتہ قائم رکھیں، چنانچہ وہ مائک پر آئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگرچہ میرا خطاب سرکاری نہیں ہے، لیکن میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں، آج سے آپ مجھے صرف "لیاقت علی خاں" کہیے، حاضرین نے شورِ مسرت سے ہال سر پہ اُٹھا لیا، اور لوگوں نے یقین کر لیا، یہ عافیت کوش سیاستدان مردِ میداں بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ پھر "ڈائرکٹ ایکشن" کی مہم زیرِ غور آئی، تو اس اسکیم کے واضعین میں سرِفہرست وہی شخص تھا، جو اب نوابزادہ کے بجائے "مسٹر" رہ گیا تھا، اور اس پر خوش تھا۔

خلیق الزماں

تحریکِ خلافت، کانگرس اور مسلم لیگ کا ستون

تقریباً بیس برس پہلے کی بات ہے لکھنؤ میں ایک خونریز ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہندو کا چھرا مسلمان کی پیٹھ میں پیوست ہو رہا تھا، اور مسلمان کا خنجر ہندو کے سینہ میں اپنی جگہ بنا رہا تھا شہر کا امن و امان درہم برہم ہو چکا تھا، اور دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف اور منافرت کے نہایت شدید جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد باہمی تعلقات کو استوار کرنے کی غرض سے امین الدولہ پارک میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ اسٹیج پر صدر کی حیثیت سے ایک نازک اندام شخص نمودار ہوا، سر پر کشتی نما ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ، اور جامہ زار کی شیروانی معلوم ہوتا تھا، کہ لکھنؤ کا کوئی بانکا کھڑا ہے، نازک اتنا کہ ایک ایک جنبش میں کمر سو سو بل کھاتی تھی، لیکن آواز میں زور بھی اور جوش بھی، اور ان دونوں سے زیادہ کشش اور مقناطیسیت! —— تقریر میں نہ ہندوؤں کی ستائش تھی نہ مسلمانوں کی توصیف، درندگی اور بربریت کے کارناموں پر، یہ بلند آہنگ خطیب، ہندوؤں کو بھی للکار رہا تھا، اور مسلمانوں کو بھی، لیکن تقریر اتنی مؤثر اور معرکہ آرا تھی، کہ کل کے جنگ جو آج، پیکر امن و امان بنے ہوئے خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ متاثر بھی ہو رہے ہیں۔

یہ صدر محترم، لکھنؤ کی مجلس خلافت اور کانگرس کمیٹی کے روح رواں چودھری خلیق الزمان تھے، جو اب تک حکومت سے ترک موالات کئے ہوئے تھے، گوناگوں الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود اپنے عزم پر قائم تھے، کہ بدیشی عدالت میں وکیل کی حیثیت سے نہیں جائینگے

پھر کئی برس کے بعد لکھنؤ کی مجلس خلافت کی باگ، مولینا ظفر الملک علوی کے ہاتھوں میں آگئی انھوں نے نئی مجلس عاملہ جو بنائی، اس میں ندوہ کے ایک طالبعلم کو بھی لیا، اور وہ میں تھا۔ مجلس خلافت کی مجلس عاملہ کے جلسے یا تو فرنگی محل میں مولینا محمد شفیع صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوتے

تھے، یا خیالی گنج میں چودھری صاحب کے مکان پر۔

ایک مرتبہ مجلس عاملہ کا جلسہ چودھری صاحب کے مکان پر ہو رہا تھا، مولینا ظفر الملک، مولینا عنایت اللہ فرنگی محل چودھری صاحب اور دوسرے ممبران موجود تھے، یہ وہ زمانہ تھا، کہ چودھری صاحب میں، اور علی برادران میں سیاسی اختلاف شروع ہو چکا تھا، چودھری صاحب نہرو رپورٹ کے سرگرم حامیوں میں تھے اور علی برادران اس کے سخت ترین مخالف، کلکتہ میں خلافت کا سالانہ جلسہ منعقد ہونے والا تھا، اور تمام خلافت کمیٹیوں کو ہدایت کی گئی تھی، کہ وہ اپنا مجوزہ نام صدر دفتر کو جلد از جلد بھیج دیں، یہ جلسہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا، متعدد اصحاب اپنے اپنے پسندیدہ ناموں کی فہرست اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن چودھری صاحب نے مولانا محمد علی کا نام پیش کر کے اپنے مخالفوں کو حیرت زدہ اور اپنے حامیوں کو برہم کر دیا، اور بالآخر یہی نام منظور ہوا، سخت ترین سیاسی اختلاف کے زمانہ میں بھی، اتنی سلامت روی اور رواداری کا مظاہرہ، واقعی تعجب انگیز تھا۔

مسٹر آصف علی

آئے تو یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

جامعہ ملیہ میں توسیعی لیکچروں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اُردو اکاڈمی کی طرف سے ایک دلچسپ سلسلہ مباحثوں کا شروع کیا تھا، توسیعی لیکچر، بین الاقوامی ہستیوں سے دلوائے جاتے تھے، اور مباحثوں میں ہندوستان کے بہترین دل و دماغ حصہ لیا کرتے تھے، مباحثہ کی صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ "ایوان" کے سامنے کوئی موضوع پیش کیا جاتا تھا، کچھ لوگ اس کی موافقت کرتے تھے، کچھ مخالفت، پھر حاضرین سے رائے لی جاتی تھی، اور وہ موافقین و مخالفین میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرتے تھے، حاضرین میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ دوسرے کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ بھی کافی تعداد میں شریک ہوتے تھے،

اس سلسلہ کے پہلے مباحثہ نے بڑی رونق اور گہما گہمی پیدا کر دی تھی، ایک طرف شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے، دوسری طرف مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل خواجہ غلام السیدین صاحب دونوں ذہن و دماغ کے اعتبار سے اسلامی ہند کے آفتاب و ماہتاب، دونوں ناقابل شکست دلائل کے حربوں سے آراستہ، دونوں حسن زبان اور زور بیان کے ماہر، دونوں فصاحت اور بلاغت میں یکتا، مباحثہ ہوا اور اتنے زور شور کا ہوا کہ رائے شماری کی نوبت بھی نہ آسکی، شور تحسین اور غلغلہ آفرین میں جلسہ برخاست ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد، دوسرے مباحثہ کا اردو اکادمی کی طرف سے اعلان ہوا پہلے مباحثہ کا رنگ جو لوگ دیکھ چکے تھے، یا اس کی کیفیت جو لوگ سن چکے تھے، وہ جوق جوق شرکت کیلئے پہنچ گئے، وقت مقررہ سے پہلے تعلیمی مرکز نمبر ا کا ہال کھچا کھچ بھر گیا! آج کے مباحثہ میں ایک فریق مسٹر آصف علی تھے، دہلی کے مشہور بیرسٹر، اُردو کے مشہور ادیب!

مسٹر آصف علی اسٹیج پر آئے، چوڑی دار پاجامہ، نیچی شیروانی، کشتی نما ٹوپی، آنکھوں پر

طلائی فریم کی عینک آویزاں، دُبلے اتنے جیسے مجنوں کی پسلیاں، نازک اتنے جیسے لیلیٰ کی انگلیاں، ملائم اتنے جیسے حریر، کمر میں لچک، آواز میں لچک، انداز و اطوار اور حرکات و سکنات میں لچک، اسٹیج پر آتے ہی، ایک ادائے خاص کے ساتھ عینک ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں لے لی، اور پھر ذرا پیچھے ہٹ کر، اور فوراً کچھ آگے بڑھ کر مشہور مزاحیہ اداکار مرزا مشرف کے پوز میں، مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، اور تقریر اچھی تھی، لیکن جذبات سے مملو اور دلائل سے خالی۔

یہ مجمع کسی مکتب کے بچوں کا نہ تھا، کسی اسکول کے لڑکوں کا نہ تھا کہ مولوی صاحب یا ماسٹر صاحب جو کچھ فرمائیں، طفلانِ نو آموز سرِ تسلیم خم کر دیں۔

یہ مجمع تھا، اصحابِ علم کا، اربابِ فکر و نظر کا۔

یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ حاضرین میں سے چند لوگوں نے اعتراض و ایراد کی بوچھاڑ شروع کر دی، ان لوگوں کو غلط فہمی تھی کہ مسٹر آصف علی ایک علمی مجمع میں دادِ خطاب دے رہے ہیں، نتیجہ یہ ہوا، کہ دو ایک اعتراضات، تو موصوف نے برداشت کر لئے، جب یہ سلسلہ بڑھا تو پہلے پیشانی پر شکنیں پڑیں، پھر چہرہ باصفا پر خون کی سرخی نمودار ہوئی، اور اس کے بعد ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

دفعتہً مسٹر آصف علی نے ایک کامیاب اور ماہرِ فن رقاصہ کی سی تیزی اور پھرتی سے اسٹیج کا گشت لگایا اور پھر گستاخ معترضین کو اس طرح ڈانٹا جیسے اسمبلی میں مخالف پارٹی کا لیڈر بالائی توق سرکاری ممبران کی خبر لیتا ہے، معترضین خاموش، مجمع ساکت، جلسہ برخاست!

راقم الحروف کی آج کے مباحثہ میں بھی نہیں ہوئی لیکن پہلے مباحثہ کا جلسہ غلغلۂ تحسین آفریں میں ختم ہوا تھا، اور یہ جلسہ خاموشی کے ساتھ برخاست ہو گیا —— معنی خیز خاموشی کے ساتھ!

مس امت السلام

من نکردم شما حذر بکنید

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس نے اپنی مشہور تجویز کوئٹ انڈیا منظور کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی سمیت کانگریس کے تمام بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لئے گئے صرف وہ لوگ باقی رہ گئے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہیں تھے، یا عملی طور پر خلاف آئین سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے، انہی لوگوں میں ایک ہستی گاندھی جی کی مشہور چیلی مس امت السلام بھی تھی۔

ملک میں شورش کا ایک طوفان برپا تھا، ہر صبح ایک نئی قیامت کی خبر لاتی تھی، اور ہر شام ایک نئے فتنہ کی پیامبر ہوتی تھی، ملک کا امن و امان رخصت ہو چکا تھا، ایک عجیب طوائف الملوکی چھائی ہوئی تھی، کاروبار میں وہ کامیاب تھے، جن کے پاس کافی سرمایہ تھا۔

میں اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہندوستان نکال رہا تھا کس طرح نکال رہا تھا، یہ میرا دل ہی جانتا تھا، سرمایہ نایاب، سرمایہ حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع مفقود بعض اصحاب اغراض سے ان کی بے آئینیوں اور ملت کش سرگرمیوں کے سبب میں خطرات میں محصور ہو کر ٹکر لے رہا تھا، وہ مخالفت پر تلے ہوئے تھے، وہ جائز و ناجائز ذرائع سے مجھے اور میرے اخبار کو تباہی کے غار میں پہنچانے کے درپے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ کی نایابی اور وسائل و ذرائع کی کمیابی کے سبب مجھے خسارہ پر خسارہ آنے لگا، اور میرا ذریعہ معاش تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا۔

مولانا محی الدین قصوری، میرے ایک دیرینہ کرمفرما ہیں، انہوں نے اصرار کیا کہ میں مس امت السلام کے ہفت روزہ اخبار "اتحاد" کی ادارت قبول کر لوں، بالآخر میں راضی ہو گیا، اور میں نے یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی، پر میں نے پہلے سے طے کر لیا تھا کہ اپنے ضمیر اور مسلک کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گا نیز یہ کہ میں پاکستان کا حامی ہوں اور اس کی مخالفت

میں میرا قلم آلودہ نہیں ہوگا، صرف عمومی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دوں گا، مسٹر جناح کی مخالفت میں بھی ایک حرف نہیں لکھوں گا، میرے یہ شرائط منظور کر لئے گئے، اور میں نے کام شروع کر دیا۔

ریٹن روڈ پر اتحاد کا دفتر تھا، دو بجے سے چار بجے تک میرے کام کا وقت مقرر ہوا تھا، پہلے روز میں وقت مقررہ پر اتحاد کے دفتر پہنچا، دفتر میز کرسی سے خالی تھا، چٹائیوں پر سفید چاندنی کا فرش تھا، اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کھدر کے غلاف میں ملبوس تکیے رکھے ہوئے تھے صدر میں ایک صاحبہ نظر آئیں، سیاہ رو، پستہ قد، آنکھیں حجاب نسوانی سے، اور سر دوپٹہ سے محروم، کھدر کی ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی رونق افروز تھیں، یہی امت السلام تھیں۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، پھر انہوں نے خط شکستہ میں لکھے ہوئے بہت سے انگریزی خطوط میرے حوالہ کر دیئے کہ ان کا ترجمہ کر دیجئے، یہ ملک کے سربرآوردہ اصحاب نے مجھے بیانات کی صورت میں بھیجے ہیں، اور اتحاد کے پہلے نمبر میں شائع ہوں گے۔

میں نے ان خطوط کا ترجمہ کر دیا، دوسرے روز جو مجلس جمی اس میں یہ سوال پیدا ہوا، کہ پہلے صفحہ پر کونسا مضمون دیا جائے، میں نے کہا، پہلے نمبر کے پہلے صفحہ پر "دعا" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیجئے، جس میں اپنے اغراض و مقاصد کا اظہار کر کے خدا سے استقامت اور استقلال کی دعا کیجئے، قصوری صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، انہوں نے بھی تائید کی، چنانچہ دوسرے روز میں ایک مؤثر مضمون اسی عنوان پر لکھ کر لایا، قصوری صاحب آج بھی تشریف رکھتے تھے، انہوں نے بھی اس مضمون کو بہت سراہا۔

لیکن مس صاحبہ نے فرمایا   دعا کسی اور صفحہ پر یا کسی اور نمبر میں دیکھی جائے گی، میں تو پہلے نمبر کے پہلے صفحہ پر "باپو" مسٹر گاندھی کا خط شائع کروں گی، جو انہوں نے فلاں موقع پر مجھے لکھا تھا، میں نے قصوری صاحب نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ اسے نہ شائع کیجئے، اور دعا والا مضمون شائع کیجئے، لیکن وہ نہ مانیں اور بالآخر اپنے باپو کے خط کو انہوں نے افتتاحیہ بنا کر، حصول برکت و سعادت کے لئے شائع کر دیا۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

میں بھی خاموش ہو گیا، اور قصوری صاحب بھی۔

"امتل" بہن سے ملنے کیلئے نئی نئی اسکیمیں وضع کرنے کے لئے۔ اور ان اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے شہر کی معروف اور غیر معروف مسلم کم غیر مسلم زیادہ کانگرسی خواتین تشریف لایا کرتی تھیں، آنے والے مردوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی، رفتہ رفتہ اتحاد کا دفتر مرکز صاحب نظراں بن گیا، قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ قلب و جگر، دیدار و انتظار، اشتیاق و اضطراب، سوز و ساز، اور روح و نظر کے معاملات و مسائل بھی طے ہونے لگے "امتل" بہن اگرچہ چشم بددور دنیا کی ۴۵-۴۰ بہاریں دیکھ چکی تھیں، لیکن بچوں میں بچہ، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھا بننا انہیں خوب آتا تھا!

امتل بہن کی مالی امداد جی کھول کر غیر اردو داں نے، ان کے اردو اخبار کیلئے کی، اس معاملہ میں اگر وہ "دست غیب" کی حامل کہی جائیں، تو مبالغہ نہیں ہوگا، جتنے روپیہ کی ضرورت ہو، ان کا اخبار ہفتہ وار تھا، لیکن اس کے مصارف ایک بلند پایہ روزنامہ سے کم نہیں تھے، ان مصارف کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ دفتر کے چپراسی، کلرک غرض جملہ اسٹاف کو شکایت تھی، کہ روپیہ پیسہ کی افراط کے باوجود نہ تنخواہ واجبی ملتی ہے، نہ وقت پر ملتی ہے، نہ خوش دلی کے ساتھ ملتی ہے۔

میں نے یہ دیکھا کہ امتل بہن گاندھی جی کے سایۂ عاطفت میں رہنے کے باوجود اونچ نیچ کی بری طرح قائل ہیں، وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملنے والوں کو خدا کا رشتہ دار سمجھتی تھیں، اور اپنے دفتر کے کم استعداد اور کم تنخواہ اور کم نصیب لوگوں کو نگاہِ حقارت سے دیکھنے، اور ناگفتہ بہ الفاظ سے یاد کرنے کی عادی تھیں، میں نے اس حرکت پر انہیں کئی بار ٹوکا، ایک مرتبہ میرا لب و لہجہ زیادہ سخت ہو گیا، اور میں کہہ کر چلا آیا کہ آپ کو ابھی کسی آشرم میں رہ کر مزید تربیت حاصل کرنی چاہیئے، پھر رہنمائی کرنے کا شوق پورا کیجئے۔

جواہر لال نہرو

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

ابتدائے سن و شعور ہی سے کانگرس کے لیڈروں میں مجھے سب سے زیادہ جس لیڈر سے عقیدت تھی، وہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے، یہ وہ لیڈر تھا، جو اس لئے لیڈر نہیں بن گیا تھا، کہ لیڈر باپ کا بیٹا تھا، بلکہ اپنی قابلیت، اپنے ایثار، اپنی قربانی، اور اپنی جفاکشی کی بدولت لیڈر بنا تھا، اور بہت جلد صف اوّل کے لیڈروں میں اس نے ایک نمایاں اور ممتاز جگہ بنالی تھی۔

یہ وہ لیڈر تھا، جس کا ذہن و دماغ انقلابی تھا، جس کے خیالات ورجحانات انقلابی تھے، جس نے ابھی ایک سال پہلے یعنی ۱۹۲۷ء کے اجلاس کانگرس (مدراس) میں ماسکو سے واپس آکر ایک انقلابی تجویز محمد علی کے ہشکانے سے پیش کی تھی اور انہی کی تائید سے منظور کرائی تھی، اب تک کانگرس کا نصب العین آزادی زیر سایہ برطانیہ تھا لیکن جواہر لال نہرو نے، اسے "کامل آزادی" کا نصب العین اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، یہ انقلاب کوئی معمولی انقلاب تھا؟

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

اس انقلابی لیڈر نے واقعی کانگرس کی، نہ صرف کانگرس کی بلکہ سارے ہندوستان کی دنیا بدل دی تھی۔

لاہور کے مشہور مقدمہ سازش کے ایک ملزم جتندر ناتھ داس نے بھوک ہڑتال کی، حکومت نے توجہ نہ کی اور، بالآخر کئی فاقوں کے بعد وہ مرگیا، آج اس کی لاش، لکھنؤ ہوتی ہوئی، کلکتہ گئی تھی، امین الدولہ پارک میں ایک عظیم الشان جلسہ راجہ صاحب کالا کانکر کی صدارت میں منعقد ہوا، اس جلسہ میں جواہر لال نہرو بھی تقریر کرنے آئے تھے، میں عقیدت سے چور، اور نشہ سے مخمور جلسہ میں پہنچا، میرا محبوب لیڈر تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا، ذرا دیکھنا یہ وہ شخص ہے، جو عیش و

حشرت کی گود میں پلا، جس نے امارت اور ثروت کے آغوش میں آنکھیں کھولیں، جس کے بارے میں غلط طور پر یہ مشہور ہے۔ کہ اس کے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے، جس کے متعلق عام لیکن غلط خیال یہ ہے کہ پرنس آف ویلز کا رفیق درس رہ چکا ہے، جس کا باپ آج بھی دولت کے انبار رکھتا ہے۔ لیکن اسٹیج پر ایک کھدر کا کرتہ، کھدر کی دھوتی، کھدر کی واسکٹ، کھدر کی ٹوپی پہنے کھڑا ہے، کتنا ایثار پیشہ ہے یہ شخص کتنا مخلص ہے یہ اور ہاں اس کی تقریر سنا، ہندی اردو کے قضیہ سے بالا رہ کر صاف اور شستہ اردو میں کتنی دلنشیں اور حیات آفریں تقریر کر رہا ہے۔ مگر جواہر کے منہ سے الفاظ "موتی" بن کر جھڑتے تھے، اور شعلہ بن جاتے تھے، دہکتا ہوا انگارہ بن جاتے تھے، کوہ آتش فشاں کا پھوٹتا ہوا لاوا بن جاتے تھے، یہ نامردوں کو مرد بنا رہا تھا۔ یہ غداروں میں حب وطن کی روح پیدا کر رہا تھا۔ یہ جاہلوں کو درس جمہوریت دے رہا تھا، یہ بندۂ مزدور اور بندۂ دہقان کو حکومت اور ریاست کا پیغام دے رہا تھا۔

پھر سائمن کمیشن آیا: کانگریس اور خلافت نے اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ کل صبح لکھنؤ آ رہا تھا چار باغ کے اسٹیشن پر اسے گوبیک کہنے کے لئے شہریان لکھنؤ جواہر لال کی قیادت میں مجتمع ہوں گے۔ جواہر لال کی قیادت؛ پھر تو مجھے اس جلوس میں، اس مظاہرہ میں شریک ہونا چاہیئے، پچھلے پہر اُٹھ بیٹھا، ندوہ کے چند دوستوں کے ساتھ جاڑے کی کپکپاتی سردی میں، موتی محل کے پل پر پہنچا یہاں لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ کا بھی؛ ایک قافلہ ملا، ہم سب پاپیادہ چار باغ پہنچے، آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح گھستے بیٹھتے اپنے "لیڈر" جواہر لال کے پاس پہنچ کر دم لیا، مسلح اور سوار پولیس موجود تھی، لیکن نہ لیڈر کے چہرہ پر دہشت کے آثار تھے، نہ اس کے پیروؤں کے، سٹی مجسٹریٹ عین الدین یہاں بھی اپنی پوری قہرمانیت کے ساتھ موجود تھا۔ اور یہی عین الدین کل ایک جلوس کے سلسلہ میں ہمارے لیڈر کے ساتھ بدتمیزی کر چکا تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا ریل آگئی، اور مجمع سے گوبیک کے نعرے بلند ہوئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عین الدین کی مسلح اور سوار پولیس بھی حرکت میں آگئی، مجمع تتر بتر ہوگیا، سواروں اور لاٹھی برداروں کا ہلّہ لیڈر کی طرف تھا، لیکن اس کے جاں نثار اسے جلو میں لیے ہوئے تھے۔ اور اس گروہ کا ایک ممبر ایک نوخیز اور نوعمر، لیکن جوشیلا، اور پرخروش طالب علم بھی تھا، یعنی ان سطروں کا لکھنے والا جواہر لال کے مردانہ تیوروں میں ذرا فرق نہ آیا، لیڈر ایسا ہی ہونا چاہیئے، اور کتنی خوشی کی بات ہے۔ ہمارا لیڈر بہ ہمہ صفت موصوف ہے!

چند ماہ بعد، نہرو رپورٹ عالم وجود میں آئی ۔ موتی لال کا شاہکار اس نے کانگریس کا نصب العین قرار دیا، درجہ نو آبادیات گاندھی جی سے لے کر، لاجپت رائے تک سب متفق تھے میری نگاہ اپنے لیڈر پر تھی، یہ بھلا کیا مانے گا، اس نصب العین کو، قیصر باغ کی بارہ دری میں نہرو رپورٹ پیش ہوئی، آنکھیں انقلابی جواہر لال کو ڈھونڈ رہی تھیں، وہ آیا اور تائید کر کے چلا گیا، جی سن سے ہو گیا۔

ایں چہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

حکومت برطانیہ نے نہرو رپورٹ مسترد کر دی اور کانگرس کا پلیٹ فارم پھر آزادیٔ کامل کے نعروں سے گونجنے لگا۔ لارڈ اروِن کو صدر اسمبلی وٹھل بھائی پٹیل نے گارڈن پارٹی دی، اس میں وہ موتی لال، گاندھی جی وغیرہ سے ملے۔ کچھ راز و نیاز ہوتے اور ایک اعلان کانگرسی لیڈروں کے دستخط سے شائع ہوا، ہم درجہ نو آبادیات لینے کو تیار ہیں بشرطیکہ جلد دیا جائے، اس اعلان پر بھی انقلابی جواہر لال نے نہایت سعادتمندی سے گردن جھکا کر دستخط کر دیئے، البتہ سوباش چندر بوس ڈٹا رہا اس نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جواہر لال کے دستخط دیکھ کر دل دھک سے ہو گیا، آہ :

اب کسے رہنما کرے کوئی ؟

حکومت نے درجۂ نو آبادیات کی تعریف کرنے اور اسے جلد عطا کرنے سے بھی انکار کر دیا، پھر جواہر لال نے، چند ماہ بعد راوی کے کنارے آزادیٔ کامل کا جھنڈا، بڑے جوش سے لہرایا، لیکن دل نے کہا، یہ ایک چال باز سیاست داں ہے، انقلابی نہیں، انقلابی لچکتا نہیں ٹوٹ جاتا ہے اس کی تو لچکتے لچکتے کمر خم ہوئی جا رہی ہے اور آج وہ دن ہے کہ ملک معظم کا "حلف وفاداری" لے کر وہ لارڈ ویول کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔

راجندر پرشاد

۱۹۳۶ء کا ایک یادگار دن

بہار کے رہنے والے ہیں، مظہر الحق کے تربیت یافتہ ہیں، جن کا قائم کردہ صداقت آشرم" آج کانگرس ہاؤس بنا ہوا ہے، اور جو راجندر بابو کا صدر دفتر بھی ہے دراز قامت، لیکن وہ درازی قامت نہیں جس کے بارے میں ریاضؔ نے کہا تھا۔

صدقے اپنی درازیِ قد کے
وہ سب مجھے بے وقوف کہتے ہیں

دبلا پتلا بدن، داڑھی منڈی ہوئی، بڑی بڑی مونچھیں، بادامی آنکھیں، سیاست کے دریا میں شناوری کرتے کرتے، ادب کے ٹیلوں، اور تاریخ کے جنگلوں کی سیر بھی کرنے لگتے ہیں جب تک جیل سے باہر رہتے ہیں، تقریروں اور بیانوں پر اکتفا کرتے ہیں، جب جیل چلے جاتے ہیں، تو قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور صفحۂ کاغذ پر گل کاری کرنے لگتے ہیں، فی الحال ان دونوں کاموں سے ترک تعلق کئے ہوئے ہیں، اور نئی دہلی کی امپیریل سکرٹریٹ میں مسند وزارت پر متمکن ہیں گاندھی جی کے گوپیوں میں شامل ہیں، وہ اگر دن کو رات کہہ دیں، تو انہیں دن میں تارے نظر آنے لگیں۔

۳۲ء کی ناکام سول نافرمانی کے بعد ۳۴ء میں کانگرس کا سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا، اور صدارت کا قرعۂ فال راجندر بابو کے نام پڑا، یہ جلسہ کانگرس کے چند نہایت اہم اور یادگار جلسہ میں شمار ہوتا ہے، اس جلسہ میں مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا، جلسہ میں گرما گرم تقریریں ہو رہی ہیں، گاندھی جی، ڈائس پر بیٹھے ہوئے اطمینان سے چرخہ کات رہے ہیں، اس طرح کہ انہیں تقریروں پر بھی اپنی توجہ مبذول کرنا پڑ رہی تھی، اور گاندھی جی کے چرخہ پر بھی، تقریریں ان سے سن رہے تھے اور چرخہ کو آنکھ سے دیکھ رہے تھے، اور اس اشتیاق و حسرت

کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ صاف معلوم ہوتا تھا اسے مع اس کے چلانے والے کے دل میں رکھ لینے کو بسر و چشم تیار ہیں۔

راجن بابو ان ہندوؤں میں ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے، بڑی فصیح و بلیغ رواں اور بے تکلف اُردو، جو مجلسوں اور صحبتوں میں بولتے ہیں، لیکن جس طرح اُنھوں نے انگریزی سیکھی ہے، اسی طرح ہندی بھی سیکھی ہے۔ کانگریس کی صدارت کے دوران میں، وہ اردو اور انگریزی کو بھی بھول گئے تھے، صرف ہندی انہیں یاد تھی، جب تقریریں ختم ہو گئیں، تو انہوں نے چرخے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے، حاضرین سے "پکش" میں ہاتھ اٹھانے کو کہا اور "پرارتھنا" شروع کر دی۔ لوگ "پکش" میں ہاتھ اُٹھا رہے تھے کہ گاندھی جی نے اپنا چرخہ سنبھالا اور آنکھوں آنکھوں میں راجن بابو سے

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

کہتے ہوئے چلے گئے، اور راجن بابو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی ؟

مسٹر سیّد حسین

کیا بات ہے تیری گفتگو کی!

مسٹر سیّد حسین ایک عرصۂ دراز سے خود ساختہ طور پر جلا وطن ہیں۔ موتی لال کی صاحبزادی، اور جواہر لال کی ہمشیر وجے لکشمی سے ان کی شادی، وجے لکشمی کا قبول اسلام، مولانا فاخر الہ آبادی کے ہاتھ پر بیعت، پھر گاندھی جی کی مساعی جمیلہ کے باعث، سیّد حسین اور وجے لکشمی کی جدائی، وجے لکشمی کا ارتداد، اور مسٹر پنڈت سے شادی، یہ پس منظر تھا مسٹر سیّد حسین کے ترک وطن، یا خود ساختہ جلا وطنی کا عوام دھڑکتے ہوئے دلوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، وجے لکشمی اور سیّد حسین کے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹ بھی دنیا کو یادگار رہ گئے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس میں کوئی شبہ نہیں، وجے لکشمی پنڈت اپنے علم کے لحاظ سے سیاست دانی کے لحاظ سے، ایثار و صبر و برداشت کے لحاظ سے ہندوستان کی خواتین میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں، اس میں بھی کوئی شک نہیں، مسٹر سیّد حسین انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور خطیب ہیں، یہی نہیں وہ ایک بلند پایہ صحافی، اور ایک سربرآوردہ ماہر سیاست بھی ہیں، اُنہوں نے بمبئی کرانیکل، اور انڈیپنڈنٹ کی ادارت کے زمانہ میں اپنی ادبیت کی فنون گری کا لوہا منوالیا، اُنہوں نے تحریک خلافت کے زمانہ میں جس جوش و خروش کے ساتھ کام کیا، پھر مولینا محمد علی مرحوم کے ساتھ وفد خلافت میں شریک ہو کر جس طرح لندن اور پیرس میں اپنی خطابت اور قوتِ کلام کے جوہر دکھائے، وہ اپنی جگہ پر بڑے قیمتی واقعات ہیں، لیکن قابلیت اہلیت، استعداد، ایثار اور قربانی کے اعتبار سے اور بھی متعدد خواتین ہیں جو وجے لکشمی پر فوقیت رکھتی ہیں، اور بھی اصحاب ہیں جو مسٹر سیّد حسین پر ترجیح رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی لازوال زندگی رہینِ منت ہے، ان کے رومان کی دلآویزی اور رنگینی کی۔

سیّد حسین کا سفر یورپ اور وفد خلافت (۱۹۲۰ء) کی شرکت اس وقت کا واقعہ ہے جب میری ہوش کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں، جیسے جیسے اخبارات سے سیاسیات سے، واقعات و حالات سے واقفیت پیدا ہوگئی، سیّد حسین کی دلآویز، رنگین اور من موہن شخصیت بھی، تصور کی آنکھوں کے سامنے آنے لگی،

اب ۱۹۳۷ء میں ہم داخل ہوتے ہیں، ایک روز اطلاع ملی کہ فلاں جہاز سے مسٹر سیّد حسین آرہے ہیں، مولینا عرفان صاحب سے پروگرام طے ہوا اور علی الصباح ہم لوگ بیلرڈ پیر پہنچ گئے. ہم جلدی پہنچے تھے، جہاز کے آنے میں ابھی دیر تھی، لیکن سیّد حسین کے دوستوں اور مداحوں کی ایک معقول تعداد پہنچ چکی تھی، اور استقبال کے لئے آنے والوں کا سلسلہ برابر جاری تھا، مسٹر پی جی ہارنیمن مسٹر عبداللہ بریلوی، مسٹر عثمان ثوبانی، مسز عمر ثوبانی اور متعدد لوگ موجود تھے۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، جہاز آکر ساحل سے لگا، اور مسافروں کا جم غفیر اترنے لگا، انہی مسافروں میں سیّد حسین بھی تھے، پستہ قد، گٹھا ہوا بدن، بڑی بڑی آنکھیں، خوبصورتی اس عمر میں بھی خدوخال سے نمایاں تھی، عمر اس وقت (۱۹۳۶ء) ۵۰ سے کیا کم ہوگی، لیکن کاٹھی اتنی اچھی کہ مشکل سے ۳۰ برس کے معلوم ہوتے تھے، باتوں میں ایسی حلاوت اور شیرینی کہ قند و نبات بھی ان کے سامنے بے مزہ۔

جہاز سے اترتے ہی وہ اپنے دوستوں مداحوں اور اخبار نویسوں کے مجمع میں گھر گئے، میں نے مولانا عرفان سے کہا چلئے؟ اب یہاں کیا ملاقات ہوگی، کہنے لگے، واہ ابھی اور یہیں ملیں گے، یہ کہہ کر وہ اس طرح مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے جیسے مچھلی نہایت آسانی کے ساتھ پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے. یہ ان میں خاص وصف تھا، انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا، وہ جس دربار میں جس ایوان میں جس جگہ پہنچنا چاہیں پہنچتے تھے، سپاہی، سنتری، پہرہ دار رضا کار والنٹیئر، زرغۂ اعدا، سب ان کے سامنے بے بس تھے، ایک دفعہ انہوں نے کھکھارا، اور کچھ ایسے تیور کے ساتھ آگے بڑھے کہ پھر کوئی انہیں روک نہ سکا ضمیمہ کے طور پر میں بھی ان کیساتھ تھا، بڑی بے تکلفی سے مسٹر سیّد حسین سے ملے، اور لگے ہاتھوں نوبہس اس مجمع نا پرساں میں میرا تعارف کرانے لگے، اب تک مسٹر سیّد حسین انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے، مولینا سے اردو میں بات چیت کرنا پڑی، مولینا نے جب میرا تعارف کرایا، تو مسٹر سیّد حسین نے مصافحہ کیلئے ہاتھ

بڑھاتے ہوئے بڑے لکھنوی انداز میں "بندگی" کہا، گفتگو کا موقع نہ تھا وہ تاج محل ہوٹل چلے گئے، اور میں خلافت ہاؤس واپس آ گیا۔

مسٹر سید حسین نے جب ہندوستان چھوڑا تھا، اس وقت شرفا ہند کا انداز سلام، یقیناً "بندگی"، "اور تسلیمات" اور "کورنش" ہوگا۔ لیکن اب ۲۰ سال کی مدت میں اس دیس کی ہر چیز بدل چکی تھی، سید حسین کے منہ سے "بندگی" کا لفظ سُنکر مجھے بے ساختہ رپ وان ونکل یاد آ گیا۔

دوسرے روز تاج محل ہوٹل میں، ان سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا، میں اور مولینا عرفان وقت مقررہ پر پہنچ گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) نافذ ہو چکا تھا، بمبئی میں اور متعدد دوسرے صوبوں میں کانگرسی وزارتیں برسر اقتدار آ چکی تھیں، ان سے مسلمانوں کو شکائیتیں پیدا ہونے لگی تھیں، بندے ماترم کا جھگڑا، سب سے زیادہ سنگین تھا مسلمانوں کو شکایت تھی کہ یہ گیت بنکم چیٹرجی نے اسلامی حکومت کی جڑ اکھاڑنے کے لئے لکھا تھا، کالی مائی سے التجا کی تھی کہ وہ مسلمانوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دے، ایسے گیت کو کانگرس نے قومی گیت بنالیا یہ اس کے تعصب اور ناروا داری کی کھلی ہوئی دلیل ہے، مسلمانوں نے کوشش کی کہ کانگرس اس ترانہ کو ترک کر دے، لیکن کانگرس نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کو رد کر دیا۔

مسٹر سید حسین کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا، انہوں نے فوراً کہا، کانگرس اقبال کا ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

کیوں نہیں اختیار کرلیتی؟ بندے ماترم کے مقابلہ میں تو یہ کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ایک صاحب نے احیائے خلافت کے مسئلہ پر رائے دریافت کی، سید حسین نے جواب دیا "فی الحال تو یہ سوال خارج از بحث ہے کیونکہ خلافت کی پہلی شرط یہ ہے کہ خلیفہ مقامات مقدسہ پر اقتدار و اختیار کامل رکھتا ہو، بالکل آزاد اور خود مختار ہو، اس وقت اسلامی حکومتوں میں کونسا شخص ایسا ملے گا جو شرعی شرائط خلافت کے پورے کر سکے!"

سید حسین کی ان دونوں باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کی نظر اسلام کے فلسفہ پر بھی ہے اور قوم کی نبض پر بھی، اتنے دنوں تک اپنے دیس سے جُدا رہنے کے بعد بھی یہ شخص نہ اپنی قوم کو بھولا ہے، نہ اپنے ملک کو، نہ اپنے مذہب کو۔

شام کو جناح ہال میں ہارنی مین کے زیرِ صدارت سید حسین کا استقبالیہ جلسہ تھا، شہر کے سربر آوردہ کانگرسی اور مسلم لیگی اصحاب موجود تھے، ڈائس پر سید حسین کی کرسی سے تقریباً ملی ہوئی، کرشنا نہرو، جواہرلال، اور وجے لکشمی پنڈت کی چھوٹی بہن، اپنے شوہر ہاتھی سنگھ کے ساتھ رونق افروز تھیں، اور بڑی دلچسپی سے سید حسین کی تقریر سن رہی تھیں، میں شاید ذکر کرنا بھول گیا، بیلرڈ پیر پر استقبال کرنے والوں کے مجمع میں بھی انہیں میں نے دیکھا تھا، لیکن خیال کیا تھا، یہ کسی اور ضرورت سے آئی ہونگی، سید حسین کے استقبال میں بھلا کیا شرکت کریں گی، لیکن جناح ہال میں انہیں دیکھ کر خیال بدل گیا، اور اس حقیقت کا قائل اور معترف ہو جانا پڑا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

دوسرے روز تاج محل ہوٹل کے بڑے ہال میں ایک صاحب نے مسٹر سید حسین کو پارٹی دی، اس موقع پر سید حسین کی دلکش اور دلچسپ شخصیت کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور یہ اندازہ بھی ہوا، کہ سید حسین جہاں ایک شعلہ مقال خطیب ایک سنجیدہ اہل قلم، ایک پختہ کار ادیب ہیں، وہاں وہ لطف و مزاح کے فن سے بھی واقف ہیں، کسی مجمع میں جب بیٹھتے ہیں، تو بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں بہت جلد ابر بہار کی طرح چھا جاتے ہیں، اور نسیم سحر کی طرح اٹکھیلیاں بھی کرنے لگتے ہیں، اور گل رعنا کی طرح اپنی بھینی بھینی خوشبو سے اپنے ہم نشینوں کا مشام جان معطر کر دیتے ہیں۔

دل نے [illegible] کاش یہ ہندوستان سے نہ جائیں، لیکن بہت جلد چلے گئے، دل نے چاہا، یہ پھر اپنے دیس میں واپس آئیں، لیکن بہت دنوں روپوش رہے، ۱۹۴۵ء میں مسز وجے لکشمی پنڈت نے امریکہ کا طوفانی دورہ کانگرس کے سفیر کی حیثیت سے کیا، سید حسین کی ہر قسم کی امداد اور تعاون انہیں حاصل رہا، ۱۹۴۵ء کے آخر میں یا ۱۹۴۶ء کے شروع میں مسٹر سید حسین پھر اپنے وطن واپس آ[illegible] ایک مہمان کی طرح، لیکن پاکستان کے مخالف، قائداعظم کے مخالف اور مسلم لیگ کے مخالف [illegible] بلکہ مسلمانوں کی مرکزیت، تنظیم اور شعور سیاسی کا مذاق اُڑاتے ہوئے،

[illegible] اہل جہاں کی سب سمجھ پر وا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

سر شفاعت احمد خاں

بازی بازی باریش بابا ہم بازی

سر شفاعت احمد خاں، ایک علمی سیاست داں کی حیثیت سے ایک خاص منزلت کے حامل ہیں، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے، اور اس اعتبار سے بہت ممتاز رہے، وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے اور وہاں انہوں نے سیاسیات ہند پر گراں قدر علمی تقریریں کیں، لیکن عملی سیاسیات سے انہیں کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ اور اسی لئے وہ عوام سے ان کے جذبات سے، ان کے رجحانات سے ہمیشہ ناواقف رہے اور انہیں وہ منزلت حاصل نہ ہو سکی جو عمل کے غازیوں کو حاصل ہوتی ہے۔

۳۵ء میں مولانا شوکت علی نے مرکزی اسمبلی کے لئے کھڑے ہونے کا فیصلہ اپنے بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر کیا، اور اپنا حلقہ انتخاب یو۔پی کا ہندو شہری حلقہ تجویز کیا، اسی حلقہ سے سر شفاعت احمد خاں بھی مرکزی اسمبلی میں جانے کے لئے پر تول رہے تھے لیکن شوکت علی کی صورت میں ایک سد سکندری حائل تھی جس سے سر ٹکرایا جا سکتا تھا، اور پاش پاش کر لیا جا سکتا تھا، لیکن جسے توڑا نہیں جا سکتا تھا۔

آدمی حوصلہ اور ہمت والے ہیں، بمبئی تشریف لائے، اور سیدھے رفعت ہاؤس مولینا شوکت علی کے پاس پہنچے، اور ان سے استدعا کی کہ آپ میرے حق میں دستبردار ہو جائیے، اور مجھے اپنے بجائے مرکزی اسمبلی میں جانے دیجئے!

مولینا شوکت علی نہایت سکون اور خاموشی کے ساتھ سر شفاعت احمد خاں کی اپیل سنتے رہے جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکے اور جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ اپنی حمایت میں اور شوکت صاحب کی مخالفت میں، پر زور اور ناقابل تردید دلائل و شواہد پیش کر چکے، تو مولینا شوکت علی نے اوپر نظر اٹھائی، اپنے خوبصورت جبڑے کو جنبش دی، اپنی دلفریب آنکھوں کو حرکت میں لائے، اور

نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ فرمایا۔

"بازی بازی باریش بابا ہم بازی؟"

سر شفاعت احمد کو توقع تھی، کہ یا تو مولینا دست بردار ہو جائیں گے، ورنہ عدم دست برداری کے سلسلہ میں، اسی شرح و بسط اور وضاحت و تفصیل کے ساتھ گھنٹوں اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ جس کا مظاہرہ ابھی خود سر شفاعت کر چکے تھے، لیکن نہ مولینا نے دست برداری اختیار کی۔ نہ اپنے "کیس" کی تائید میں کوئی لچھے دار تقریر کی، صرف "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کہہ کر معاملہ ختم کر دیا۔

اتنا مختصر، لیکن جامع و مانع جواب سُنکر سر شفاعت احمد کو سکتہ سا ہو گیا، وہ حیران تھے کہ اس کے جواب میں اگر کہیں تو کیا؟

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے؟

خاموشی سے اپنا ہیٹ اُٹھایا، اور جس تیزی سے تشریف لائے تھے، اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سیّد عبداللہ بریلوی

۱۹۴۴ء سے پہلے اور ۱۹۴۴ء کے بعد

آج سے ۱۶-۱۷ سال پہلے کی بات ہے، جب میں نے ندوہ کے زمانۂ طالبعلمی میں جالب دہلوی کے مشہور اخبار ہمدم کا ایک پرچہ دیکھا تھا جس میں کسی غیر ملکی سیّاح کے ایک مقالہ کا ترجمہ شائع ہوا تھا، اس سیاح نے ہندوستان کی سربرآوردہ ہستیوں کے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر کیا تھا، سیّد عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل کے بارے میں اس نے لکھا تھا "بڑے کم گو، نازک، دھان پان سے آدمی ہیں، کاش یہ مرد کے بجائے عورت ہوتے"، اُسی وقت سے ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کا ایک غیر محسوس سا اشتیاق دل میں پیدا ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں روزنامہ خلافت کے ایڈیٹری کی حیثیت سے میں بمبئی آ گیا، لیکن یہاں کی فضا دوسری تھی۔ خلافت اور کانگریس کے مابین معرکہ کارزار گرم تھا، گاندھی جی مولانا شوکت علی کی جیب سے باہر آ چکے تھے، اور مولینا شوکت علی گاندھی جی سایۂ عاطفت سے آزاد ہو چکے تھے پبلک طور پر ان دونوں ہستیوں اور ان دونوں کے اداروں میں زبردست جنگ جاری تھی، بمبئی کرانیکل کانگریس کا حلیف تھا، اور خلافت مجلس خلافت کا آرگن تھا، ان دونوں کے نظریات و خیالات میں اتنا ہی بعد المشرقین تھا جتنا خود گاندھی جی اور مولینا شوکت علی میں، لہذا بمبئی آنے کے بعد یہاں بریلوی صاحب سے ملنے کا کوئی امکان نہ پیدا ہو سکا۔

کچھ عرصہ بعد یہ جنگ سرد سی پڑ گئی، اور خالدہ ادیب خانم کی ایک اعزازی پارٹی میں مولانا عرفان کے ساتھ بریلوی صاحب سے مختصر سی ملاقات ہوئی، لیکن نہ اتنی کہ جسے کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل ہو۔

۱۹۴۲ء میں مولینا محی الدین قصوری کی تحریک پر جب میں امت اسلام کے اخبار اتحاد کی ایڈیٹری قبول کرنے پر راضی ہوا، تو طے پایا کہ پہلے میری اور بریلوی صاحب کی ملاقات ہو جائے،

کیونکہ مس صاحبہ کے "اسپیشل ایڈوائزر" وہی تھے،

وقت مقررہ پر میں بمبئی کرانیکل کے دفتر میں پہنچا، وزٹینگ کارڈ بھیجا، فوراً طلب کر لیا گیا، باتیں شروع ہوئیں، بریلوی صاحب نے فرمایا "بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اخبار اتحاد کی عنان ادارت سنبھالنے کا ارادہ کر لیا، ہماری پالیسی کیا ہوگی؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے؟ میں نے کہا "آپ کی پالیسی کیا ہوگی، یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن میری پالیسی کیا ہوگی، یہ بتانے کے لئے میں حاضر ہوا ہوں، بہتر ہے کہ اس مسئلہ پر صاف صاف گفتگو ہو جائے تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔" بڑی خندہ جبینی کے ساتھ فرمایا "ضرور، بتایئے آپ کی پالیسی کیا ہے؟" میں نے کہا "میں دیانت داری کے ساتھ پاکستان کا حامی ہوں، مسلم لیگ کی افادیت کا قائل ہوں، اور قائداعظم کی قیادت پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں، مجھ سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ میں ان تینوں میں سے کسی کے خلاف قلم اٹھاؤں گا۔" کچھ دیر تک غرق تفکر رہے، پھر فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں، آپ اپنے خیالات پر قائم رہیئے۔ ہماری پالیسی منفی نہیں ہے، مثبت ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ مسلم لیگ کی یا اس کے نظریات کی مخالفت کیجئے، ہم کسی کی بھی مخالفت کرنا نہیں چاہتے ہم تو خود اقوام ہند کے حق خود ارادیت کے حامی ہیں، لیکن ہم ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر سمجھتے ہیں، اور یہ پرچہ صرف اسی لئے نکالا جا رہا ہے کہ سماجی اور معاشرتی طور پر، اور جس حد تک ہو سکے سیاسی طور پر، ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرے۔

میں نے کہا "اس حد تک میرے خدمات حاضر ہیں" انہوں نے فرمایا "تو بسم اللہ کر کے کام شروع کر دیجئے۔"

میں بہت خوش خوش واپس آیا، خوشی اس بات کی تھی، کہ کانگرس کے حلقہ میں بے رواداری اور معاملہ فہم لوگ بھی موجود ہیں ——— لیکن اس خوشی کی عمر بہت کم ثابت ہوئی، ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس کے بعد کرانیکل اور بریلوی صاحب کی پالیسی فری پریس جرنل، اور سدانند کی پالیسی بن گئی۔

گاندھی جی!

ایک بہت بڑا آدمی، لیکن ــــ؟

مولینا شوکت علی کا انتقال ہو چکا تھا، مولینا محمد عرفان بھی اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے، مسٹر اللہ بخش یوسفی، اور مسٹر زاہد علی. خلافت کمیٹی، اور خلافت ہاؤس کے مالک الرقاب بنے ہوئے تھے، اور وہی اس کی پالیسی، اور ملک کے نگراں تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا، مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا خلافت کے لئے ایڈیٹوریل لکھ رہا تھا کہ دفعتہً خلافت ہاؤس کے احاطہ میں کچھ چہل پہل سی، اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی، کمرہ میں میری نشست ایسی تھی کہ باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا، مَیں نے نگاہ غلط انداز سے یہ چہل پہل یہ ہل چل دیکھی، اور پھر خاموشی سے اپنے کام میں لگ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زاہد صاحب کا ایک پیغامبر میرے پاس آیا، اور اس نے کہا، زاہد صاحب نے اوپر یاد فرمایا ہے، مَیں نے کہا، کہہ دو کام کر رہا ہوں، اس سے فارغ ہو کر آؤں گا، وہ چلا گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد خود زاہد صاحب بہ نفس نفیس تشریف لے آئے، انہوں نے فرمایا، "مہاتما جی آئے ہیں، چائے آپ بھی پی لیجئے۔

گاندھی سے ملنے کا اشتیاق کسے نہ ہوگا، مَیں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور ان کے ساتھ ساتھ اوپر چلا گیا، اوپر جہاں شوکت صاحب کی نشست رہتی تھی، گاندھی جی ایک صوفے پر متمکن تھے، ان کے ساتھ دو ایک رفیق تھے، داہنی طرف مسٹر یوسفی، بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں طرف کی کرسی خالی تھی، اسی پر مَیں جا کر بیٹھ گیا۔

میرے سامنے ایک دُبلا پتلا منحنی، اور کم رو انسان، کھدر کی ایک چادر میں لپٹا بیٹھا تھا بڑے آدمیوں میں ایک خاص قسم کا دبدبہ ہے، وہ اس ہستی میں ناپید تھا، آواز بھی نسبتہً پست اور غیر مؤثر تھی۔

اب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر یوسفی نے کہا مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو خلیج پیدا ہو گئی ہے، اسے صرف آپ پاٹ سکتے ہیں۔ پھر آپ کچھ کوشش کیوں نہیں کرتے ؟

گاندھی جی نے نہایت بے تکلفی کے ساتھ کہا "میں (میم کو زیر) کیا کر سکتا ہوں ؟" میں نے کہا "آپ سب کچھ کر سکتے ہیں ؟ ہندو قوم آپ کو اپنا اوتار اور گرو مانتی ہے، وہ آپ کی ہدایت کے خلاف نہیں چل سکتی" مسکرائے، اور خاموش رہے، مسکراہٹ اور خاموشی کے بین السطور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ہندو قوم انہیں اپنا اوتار مانتی ہے اور اسے مانتے ہیں کہ وہ جو چاہیں اس سے منوا سکتے ہیں، لیکن

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی !

میں نے کہا "یہ خلافت کبھی آپ کو یاد آتی ہے، اس کی یاد کے ساتھ تو اور بھی بہت سی یادیں وابستہ ہوں گی" اس کا جواب انہوں نے صرف یہ "میں تو خلافت کو اب بھی اپنی ہی سمجھتا ہوں، یاروں کا ذکر وہ پی گئے، شاید اس لئے کہ خلافت کے نام کے ساتھ جو یادیں وابستہ تھیں، وہ آخری دور میں گاندھی جی کے لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں رہ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جانے کے لئے اُٹھے، ہم سب انہیں موٹر تک پہنچانے آئے، زاہد صاحب نے "باپو" کی خدمت میں اموں کا ایک ٹوکرا پیش کیا، جو قبول کر لیا گیا، اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہو گئی، زاہد صاحب بار بار گاندھی جی کو "باپو" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، اس سے میں نے اندازہ لگایا، کہ ماضی کی داستانیں گاندھی جی فراموش کر چکے ہوں تو کر چکے ہوں، لیکن زاہد صاحب کے دھڑکتے ہوئے دل پر وہ اب تک نقش ہیں۔

مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو !

پنڈت مدن موہن مالوی

ہندو قوم اور ہندو تہذیب کا سچا نمائندہ

پنڈت مدن موہن مالوی، اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں، کہ اب گئے اور اب گئے، کہن سالی، ضعف، اور نقاہت نے انہیں پبلک پلیٹ فارم سے دور کر دیا ہے۔ لیکن آج سے دس پندرہ سال پہلے، وہ سیاسیات ہند کا ایک اہم ترین عنصر تھے، وہ سبھاسمبھا کے رواج رواں تھے۔ اور ان کے زمانہ کی مہا سبھا کو قوت، اقتدار، اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے ساورکر اور مکرجی کی مہاسبھا سے کوئی نسبت نہیں تھی، مالوی جی کی مہا سبھا سے موتی لال نہرو بید لرزاں کی طرح کانپتے تھے، گاندھی جی کی جھونپڑی بھی بید لرزاں کی طرح کانپا کرتی تھی اور کانگرس کا دفتر بھی بید لرزاں کی طرح کانپا کرتا تھا، وہ کانگرس کے سابق صدر تھے، لیکن کانگرس کو انہوں نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، یہی مسٹر آصف علی جنہیں تازہ انتخابات میں، کانگرس نے دلی کے مخلوط حلقۂ انتخاب سے کامیاب کرا لیا، اس سے پہلے بھی کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے، اس سے پہلے بھی مہا سبھا سے انہوں نے ٹکر لی تھی، لیکن بُری طرح ہارے تھے، مالوی جی کے سامنے موتی لال کی طاقت لسانی کام نہ آئی، مالوی جی کا نمائندہ جیت گیا، اور موتی لال کا امیدوار آصف علی ہار گیا۔

۱۹۳۴ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا، راجندر پرشاد صدر تھے، نمائندہ خلافت کی حیثیت سے میرا وقت کانگرس کے پنڈال میں صرف ہوا کرتا تھا، میں نے دیکھا مالوی جی بھی موجود ہیں، کہ کانگرس کے مخالف ہیں، اور مخالفت ہی کیلئے آئے ہیں، لیکن گاندھی جی سے لیکر ولبھ بھائی پٹیل تک ہر شخص انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ جب آتے ہیں تو مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا ہے، ان کی بات مانی نہیں جاتی لیکن سُنی پوری توجہ اور عقیدت سے جاتی ہے، دراز قد، دُبلا بدن، مہین آواز، لیکن مجمع

پر ان کی تقریر چھا جاتی ہے،

اُردو اور ہندی کا قضیہ مالوی جی ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، انہی نے اُردو کے مقابلہ میں ہندی کو کھڑا کیا، اُردو کو یو، پی کے سرکاری دفتروں، ریاستوں کے محلات اور بہت سی تعلیم گاہوں سے، اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار و وقار کے باعث جلا وطن کرایا، وہ اُردو کے بدترین مخالف اور ہندی کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کہ مالوی جی تقریر اُردو میں کرتے ہیں، جسے ہندی سے کوئی لگاؤ نہیں، عربی فارسی کے الفاظ صحت تلفظ اور صحت معنی کیساتھ استعمال کرتے ہیں، اس طرح جیسے کسی نے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا، اتنی صاف، رواں اور شستہ اور فصیح و بلیغ اُردو کی توقع میں سر سید سے بھی نہیں کر سکتا تھا، نہ کہ مالوی جی سے،

اس دنیا میں بہت سے عجائب ظہور میں آتے رہتے ہیں، یہ عجوبہ بھی انہی میں سے ایک تھا،

اس زمانہ میں یونٹی کانفرنسوں کا سلسلہ جاری تھا، کوشش یہ کی جارہی تھی کہ ہندو مہاسبھا کو، اس پر راضی کر لیا جائے، کہ وہ مرکز میں مسلمانوں کو ۳۳ فی صدی نشستیں دیتے، بنگال میں مسلم اکثریت تسلیم کرنے، صوبہ سرحد میں اصلاحات سیاسی نافذ کرنے اور سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے پر راضی ہو جائے، کانگرس مہاسبھا کے سامنے بے بس تھی، اور مہاسبھا مالوجی کے پنجہ میں تھی، اور مالوجی کے انکار کو اقرار سے بدلنا "بت کافر" کو "مرد مومن" بنا لینا تھا۔

مولینا شوکت علی نے ایک بار انہی مسائل پر تبادلہ خیال کے لیے مالوی جی کو خلافت ہاؤس میں مدعو کیا، مالوی جی نے دعوت قبول کر لی، اور وقت مقررہ پر تشریف لے آئے، سر پہ سفید پگڑی، ہونٹوں پر تبسم، ہاتھ میں ایک نازک سی چھڑی، کوہ پیکر شوکت نے اس مشت خاک کو اپنے آغوش میں لیا، اور بالائے بام محو گفتگو ہو گیا۔

اس گفتگو کی خصوصیت یہ تھی کہ شوکت صاحب بہت خوش تھے، کیوں نہ ہوتے ؎

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے!

مالوی جی خاموش تھے، شوکت صاحب کہہ رہے تھے مالوجی سن رہے تھے شوکت صاحب مالوجی کو مطمئن کرنے کے لئے، مسلمان قوم کی طرف سے بڑے بڑے وعدے کر رہے تھے، اور مالوی جی ہندو قوم کی طرف سے یا انکار کر رہے تھے یا "غور" کرنے کا وعدہ کر رہے تھے، شوکت صاحب چاہتے تھے تمام معاملات اسی وقت طے پاجائیں اور مالوی جی کا رویہ یہ تھا کہ اگر

کبھی بھی طے نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، شوکت صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے، مالوی جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شوکت صاحب خاموش ہوئے تو مالوی جی بولے، لیکن سیاسیات وطنی پر نہیں بلکہ میں بخیریت ہوں اور خیریت آپ کی درگاہِ رب العزت سے نیک مطلوب ہوں" اور آخر کار دو گھنٹے کے بعد؎

نشستند و گفتند و برخاستند

ڈاکٹر سیّد محمُود

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق!

تحریک خلافت کے زمانہ کی پیداوار ہیں، محمد علی شوکت علی نے انہیں آغوش شوق میں جگہ دی، اور یہ سیاسی اسٹیج پر نمایاں ہو گئے۔

دگر نہ پیلے بود در بستاں!

علی برادران کے آخری دورِ حیات میں ان سے اُلجھ پڑے، دوستی کے مقابلہ میں کانگرس کی سیکرٹری شپ زیادہ عزیز تھی، ملّت کے مقابلہ میں کانگرس زیادہ گراں مایہ تھی لیکن انکی مخالفت کبھی حدودِ انسانیت اور آئین شرافت سے آگے نہیں بڑھی، یہ مخالفت کرتے رہے لیکن ملتے بھی رہے، لڑتے بھی رہے لیکن معانقہ بھی کرتے رہے اُنھوں نے ملّت کے مقابلہ میں کانگرس کا ساتھ دیا لیکن ملت کو گالیاں کبھی نہیں دیں،

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب لیڈر ہیں اور کانگرسی حلقہ میں اپنی ایک جگہ بنا چکے ہیں، لیکن ان کی لیڈری میں آمد کم ہے آورد زیادہ ہے، بمبئی جب آتے تھے تو کانگرس کے کام سے آتے تھے، اور کانگرسیوں کے حلقہ میں رہتے تھے لیکن شوکت صاحب سے ملنے خلافت ہاؤس ضرور آتے تھے، گھنٹوں بیٹھتے تھے اور پہروں باتیں کرتے تھے، جب گفتگو کرتے تھے خصوصاً سیاست پر، تو صاف معلوم ہوتا تھا، ابوالکلام صاحب کے لب و لہجہ میں، انہی کے انداز اور ادا کے ساتھ بولنے کی کوشش فرما رہے ہیں، وہی "میرے بھائی" کی تکرار، وہی لیمانہ انداز وہی گراں ڈیل اور مشتبہ اور ذو معنی الفاظ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہی بالکل، وہی رک رک کے، ٹھہر ٹھہر کے، بالکل بڑے، بہت بڑے، بہت بڑے آدمیوں کی طرح میٹھے لب و لہجہ میں کڑوے بول۔ ایک مرتبہ یہ آئے اور مولینا عرفان مرحوم سے اسی طرح کی باتیں کرنے لگے، میں بھی مجلس میں موجود تھا، ان کے جانے کے بعد

میں نے پوچھا "کیئے کیا رائے ہے؟ بولے میرے بھائی کیا پوچھتے ہو؟ ورنہ در محفل رندان خبرے نیست کہ نیست" شوکت صاحب ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے تھے اور مولانا عرفان باتیں بھی کرتے تھے، اور چھیڑتے بھی تھے، ڈاکٹر صاحب کی لیڈرانہ سنجیدگی کو اس چھیڑ چھاڑ کا حریف بننے میں تامل ہوتا تھا لیکن

کام اس سے آپڑا تھا کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

مولینا کسے نہیں چھیڑتے تھے؟ اور ان کی چھیڑ خدا کی پناہ، ہنستے کو رلادیں، روتے کو ہنسادیں۔

۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کے سلسلہ میں جب یہ دوسرے کانگرسی لیڈروں کے ساتھ جیل گئے، تو ان کی ایک نئی خصوصیت کا علم ہوا، یعنی فال بھی نکال لیتے ہیں، احمد نگر کے قلعہ میں نظر بندی کے کافی عرصہ بعد انہوں نے فال دیکھی اور وائسرائے کو ایک خط لکھا کہ میں کانگرس کی تجویز کا حامی نہیں تھا، بلکہ مخالف تھا، اور اسی لئے ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو چکا تھا، پھر مجھے کیوں زندانی بنا کر رکھا گیا ہے؟ فال بھی خفیہ طور پر دیکھی گئی تھی، خط بھی بغیر رفیقانِ مجلس کے مشورے کے لکھا گیا تھا، وائسرائے نے رہائی کا حکم صادر کر دیا، رہا ہو کر بمبئی پہنچے، دوستوں نے پوچھے بغیر رائے قائم کر لی "علالت" کے سبب رہا ہوتے ہیں، کچھ علیل تھے بھی۔ انہوں نے تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا، خاموش ہو رہے، اخباروں میں بھی چھپنے لگا اور وائسرائے کو ایک کمیونکے شائع کرنا پڑا کہ ڈاکٹر صاحب کی رہائی خرابیِ صحت کی بنا پر عمل میں نہیں آئی ہے۔ تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے آخر فال کا قصہ طشت ازبام ہوا۔

گاندھی جی نے فیصلہ صادر کیا، اگرچہ جرم بہت سنگین ہے، لیکن ان کے خسر مولانا مظہر الحق سے میرے بڑے گہرے تعلقات تھے، لہذا میں معاف کرتا ہوں، امید ہے کہ کانگرس بھی معاف کر دے گی مہاتما کا کہنا کون نہ مانتا، معافی مل گئی، اور اب وطن میں وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔

مرارجی ڈیسائی

اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

کانگرس کابینہ کے رکن رکین ہیں، حکومت بمبئی کے وزیر داخلہ ہیں، کھدر کا لباس اسی اہتمام سے پہنتے ہیں، جس طرح بعض لوگ، نہایت اہتمام سے سوٹ پہنتے ہیں، کیا مجال کہ ایک شکن بھی پتلون میں پڑ جائے، یہ پتلون نہیں پہنتے، دھوتی باندھتے اور کرتہ پہنتے ہیں، لیکن اس سج دھج سے کہ کھدر، کھدر نہیں معلوم ہوتا، اس کی شان کچھ بڑھ جاتی ہے۔

فسادات بمبئی کے دوران میں ایک مرتبہ ملاقات ہوئی، ایک مابہ نزاع مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے درپے ہیں، لیکن انگریزی دانی کا سکہ بٹھانے والے تھے، دریافت فرمایا کہ آپ انگریزی جانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا، جانتا تو ہوں، لیکن گفتگو اردو میں کروں گا، آپ شاید اردو جانتے تو ہوں گے، مُسکرائے اور گفتگو اردو میں شروع کر دی۔

جب تک حکومت کے مخالف تھے، حکومت کی ہر چیز کے مخالف تھے۔ جب سے حکومت کے وزیر بنے ہیں، حکومت کی ہر چیز اپنالی ہے۔ پہلے سنسر سے چڑتے تھے، اور آزادی تحریر و تقریر کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اب سنسر سے کام لیتے ہیں، اور اخبارات سے ضمانتیں طلب کرتے ہیں، اسی انڈین پریس ایمرجینسی پاور ایکٹ کے باعث جس کے خلاف عرصہ دراز تک جہاد کر چکے ہیں، اُردو پڑھنا نہیں جانتے، لیکن اُردو اخبارات پر بڑی کڑی نظر رکھتے ہیں، گجراتی مادری زبان ہے، لکھنا بھی جانتے ہیں اور پڑھنا بھی، لیکن گجراتی اخبارات کی اشتعال انگیزیاں تک بعض اوقات گوارا کر لیتے ہیں۔

احمد آباد میں جب فساد ہوا، تو مسٹر گاندھی نے انہیں تلقین کی تھی کہ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر، فساد بند کراؤ، پھر جب بمبئی میں، احمد آباد سے زیادہ ہولناک فساد پھوٹ پڑا، تو ایک عرصہ تک یہ پونہ میں بیٹھے رہے، اور مسٹر گاندھی دہلی میں، اب بمبئی میں متمکن ہیں، لیکن ابھی فساد

کو روکنے اور بند کرانے پر قدرت نہیں حاصل کر سکے ہیں۔

فساد بمبئی کے سلسلہ میں قومی کارکنوں اور مسلم اخبار نویسوں نے نہایت اصرار کے ساتھ مطالبہ کیا کہ ایک تحقیقاتی کمیشن حکومت کی طرف سے مقرر کیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کی حکام سے، اور حکومت سے جو شکایات ہیں، ان کا تصفیہ ہو جائے۔ لیکن اس اصرار کو، شان حکومت کے پورے دبدبہ کے ساتھ سٹر ڈیسائی نے مسترد کر دیا، اور یہ ثابت کر دیا کہ حکومت بہر حال حکومت ہے، خواہ وہ انگریز کی ہو یا کانگرس کی،

پہلے کے مقابلہ میں اب پریس کانفرنس کرتے ہوتے ذرا تکلف کرتے ہیں، وہاں خواہ مخواہ بعض ایسی باتیں چھڑ جاتی ہیں، جن کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے، اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ سے

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی ؟

مسز سروجنی نائیڈو

ہو گئیں خاک، انتہا یہ ہے!

بھائی صاحب (عقیل احمد صاحب جعفری) کے وسیع کتب خانہ میں، ہر قسم کا لٹریچر موجود ہے، ایک روز مجھے علی گڑھ میگزین کے فائل مل گئے، اور میں ان کی ورق گردانی کرنے لگا، بہت سے مضامین پڑھ ڈالے، کتنی زندگی تھی، اس پرچہ میں، اس کے مضمون نگاروں میں، اس کے ماحول میں، ہر ہر حرف، ہر ہر سطر، ہر ہر صفحہ پر زندگی کی امنگ، ناچتی ہوئی، تھرکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

آغا حیدر حسن دہلوی (علیگ) کا ایک مضمون تھا، خالص قلعہ معلیٰ کی نسوانی زبان میں مسز سروجنی نائیڈو کی علی گڑھ میں آمد پر زبان کیا تھی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی، وہی محاورے وہی الفاظ، وہی رنگ ڈھنگ، وہی انداز جو عورتوں کی بول چال کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس مضمون میں شعر شروع سے آخر تک موجود تھا۔ آغا صاحب نے اس مضمون میں مسز سروجنی نائیڈو کے بنگالی حسن، ان کی بڑی بڑی آنکھوں، ان کے سانولے سلونے رنگ، ان کی لہراتی ہوئی زلفوں، ان کے پھول سے رخساروں کا اس رنگ میں ذکر کیا تھا کہ معلوم ہوتا، کلوپیٹرہ پھر سے زندہ ہو گئی ہے، جب ہی سے سروجنی کے دیکھنے کی تمنا تھی، لیکن ایسے خوش قسمت انسان کم ہیں، جن کی ہر تمنا پوری ہو جاتی ہو،

۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے، میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا مصروف کار تھا، اتنے میں ملازم نے ایک دعوتی رقعہ لاکر دیا، ہمانسو رائے اپنی مشہور زمانہ اہلیہ دیویکا رانی کے ساتھ، یورپ میں کئی سال بسر کرکے اور وہاں انگریزی زبان میں ہندوستانی معاشرت کی ایک فلم "کرما" تیار کرکے وزیر ہند، وزیر اعظم، ممبران پارلیمنٹ اور انگلستان کے سر برآوردہ اصحاب سے خراج تحسین حاصل کرکے مع اپنی بیوی اور فلم کے بمبئی تشریف لائے تھے، اس فلم کی پرائیویٹ نمائش "ریگل سینما" میں

ہو رہی تھی، جس میں چند مخصوص آدمیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں "خلافت" کا
ایڈیٹر بھی تھا۔

اس وقت تک بمبئی کے انگریزی ہالوں میں ریگل سب سے زیادہ مرتب، مہذب، نستعلیق
فیشن ایبل اور آرام دِہ تھا۔ بمبئی میں وہ پہلا سینما ہاؤس تھا جو ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ ہال کی بالکنی دامانِ
باغبان و کفِ گلفروش بنی ہوئی تھی۔ چپہ چپہ جنتِ نگاہ اور گوشہ گوشہ فردوسِ نظر بنائے دستِ صبا
تھا۔ شہر کے بڑے بڑے گھرانوں کی متعدد آرٹ نواز خواتین تشریف فرما تھیں، وہ ان کا حسن
بے حجاب، وہ ان کی زرکار اور زرنگار ساریاں وہ ان کی مسکراہٹیں وہ ان کی چہلیں اور بے باکیاں
وہ ان کی عشوہ طرازیاں اور دلربائیاں، کبھی ساری کے پلو کو ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ
گر جانے دینا، اور توجہ بھی نہ کرنا۔ کبھی بالوں کی لٹوں کا رخِ روشن کو چھپا لینا، جیسے چاند گہن میں آگیا،
اور پھر گردن کے ایک جھٹکے، یا دستِ نازک کی ایک جنبش سے، ان سرکش زلفوں کو گردن اور
پشت کی زینت بنا لینا۔ رنگ و بو کے اسی عالم میں گھنٹی بجی، پردہ گرا، ریشمی گل ہو گئیں، اور تاریکی
چھا گئی۔ اب ہم کرما دیکھ رہے تھے۔ جس کی ہیروئن دیویکا رانی تھیں، اور ہیرو ہمانسو رائے۔

دو گھنٹے کے بعد تماشا ختم ہوا۔ آگے کی صف میں جو حضرات بیٹھے تھے، ان میں سے
ایک کو زبردستی اپنی طرف کھینچ کر ایک سیاہ رنگ، دبیز جسم، اور بڑی بڑی آنکھوں والی عورت
نے ——— جو بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکی تھی ——— اپنے سینے سے لگا لیا،
اور بڑی روانی سے انگریزی میں اُسے مبارک باد دی، اس نے بھی انگریزی لب و لہجہ میں بڑی
ستھری انگریزی میں ممنونیت اور تشکر کے جذبات کا اظہار کیا ——— وہ مہ پارہ دیویکا رانی تھی
اور "چہل سال عمرِ عزیزت گزشت" سے کہیں پرے پہنچ چکنے والی خاتون مسز سروجنی نائیڈو۔

کچھ دنوں کے بعد، بمبئی میں کانگریس کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ کانگریس کی مجلس مضامین کا جلسہ ہو رہا
تھا نہیں، کانفرنس سنبھالے میں بھی اسٹیج کے بالکل پاس پریس سرکل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں
مسز سروجنی نائیڈو تقریر کے لئے آئیں، ریگل کے مقابلے میں آج کا رنگ بالکل بدلا ہوا تھا، وہاں
وہ ایک عورت کی حیثیت سے بن ٹھن کے آئی تھیں، وہاں رنگینی تھی، یہاں سادگی، تقریر کیلئے
کھڑی ہوئیں، معمر بھی، اور بدور جسم، ایک ساڑی میں ملبوس تھا۔ بازو اور بانہیں عریاں، وہ تقریر کیلئے
ہاتھ اٹھاتی تھیں، بازو کی لٹکی ہوئی کھال، ہاتھ کے ساتھ ساتھ تھرکتی تھی جس میں کوئی آرٹ نہ تھا۔
جو بھیانک بڑھاپے ——— دورِ انحطاط ——— کی غمازی کر رہی تھی وہ تقریر کر رہی تھیں،

اور میں آج سے چوبیس سال پہلے کی وہ تصویر آنکھوں میں جمائے ہوئے تھا، جو علی گڑھ میگزین میں آغا حیدر حسن دہلوی نے کھینچی تھی، ماضی اور حال میں کتنا زبردست فرق تھا، جوانی اور بڑھاپے کا فرق! کتنا عجیب اور تکلیف دہ فرق، کاش! اس جلسہ میں آغا صاحب بھی ہوتے۔

ولبھ بھائی پٹیل

کانگرس کا آہنی انسان

مسٹر جناح انہیں کانگرس کا "آہنی انسان" کہتے ہیں، بات بھی یہی ہے، کانگرس میں ہر قسم کے لوگ ہیں، جواہر لال کی طرح کڑی کمان بھی، اور جے پرکاش نرائن کی طرح کڑی کمان کے تیر بھی گاندھی جی کی طرح چمکتی ہوئی بجلی بھی، اور سرت چندر بوس کی طرح گرجتے ہوئے بادل بھی، لیکن ان سب میں، اگر کوئی لوہا، اور فولاد ہے، تو یہی ۷۵ سال کا بوڑھا، اور دبلا پتلا آدمی۔

عمر کے ساتھ ساتھ غصہ بھی بڑھتا جاتا ہے، میاں افتخار الدین، اور ڈاکٹر اشرف کو پاکستان کی تائید و حمایت کے جُرم میں، کانگرس کے بھرے اجلاس میں جس طرح جھاڑ بتائی، مسلم لیگ کی مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں سو فیصدی کامیابی پر، بغیر کسی جھجک کے احمد آباد میں اعلان کیا، پاکستان انگریزوں سے نہیں مل سکتا، ہم سے مانگو، ہم سے مانگو گے تو پہلے سول وار کے سمندر میں کودنا پڑیگا، پھر صوبہ کی مجالس آئین ساز کے انتخابات کے بعد، جب صوبوں میں ملی جلی وزارت کا سوال پیدا ہوا، اور مرکز کے لئے بھی یہی سوال اُٹھا، تو اس لوہے نے بغیر کسی لچک کے اعلان کر دیا، ہمارے اور مسلم لیگ کے درمیان بعد المشرقین ہے، کولیشن کیسی؟ ایسے آدمی کو ظاہر ہے، لوہا اور فولاد نہ کہا جائے تو کیا نسیم بہار اور شمیم جانفزا کے نام سے پکارا جائے؟

برعکس نہند نام زنگی کافور!

انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد، جب صوبائی مجالس آئین ساز کے انتخابات شروع ہوئے، تو اگرچہ مسلم لیگ صلح و مفاہمت کی جویا تھی، لیکن کانگرس کی طرف سے حسب موقعہ خفیہ اور اعلانیہ دراندازیوں اور افتراق انگیزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، بمبئی کے ایک سربر آوردہ قومی کارکن اور ایک مشہور ادارہ کے عہدہ دار مسلم لیگی، اُمیدوار مسٹر طیب طاہر بڑودہ والا موجودہ جج عدالت

خفیہ بیٹی کے مقابلہ میں آزادانہ طور پر کھڑے ہوئے، بھولا بھائی ڈیسائی کی سفارش پر، ولبھ بھائی پٹیل نے آزاد اُمیدوار کی کئی مشکلیں آسان کیں، انتخاب میں وہ ہار گئے اور مولانا شوکت علی کی فہمائش پر، بعد میں غیر مشروط طور پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور اپنے اخلاص اور جوشِ عمل کی بدولت بہت جلد مقامی مسلم لیگ کے اربابِ کار میں ایک نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل کر لی، ایک روز وہ اور میں ورلی کے ساحل پر سہ پہر کے وقت سیر و تفریح کے لیے گئے کچھ دیر ٹہلنے کے بعد، ہم لوگ ساحل کی منڈیر پر بیٹھ گئے، ایک انگریز تیزی کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہوا گزر گیا، ہم نشین نے بتایا، یہ جسٹس بیک ویل ہیں، پھر ایک بوڑھا، لیکن زندہ دل آدمی، ایک نازک اندام خاتون کے ساتھ گزرا، ہم نشین نے سلام کیا اور یہ بوڑھا، دونوں ہاتھوں کو ماتھے سے چھوتا ہوا انقباض کے ساتھ آگے بڑھ گیا، ہم نشین نے بتایا، یہ ولبھ بھائی پٹیل ہیں اور وہ خاتون ان کی میزبان مسز بیلا وتی تھی، مجھے یاد آگیا میں اس شخص کو، اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں، میں دہلی میں ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا، اور یہ بوڑھا ڈائس پر بیٹھا ہوا نوجوان قہقہے لگا رہا تھا، معلوم ہوا، سلام روستائی کے جواب میں انقباض کی وجہ یہ تھی کہ ــ

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

میں عام طور پر صبح کے چار بجے بیدار ہوتا ہوں، اور ساڑھے چار بجے، صبح کی سیر کو نکل جاتا ہوں، پانچ چھ میل کا گشت کر کے گھر واپس آتا ہوں، اس دوران میں ایک آدھ چکر میرین ڈرائیو کے طویل اور پُر فضا ساحل کا بھی لگاتا ہوں، واپسی پر کئی بار میں نے ولبھ بھائی پٹیل کو اپنی صاحبزادی مس منی بین پٹیل کے ساتھ واکنگ کرتے دیکھا لیکن اندھیرے میں صرف شبہ کر کے رہ گیا، یقین نہ ہوا کہ یہ واقعی پٹیل صاحب ہیں کیونکہ میرا خیال تھا یہ دہلی میں رہتے ہیں، ایک روز مجھے بھی دیر ہو گئی، آج اندھیرا نہیں، پو پھٹ چکی تھی، آج شبہ یقین سے بدل گیا، چند اور کھدر پوش جو واکنگ کر رہے تھے وہ اپنے سردار کو دیکھ کر رک گئے۔ اور دور سے "جے ہند" کہہ کر سلام کے لئے ہاتھ اٹھائے سردار نے حسبِ عادت، دونوں ہاتھوں کو ماتھے تک لے جا کر سلام کا جواب دیا، مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا، آج اس کے چہرہ پر انقباض نہیں تھا، مسرت تھی۔

مسٹر لیسین نوری

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز

بمبئی کے مشہور مہا بھائی اخبار "فری پریس جرنل" کے ایڈیٹر مسٹر سدانند نے فسادات بمبئی سے متعلق کچھ ایسے مقالات شائع کئے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب مولانا شوکت علی کے اشارہ سے ہوا ہے، وہی اس فساد کے ذمہ دار ہیں، فری پریس کے ان مقالات کا اثر یہ ہوا، کہ مولانا شوکت علی کو دوسرے حلقوں میں بھی متہم کیا جانے لگا، چنانچہ کارپوریشن کے میئر نے جو صلح کی کمیٹی بنائی تھی اس میں مولانا شوکت علی بھی تھے، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے اس کمیٹی میں ایک تقریر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کئے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا، کہ یہ حضرت بھی مولانا ہی کو فساد بمبئی کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں، مولانا شوکت علی "ایسی صلح کمیٹی پر لعنت" کہہ کر واپس چلے آئے۔ دوسرے روز پھر فری پریس نے نمک مرچ لگا کر، ایک ایسا ہی مضمون لکھ مارا، اس سے پہلے کے مقالات میں وہ مولانا شوکت علی کے ساتھ ساتھ خلافت کے اہل کاروں کے بارے میں بھی ایک بے بنیاد افسانہ شائع کر چکا تھا، کہ تلاشی لینے پر ان کے قبضہ سے "خون آلود چھریاں برآمد ہوئیں"۔ بہر حال اب مولانا کا پیالۂ صبر چھلک چکا تھا، انہوں نے اپنے مشیران قانونی سے صلاح لے کر بالآخر فری پریس کے ایڈیٹر مسٹر سدانند کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی اور توہین کا مقدمہ دائر کر دیا۔

اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے شوکت صاحب کی نظر انتخاب نوری صاحب پر پڑی، وہ ہر پیشی پر احمد آباد سے تشریف لاتے تھے، اور دوسرے روز واپس چلے جاتے تھے، شوکت صاحب نوری کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، وہ احمد آباد سے بمبئی آتے تھے، خواہ اپنے ذاتی کام کے سلسلہ میں آئے ہوں، یا کسی اور مصروفیت کے سبب، شوکت صاحب اصرار کے ساتھ انہیں خلافت ہاؤس میں ٹھہراتے تھے، انکی پُر تکلف دعوتیں کرتے تھے۔

مقدمہ میں نوری صاحب کی بحث کچھ زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوئی، تو شوکت صاحب نے

کشتی نما ٹوپی، لیکن وزارت قبول کرتے ہی انہوں نے ان تعیشات کو لات ماری، اور خاکساری پر اُتر آئے۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔

منصب وزارت پر فائز ہونے کے بعد کلیان میں ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر نوری نے کہا "بڑی شرم کی بات ہے کہ ہنڈیا پکائے کوئی اور کھانے کے لیے مسلمان بھی تیار ہو جائیں۔ آزادی کی جدوجہد کر رہی ہے، کانگریس، مسلمان آزادی کے لئے تو کچھ کرتے نہیں، آزاد ہندوستان میں اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا یہ تقریر پڑھ کر مولانا شوکت علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اتفاق سے دوسرے روز، نوری صاحب بمبئی تشریف لاتے حسب عادت شوکت صاحب سے بھی ملنے آئے، شوکت صاحب نے بہت بُری طرح ڈانٹا، اور کہا تم مسلمانوں کے نام فرنویس ہو، تم محض وزارت کے لیے مسلمانوں کو بُرا بھلا کہتے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیئے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے ہنڈیا ہم نے پکائی ہے آزادی کی جدوجہد ہم نے کی ہے۔ قربانیاں ہم نے دیں، ہندوؤں میں آزادی کا جذبہ ہم نے پیدا کیا ہے۔ ہم نے گاندھی کو گاندھی بنایا ہے، ہم نے کانگریس کو کانگریس بنایا ہے، ہم ہیں وہ جنہوں نے خلافت کی تحریک چلائی اور انگریزوں کا ناطقہ تنگ کر دیا، تم ہمارے بارے میں کہتے ہو، کہ ہم پکی پکائی ہانڈی میں حصہ لگاتے ہیں، مگر اس کے پکانے میں حصہ نہیں لیتے!"

نوری صاحب خاموش بیٹھے تھے، اور مولانا شوکت علی شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ اس سے قبل میں نے مولانا شوکت علی کو اتنے جلال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۱۹۳۸ء کے آخر میں مولانا شوکت علی کا انتقال ہو گیا۔ انہی کی سراپا محبت و مروت ذات تھی جو ہجوم مخالفت کے باوجود مجھے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ اب مخالف بہت تھے، سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا خلافت سے الگ ہو جاؤں گا۔ لیکن ابھی اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنا سکا تھا، کہ مولانا عرفان کا بھی ۱۹۳۹ء کے شروع میں انتقال ہو گیا، اور آخر کار میں نے ذاتی کاروبار کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا، کیونکہ خلافت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو نوری صاحب کی دوستی کو خلافت کی پالیسی پر مقدم رکھنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ میری ان کی اکثر ان بن ہوا کرتی تھی۔ اسی اثنا میں سر کریم بھائی ابراہیم کی زیر صدارت

ایک جلوس نکلا، جس پر کانگریسی وزارت کی پولیس نے اندھا دھند گولیاں چلائیں، میں نے خلافت میں اس حادثہ پر ایک سخت مقالۂ افتتاحیہ لکھا، اور لکھا کہ کانگریس عدم تشدد کی علمبردار اور پرستار ہے، لیکن فوج کی گولیوں اور پولیس کی لاٹھیوں کے بغیر وہ امن وامان قائم کر سکتی ہے، نہ ضبط و نظام۔ نوری صاحب یہ مضمون لے کر خلافت ہاؤس آئے اور دھمکی دی کہ اگر اس طرح کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا، تو کانگریس ہی سے نہیں مجھ سے بھی بگڑ جائے گی، اور ہمارے باہمی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ یہ تہدید کام کر گئی، ارباب اقتدار مجھ سے لڑ پڑے۔ اور معاملات نے یہاں تک تلخ صورت اختیار کر لی کہ میں نے کام ترک کر دیا، پھر بعض اصحاب بیچ میں پڑے اور پھر میں نے عارضی طور پر کام شروع کر دیا۔

نوری صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں خلافت ہاؤس ترک کر رہا ہوں تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں اپنی رائے بدل دوں، لیکن میں نہ مانا، اتفاق سے ریڈیو میں ایک جگہ خالی ہوئی میں نے درخواست دہلی بھیجدی، نوری صاحب کو معلوم ہوا، انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ میری اخلاقی امداد کی اور حکام ریڈیو تک میری سفارش پہنچائی، گویا نہ میں نے انکی کبھی مخالفت کی نہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی، سنگین اور بنیادی اختلافات کے باوجود اخلاقی امداد دینا اور پھر سب کچھ بھول جانا نوری صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جسکی بنا پر میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔ میں کانگریسی مسلمانوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ نوری صاحب کے مسلک کی مسلسل مخالفت میں برابر کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہوں گا، لیکن نوری صاحب کی اس لئے عزت کرتا ہوں کہ وہ اختلافات کی حدود سے واقف ہیں۔

ڈاکٹر اشرف

ایک دلچسپ اور خوشگوار داستان

ایک زمانہ تھا، کہ ڈاکٹر اشرف، کانگریس کے صدر دفتر الہ آباد "آنند بھون" میں ایک ذمہ دار عہدے پر مامور تھے، اور مختلف اخبارات میں کانگریس کی حمایت اور مسلم لیگ کی، مجلس خلافت کی مولانا شوکت علی کی سرگرم مخالفت کیا کرتے تھے، انکی کانگریس زدگی سے متاثر ہوکر میں نے خلافت میں کئی کالم کا ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا "بخدمت اشرف"، پانچویں یا چھٹے روز ایک لفافہ ملا کھول کر پڑھا، تو معلوم ہوا، ڈاکٹر اشرف کا خط ہے، اس خط میں میرے مقالہ کی جی کھول کر داد دی گئی تھی، اس کے انداز تحریر، اور طرز استدلال کو سراہا گیا تھا اور پھر "جواب مضمون" پیش کیا گیا تھا اب تو سلسلہ قائم ہوگیا، میں مضمون پر مضمون لکھ رہا تھا، اور ڈاکٹر صاحب خط پر خط، نہ میں تھکتا تھا نہ وہ تھکتے تھے وہ جواہر لال کے "داعی مطلق" تھے اور میں مولانا شوکت علی کا نقیب۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب سے سیاسی اختلافات کے باوجود "شوق" مراسم، بذریعہ خط وکتابت قائم ہو گئے، مولانا شوکت علی کے انتقال کے بعد کانگریس کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں وہ بمبئی آئے خلافت ہاؤس بھی تشریف لائے، اور بڑی دیر تک تشریف فرما رہے، گفتگو کا موضوع وہی کانگریس اور مسلم لیگ تھا۔

اب تک ڈاکٹر صاحب، کانگریس سے الگ نہیں ہوئے تھے، لیکن گفتگو کے دوران میں اندازہ ہوا کہ الگ ہو سکتے ہیں، وہ اب مسائل کو لیڈروں کی عینک سے نہیں دیکھ رہے تھے، عوامی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے، اور زمین ان کے پاؤں کے نیچے سے کھسکنے لگی تھی، لیکن آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر، بلاارادہ!

۱۹۳۹ء کے آخر میں میں نے روزنامہ ہندوستان نکالا۔ اور پھر خط وکتابت شروع ہو گئی، اب ڈاکٹر صاحب کانگریس سے الگ ہو چکے تھے، لیکن اپنا مسلک ابھی واضح

طور پر متعین نہیں کر پائے تھے۔ کچھ روز بعد وہ کمیونسٹ ہو گئے اور اب ان کی قوت تقریر و تحریر، کمیونزم کی حمایت میں، کانگریس کی قیادت کی مخالفت میں مسلم قوم کے حق خود ارادیت کی تائید میں صرف ہونے لگی۔

شکر اللہ کہ میانِ من داد صلح فتاد!

بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس اگست ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں "ہندوستان خالی کر دو" کی تجویز منظور ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اشرف کانگریس کے رویّے سے اختلاف کے باوجود شریک ہوئے تھے اور بڑی ستھری اور سلجھی ہوئی تقریر کی تھی، پھر وہ بمبئی میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء کے اجلاس کانگریس میں بھی وہ شریک ہوئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کے حق خود ارادیت، پاکستان اور مسلم لیگ کی ترجمانی میں ایسی معرکہ آرا مدلل اور شستہ تقریر کی تھی، جس نے ایک سماں پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ بار بار مداخلت کی جا رہی تھی، لیکن یہ مست چلا اپنی دھن میں مست تھا، اور ایک نہ رکنے والے دریا کی طرح رواں دواں تھا۔

اب ڈاکٹر صاحب بمبئی میں ہیں، یہاں آنے کے بعد، ان کے جوہر خطابت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ تقریر بے دھڑک کر سکتے ہیں، بڑی دیر تک اس کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں، لیکن یکساں خروش اور ہم آہنگی کے ساتھ۔ ان کی تقریر کی یہ خصوصیت ہے، کہ وہ کہیں سے کمزور نہیں پڑتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک پُرشور آبشار ہے جو بہہ رہا ہے، پوری یکسانیت تسلسل اور ہم آہنگی کے ساتھ!

پورن چند جوشی

ایک انقلابی ـــــ ایک مدبّر

ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں پورن چند جوشی ایک مقام خاص پر فائز ہیں۔ ہندوستان کے غیر مسلم رہنماؤں میں پورن چند جوشی، میری نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ کو یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ "کیوں؟" میں اس حق کو تسلیم کرتا ہوں، اور اسی سوال کا جواب دے رہا ہوں۔

یوں تو انقلاب روس کے بعد سے ہندوستان میں کئی لوگوں نے اشتراکیت کا علم اٹھایا لیکن چوم کر چھوڑ دیا۔ ایک زمانہ تھا کہ یادش بخیر مسٹر فرید الحق انصاری بیرسٹرایٹ لا دہلی ہندوستان کے سب سے بڑے اشتراکی تھے، یہ بھی یاد رہے کہ کافی عرصے تک، جواہر لال نہرو بھی مزدوروں کے طبقہ میں پہنچتے رہے لیکن بہت جلد یہ دور ختم ہو گیا، اشتراکیت ان کا ساتھ نہ دے سکی، یا وہ اشتراکیت سے بیزار ہو گئے، یا دونوں باتیں ایک ساتھ عمل پذیر ہوئیں۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے، اور عافیت اسی میں ہے، کہ تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مولانا حسرت موہانی اب تک اشتراکی ہیں، لیکن وجدانی اور جذباتی طور پر، علمی و عملی طور پر نہیں۔

میرا خیال ہے پورن چند جوشی وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اشتراکیت کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر اختیار کیا، اور اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی، ان کی زندگی میں کئی طوفانی دور آئے، لیکن اپنے مسلک سے ہٹنے کے بجائے وہ اسی میں اور زیادہ پختہ ہو گئے، وہ ہندوستان کے پہلے شخص ہیں، جس نے تکلف برطرف کر کے صرف اشتراکیت کو، مزدوروں اور کسانوں کی خدمت کو، سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنایا، اور ہر قسم کی تعزیرو عقوبت سے بے نیاز ہو کر نہایت استقلال و استقامت کے ساتھ اسے فروغ دینے میں منہمک ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کی قلیل مدت میں کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کی منظم مضبوط اور فعال تحریک بن گئی۔

جوشی کا دوسرا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی جماعت ترتیب دی، جس میں نہایت سلجھے ہوئے دماغ کے ہندو اور مسلمان موجود ہیں، اور یہ ہندوستان کی واحد جماعت ہے جس کے افراد واقعی تعصب سے دُور ہیں، کانگرس کے لیڈروں جواہر لال اور گاندھی جی تک کو کھرچیے تو وہ اندر سے کٹر "ہندو" برآمد ہوں گے، لیکن اس جماعت کے ہندو ٹھنڈے دل سے تعصب اور ہٹ دھرمی کو دور رکھ کر، مسلمانوں کے مطالبات پر غور کرتے ہیں اور جنہیں مناسب سمجھتے ہیں ان کی تائید اپنی شہرت اور زندگی کو خطرہ میں ڈال کر کرتے ہیں، پاکستان کے بارے میں جواہر لال، گاندھی، پٹیل وغیرہ کا خیال یہ ہے کہ یہ برطانوی ایجنٹوں کی تحریک ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان کی آزادی کے راستہ میں روڑے اٹکانا ہے یہ عوام کی تحریک نہیں، خود غرض افراد کی تحریک ہے، لیکن جوشی اور ان کے ہندو رفقاء پاکستان کی ضرورت کو، اہمیت کو، افادیت کو تسلیم کرتے ہیں، وہ اسے خالص عوامی تحریک سمجھتے ہیں، وہ اسے ہندوستان کی آزادی کا واحد حل سمجھتے ہیں، اور پوری جرأت سے کام لے کر کانگرس کو ملامت کرتے ہیں، کہ وہ مسلمانوں کا نہ صرف مسلمانوں کا، بلکہ ہر مستحق قوم کا حق خود ارادیت کیوں نہیں تسلیم کرتی؟

اس اعلاء کلمۃ الحق پر، جوشی پر، ان کے ہندو رفقاء پر، کئی بار مسلح اور منظم حملے ہو چکے ہیں، لیکن جوشی اپنے رفیقوں سمیت اب تک اپنے مسلک پر قائم ہیں۔

جوشی کی تیسری خصوصیت یہ ہے، کہ ان کی جماعت کیلئے بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں ہے، کہ وہ اس ملک کی حکومت پر کانگرس کی طرح قبضہ کرے گی یا ایسا کرنے کی کوشش کریگی، اقتدار و اختیار کی متوقع، موہوم یا ممکن کشش سے محروم ہونے کے باوجود انہوں نے ایسے پختہ کار ذہن و دماغ اپنے گرد جمع کر رکھے ہیں، جو اپنے عقیدہ اور مسلک میں اٹل ہیں۔ آپ آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہونگے فلاں مہا سبھائی کانگرسی ہوگیا، فلاں کانگرسی مہا سبھائی بن گیا۔ فلاں احراری نے خاکساری بیلچہ اٹھا لیا۔ فلاں خاکسار نے مجلس احرار کے دامن میں پناہ لے لی، مسلک اور نصب العین کی یہ پرجوش تبدیلیاں، اخلاص اور زور استدلال کی اتنی رہین منت نہیں ہوئیں، جتنی آئندہ کے نفع بخش یا خوش آئند امکانات کی، لیکن کمیونسٹ پارٹی میں یہ بات نہیں ہے، آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہوگا، کہ فلاں کمیونسٹ کانگرسی ہوگیا یا مہا سبھا میں چلا گیا، یا مسلم لیگ میں آگیا، یا احراری بن گیا، یا خاکساری بیلچہ لے کر "چپ راست"

کے نعرے لگا رہا ہے۔ اس لیے کہ یہاں سودا ٹھونک بجا کر کیا جاتا ہے، ایسے لوگ تحریک میں شریک کیے جاتے ہیں جو سیاسی سربلندی اور مالی منفعت کے جذبہ سے آزاد ہوں، جب ایسے لوگ مل گئے، تو وہ اپنا کام کریں گے، یا مسلک بدلیں گے۔

چوتھی اہم ترین خصوصیت جوشی کی یہ ہے، کہ ان میں اعتدال و توازن ہے وہ مخالفین کی گالیاں کھاتے ہیں۔ دیتے نہیں، وہ دشمنوں کے حملے سہتے ہیں کرتے نہیں، وہ مخالفت، مخالفت کے لیے نہیں کرتے، سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ سمجھ نہ سکیں، یا سمجھا نہ سکیں، لیکن مقصد یہی ہوتا ہے، وہ موافقت، اصول کے ماتحت کرتے ہیں، جذبہ اور مروت سے نہیں، وہ پاکستان کے قائل ہیں، لیکن اس کے بعض پہلوؤں کے مخالف بھی ہیں، وہ آزادیٔ ہند کے حامی ہیں، لیکن ان کا طریقہ مختلف ہے، وہ جذبات کی رو میں کبھی نہیں بہتے، جب جواہر لال عبوری حکومت بنانے دہلی جا رہے تھے یہ کہہ رہے تھے، یہ آزادی کا سایہ نہیں ایک جال ہے، جب کابینہ وفد کو گاندھی جی خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ یہ کہہ رہے تھے، یہ برٹش سامراج کا ایک داؤں ہے، اعتدال و توازن بہت بڑی نعمت ہے، اور عام طور پر سیاسی رہنماؤں میں اس کی بڑی قلت ہے۔

ڈاکٹر اشرف کا لڑکا ایک حادثہ کا شکار ہو کر وفات پا گیا۔ اس کے سوم میں شرکت کے لیے میں بھی گیا، آنے والوں کی پیشوائی جوشی کر رہے تھے، میں نے دیکھا، میانہ قد، اور دوہرے بدن کا ایک نوجوان قمیص اور نیکر پہنے خلق و تواضع کی تصویر بنا کھڑا ہے، مصافحہ کیا، تو نرم اور ملائم ہاتھ ہاتھ میں آ گیا، کون کہہ سکتا ہے یہ معصوم بشرہ رکھنے والا شخص اتنا بڑا انقلابی ہے، جس نے انگریزی سامراج کو ناکوں چنے چبوا دیئے، اور اتنا بڑا مدبر ہے، کہ انگریز دشمن ہونے کے باوجود دوران جنگ میں انگریز سے صلح کر لی، اور اتنا بڑا بہادر ہے کہ کانگرس سے نکل آیا لیکن اپنے مسلک سے منحرف نہ ہوا۔ یہ تو کسی مل کا مزدور معلوم ہوتا ہے!

سجّاد ظہیر

"قانون باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم"

سر وزیر حسن سابق چیف جسٹس اودھ چیف کورٹ کے صاحبزادے ہیں۔ ایک بھائی لکھنؤ بار کے سربرآوردہ ممبر اور لکھنؤ کے کامیاب ترین بیرسٹر، دوسرے بھائی، لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر، تیسرے بھائی آئی سی ایس، ان کیلئے بھی یہ سب راستے کھلے ہوئے تھے، چاہتے تو بیرسٹری کرتے، اور لاکھوں کے وارے نیارے کرتے۔ کسی یونیورسٹی کی پروفیسری بھی بہت آسان تھی، جی چاہتا تو آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھتے، اور اس وقت کہیں کے کلکٹر ہوتے، لیکن انھوں نے ان بہترین امکانات کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، کمیونسٹ پارٹی سے رشتہ جوڑا، اور آج بمبئی میں اس کے رکن رکین، اور روحِ رواں بنے ہوئے ہیں، گھر میں سیم و زر کی جھنکار سے کان بڑی آواز نہیں سنائی دیتی، لیکن ان کے کانوں میں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی آواز گونجا کرتی ہے، کئی مرتبہ جیل ہو آئے ہیں، اور موقع آجائے، تو اس سے آگے کی منزل سر کرنے کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔ سجاد ظہیر کا باپ، جواہر لال کے باپ سے بڑا آدمی ہے، خود سجاد ظہیر اپنے علم، قابلیت اخلاص، قربانی، ایثار، عزم و استقامت کسی چیز میں بھی جواہر لال سے کم نہیں ہیں، لیکن وہ جواہر لال بن گئے اور یہ سجاد ظہیر رہ گئے۔ اس لئے کہ وہ وقت کے ساتھ دوڑے۔ اور سجاد ظہیر نے وقت کا مقابلہ کیا، اور اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ آج بھی فرسٹ کلاس میں بے تکلف سفر کرتے ہیں۔ اور یہ تھرڈ کلاس میں راستہ کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف گام فرسا رہتے ہیں۔ وہ آنند بھون کے قصرِ فلک نما میں رہتے ہیں اور یہ ایک تنگ کمرے میں، ایک کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے ہیں، اور اپنی دھن میں مست ہیں، وہ اسٹیج پر آتے ہیں، تو جے کاروں سے فضا گونج اٹھتی ہے، یہ اسٹیج پر آتے ہیں تو پتھروں اور گالیوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے، میرے نزدیک بڑا پن یہی ہے، اور اسی لئے میں سجاد ظہیر کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں،

کہتے ہیں کہ کمیونسٹ لامذہب ہوتے ہیں، صرف لامذہب نہیں ہوتے، مذہب کے دشمن ہوتے ہیں، ہوتے ہونگے، لیکن اگر سجاد ظہیر کمیونسٹ ہیں، تو مجھے اس قول کے ماننے میں تامل ہے۔ ممکن ہے یہ لامذہب ہوں، لیکن یہ مذہب کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ کسی عقیدے سے "دشمنی" کا اظہار وہ لوگ کرتے ہیں، جو ناسمجھ ہوں، ضدی ہوں، اور نئے خیالات قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، یہ شخص اگر ایسا ہوتا، تو ایک بالکل جدید عقیدہ ـــــ کمیونزم ـــــ کو قبول کر کے گہوارۂ عشرت سے، الم کدۂ مشقت میں کیوں کود پڑتا؟ الوان نعمت سے ہاتھ اٹھا کر نانِ شعیر پر قناعت کیوں کر لیتا؟ دنیا کی شادکامیوں سے منہ موڑ کر سخت کامیوں کا خوگر کیوں بن جاتا؟ اگر یہ لامذہب ہیں تو ان کی لامذہبیت کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ رواجی اور موروثی مذہب سے بیزار ہیں۔ اور اس سے کون اہل نظر بیزار نہ ہوگا؟ حقیقی اور اصل مذہب تک ان کی رسائی نہ ہو سکی، وہ جب کبھی بھی سامنے آئے یہ اسکے قبول کرنے میں ہرگز تامل نہیں کر سکتے۔

مشہور ہے کہ یہ "ترقی پسند" ادیبوں کے سرخیل ہیں، اور خود بھی بڑے ترقی پسند ہیں۔ اگر ترقی پسند ادب سے مراد وہ ادب ہے، جو چند آوارہ گرد، فحش گو اور بازاری طبائع کی پیداوار ہے، تو ترقی پسندی کی تہمت سجاد ظہیر پر ایک ظلم ہے، اور اگر ترقی پسند ادب سے مراد وہ ادب ہے جو زندگی کے نئے رجحانات سے بحث کرتا ہو؟ جو زندگی کے واشگاف حقیقتوں کو پیش کرتا ہو، جو زندگی کی کلفتوں کو بیان کرتا ہو، اور راحتوں کا راستہ بتاتا ہو، جو زندگی کی کمزوریوں کو اجاگر کرتا ہو، اور ضرورتوں کو نمایاں کرتا ہو، تو سجاد ظہیر کے ترقی پسند ادیب ہونے پر ذرا بھی شبہ نہیں۔ بلکہ

ہر کہ شک آرد کافر گردد!

میں نے انہیں سب سے پہلے دہلی میں دیکھا، میں جامعہ میں زیر تعلیم تھا یہ دہلی آئے، ڈاکٹر عابد حسین نے اردو اکاڈمی کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا۔ وہاں انہوں نے کمیونزم کے فلسفہ پر ایک تقریر کی۔ علمی اعتبار سے بہت کامیاب تھی، ابھی حال ہی میں تعلیم کی تکمیل کر کے یورپ سے یہ آئے تھے، اور ان کے دل کے "انگارے" فضا میں ابھی دہک رہے تھے۔ نہ وہ خاکستر بنے تھے، نہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی، کہ وہ برق خرمن کا کام دے سکیں۔

پھر جنگ کی ہولناکیوں میں یہ بمبئی وارد ہوئے، کمیونسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں جم کر بیٹھ گئے اور "قومی جنگ" کی ادارت کرنے لگے، یہ بڑا نازک وقت تھا لیکن اس نہایت نازک وقت میں بڑی

پامردی اور استقلال سے انہوں نے پارٹی کے پیغام کی اشاعت جاری رکھی۔ انہوں نے کانگریس کی اس وقت مخالفت کی جب اس کی غلط روی پر ٹوکنے کی، کسی بڑے سے بڑے کانگریسی میں ہمت نہیں تھی۔ اس جرأت خیال کی سزا انہیں اس طرح ملی کہ عدم تشدد کے پرستاروں نے غنڈہ گردی کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ پارٹی کے دفتر پر کئی بار مسلح اور منظم حملے ہوئے، پریس میں آگ لگائی گئی، کتابیں پھاڑ دی گئیں پارٹی کے لوگوں کو اعلانیہ مارا گیا، اور ان پر وحشیانہ حملے کئے گئے۔ لیکن

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ان کے استقلال کے دامن پر کوئی شکن نہیں پڑی۔

ایک لیڈر کی سب سے بڑی صفت یہ ہوتی ہے، کہ وہ کام کے آدمیوں کو اپنے گرد جمع کر سکے، ان سے اور ان کی صلاحیتوں اور اہلیتوں سے کام لے سکے، یہ وصف سجاد ظہیر میں بدرجۂ اتم موجود ہے انہوں نے محدود و مختصر مدت میں ایسے رفقاء کار جمع کر لیے جو ہر بڑے سے بڑے ادارہ کے لیے قابل فخر ہو سکتے ہیں، علی سردار، سبط حسن، منظر رضوی، کیفی اعظمی، کونسا ادارہ ہے جو ان شعلہ بداماں نوجوانوں کو للچائی ہوئی نظر سے نہ دیکھے۔

بڑے ملنسار اور شگفتہ رو آدمی ہیں، کھدّر کے لباس میں ملبوس ایک بلند و بالا قد کا خوبصورت انسان کمیونسٹوں کے جس جلسہ میں مسکرا کر لوگوں سے باتیں کرتا نظر آئے، سمجھ لیجیے یہی ہیں سجاد ظہیر!

آصف فیضی

ایک دلچسپ ادبی اجتماع کا تذکرہ

جٹس بدرالدین طیب جی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لاکالج (بمبئی) کے پرنسپل ہیں، قانون ان کے گھر کا غلام، اور وکالت ان کی خانہ زاد ہے۔ ذہانت اور قابلیت ورثہ میں ملی ہے معقولیت اور شرافت کا ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب اور لٹریچر کا ذوق ان کی سرشت میں داخل ہے، بڑے پاک نہاد، خوش اخلاق سراپا اخلاص، متواضع، ملنسار، اور مرنجاں مرنج شخص ہیں، بمبئی کی انجمن ترقی اردو کے شاندار اجلاس کی شاندار کامیابی میں ان کی محنت اور خلوص کو بڑا دخل تھا، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب انہی کے ہاں فروکش ہوئے تھے۔

بیگم آصف بھی اپنے شوہر کے قدم بہ قدم چلتی ہیں، انہوں نے ایک لٹریری حلقہ قائم کر رکھا ہے، ہر مہینہ اس کا ایک جلسہ ہوتا ہے، جس میں کوئی شخص فرمائشی مقالہ پڑھتا ہے پھر اس پر بحث اور گفتگو اور سوال و جواب، اعتراض اور نکتہ چینی، دوستانہ اور طالب علمانہ انداز میں ہوتی ہے، بڑا ستھرا اجتماع ہوتا ہے، اور بڑے ستھرے لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں موصوفہ کئی مرتبہ ایک مشترک دوست کے ذریعہ مجھے مدعو کر چکی تھیں، لیکن میں اپنی مصروفیتوں کے سبب ہمیشہ آنا کانی کرتا رہا ایک مرتبہ انہوں نے مقالہ پڑھنے کا شدید اصرار فرمایا۔ میں نے "پرانا ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، اور وقت مقررہ پر جلسہ میں پہنچ گیا، اس اجتماع میں بمبئی کے ارباب علم و ادب جمع تھے، فیضی خاندان کی چند باذوق اور ادب شناس بیبیاں بھی موجود تھیں۔

میں نے مقالہ پڑھا، پھر اس پر حاضرین کرام کی طرف سے "لے دے" شروع ہوئی، میں سب کے جواب دیتا رہا۔ ایک صاحب جھاڑ کا کانٹا بن کر پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا، زیر بحث مقالہ سے، لیکن بہت جلد ان کی گفتگو نے تقریر کا رنگ اختیار کر لیا،

اور وہ نئے ادب پر تقریر کرنے لگے۔ ان کی تقریر سُن کر ایک دوست نے جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آہستہ سے فرمایا۔

ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے!

آصف فیضی صاحب بھی اس اطول امل سے عاجز آچکے تھے۔ صاحب موصوف کی تقریر جاری تھی، اور وہ سراپا اشتیاق بنے ہوئے تقریر سن رہے تھے، اور پہلو بدل رہے تھے۔ شباب مالیر کوٹلوی اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے نکات و لطائف سے تنگ آکر آخر انہوں نے تقریر کا سلسلہ ملتوی کیا، تاکہ چائے پی لیں۔ اور پھر اپنے افکار عالیہ کا مظاہرہ شروع کر دیں۔

چائے کا دور جیسے ہی ختم ہوا آصف صاحب مجھے اپنی خاص نشست گاہ پر لے گئے۔ بیگم آصف بھی تشریف فرما تھیں، اور حضرت شباب بھی۔ کچھ دیر تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر آصف صاحب نے فرمایا: میں چاہتا ہوں آپ جسٹس بدرالدین طیب جی کی سوانح حیات قلمبند کریں۔ انگریزی میں کچھ ضروری مواد میرے ایک عزیز کے پاس موجود ہے۔ اسے سامنے رکھ کر طیب جی کی سوانح عمری لکھ دیجئے۔ یہ قرض ہمارے خاندان پر باقی ہے، اور میں جلد از جلد اسے اُتار دینا چاہتا ہوں۔ بیگم آصف نے فرمایا: آپ کی سیرت محمد علی نے یہ جذبہ ہمارے دل میں پیدا کیا ہے۔ میں نے اس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا، اور کہا۔ میں آج کل ایک دوسرے محمد علی جناح کے سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں۔ اس سے فارغ ہو لوں، تو انشاءاللہ بڑے شوق سے اس کام کو انجام دوں گا، لیکن وہ دن ہے، اور آج کا دن کہ آصف صاحب سے پھر ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لیکن میں اپنا وعدہ بھولا نہیں ہوں انشاءاللہ اس کار اہم کو شوق کے قلم اور عقیدت کے جذبہ سے سرانجام دے کر رہوں گا۔

بھولا بھائی ڈیسائی

امپیریل ہوٹل کی ایک یادگار پارٹی

سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک بار میں دہلی گیا۔ شوکت صاحب کی یہ عادت تھی، وہ جہاں جاتے تھے، اپنے ساتھ مجھے بھی لے جاتے تھے، امپیریل ہوٹل میں ممبران اسمبلی اور عمائد شہر کو بھولا بھائی ڈیسائی نے ایک پارٹی دی تھی، وہاں جانے کے لئے وہ جب کار میں بیٹھنے لگے حکم ہوا "آؤ بیٹھ جاؤ!" تعمیل حکم کے سوا چارہ کیا تھا؟ نہ جانا تھا وہاں، مجھی لیکن جانا پڑا۔

اجتماع بہت دلچسپ اور پُر لطف تھا، مولانا شوکت علی، مسٹر جناح، مسٹر سلیمان جج فیڈرل کورٹ، کرنل اور مسٹر رحمان، ڈاکٹر ضیاء الدین، سر عبدالرحیم، کانگریس اور مسلم لیگ پارٹی کے اکثر ممبران موجود تھے، دروازہ پر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی بہ نفس نفیس مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، ان کے صاحبزادہ مسٹر دھیرو بھائی ڈیسائی بھی مہمانوں کی خاطر و مدارات میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ بھولا بھائی چوڑی دار پاجامے، اور کھدر کی شیروانی میں ملبوس تھے۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت اس پر ہوئی، کہ بھولا بھائی نہایت رواں اور سلیس اُردو میں گفتگو کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا، لکھنؤ یا دلّی کے اس ہندو خاندان کا کوئی فرد ہے، جو سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی سے قطعاً ناواقف ہے۔ مخارج کی درستی، الفاظ کی صحت، فارسی، عربی کے الفاظ کا برجستہ استعمال، کون کہہ سکتا تھا، یہ بھولا بھائی ڈیسائی ہیں، جو گجرات کے رہنے والے ہیں۔ اور جن کی مادری زبان گجراتی ہے۔

بھولا بھائی ہندو بھی تھے اور کانگریسی بھی، لیکن ان کے مداحوں، قدر شناسوں میں مسلمان بھی تھے، اور مسلم لیگی بھی، وہ متعصب نہیں تھے، وہ تنگ دل بھی نہیں تھے اس کا اندازہ

اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت میں "ہندو مسلم مساوات" فارمولے کے موجد وہی تھے، جس کی سزا کانگرس ہائی کمان کی طرف سے انہیں ملی، کہ نئے انتخاب میں انہیں کانگرس کے ٹکٹ پر اسمبلی کا امیدوار بننے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔

مسٹر حسن امام

صدر کانگریس، صدر وفد خلافت اور ایک مایۂ ناز قانون داں

مسٹر حسن امام کی قانونی مہارت اور آئینی قابلیت کا ڈنکہ سارے ہندوستان میں بجتا تھا، وہ ایک بہترین وکیل تھے، اپنی قابلیت اور ہمہ دانی کے طفیل، انہوں نے وہ ترقی کی جو لوگوں کے لئے باعث رشک تھی، انہوں نے جب پریکٹس شروع کی تو وہ ایک معمولی وکیل تھے، لیکن بہت جلد ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین قانون میں ان کا شمار ہونے لگا۔ بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ کی آمدنی تھی، بڑے بڑے تعلقہ دار اور جاگیردار منت اور خوشامد کر کے انہیں اپنے مقدمہ کی پیروی پر راضی کرپاتے تھے وکالت کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی سیاسیات سے بھی وہ دلچسپی رکھتے تھے جب تک کانگریس عملی سرگرمیوں سے الگ رہی وہ اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے بلکہ صدارت کے منصب بلند پر بھی فائز ہوئے، کچھ عرصہ تک کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بھی رہے، معاملات خلافت کے سلسلہ میں، جو پہلا وفد ہندوستان سے لندن حکومت کی طلبی پر، سیٹھ چھوٹانی کی طرف سے بھیجا گیا تھا، وہ انہی کی سرکردگی میں گیا تھا، اور انہوں نے نہایت قابلیت سے مسلمانوں کا کیس پیش کیا تھا، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ مصارف سفر حکومت کے ذمہ تھے، دوسرے ارکان نے لے لئے، لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا، کیونکہ جس پیمانہ سے مل رہے تھے، وہ ان کے شایان شان نہ تھا، اور اسے قبول کرنے میں یہ اپنی توہین محسوس کرتے تھے۔

انگریزوں سے انہیں تلخی دشمنی تھی، ریلوے کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں اکثر ان سے اور بڑے بڑے انگریزوں سے دو دو ہاتھ ہوئے اور جیت ہمیشہ انہی کی رہی، ریل کے ڈبہ میں نہ فوج ہوتی تھی، نہ پولیس، بڑے اطمینان اور یکسوئی سے یہ انگریزوں کا شکار کرتے تھے لیکن از خود نہیں، اسی وقت جب انہیں چھیڑا جاتے اور ان کی حمیت و خودداری کو چیلنج کیا جائے، اس سلسلہ میں کئی بار ان پر مقدمے بھی چلے، لیکن قانون ان کا زرخرید غلام تھا، صاف

بچ کر نکل آئے۔

تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز زمانہ میں جس طرح اور بہت سے لیڈر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ بھی پبلک پلیٹ فارم سے غائب ہو گئے، دوسرے نقصان میں رہے، لیکن یہ فائدہ میں رہے کیونکہ ان کی پریکٹس، دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی، پہلے اگر ہزاروں کماتے تھے تو اب لاکھوں کمانے لگے۔

گرمی کا موسم تھا، دوپہر کا وقت کہ ایک دوست گھبراتے ہوئے آئے، کہنے لگے "چلتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں" فرمایا، چیف کورٹ آج وہاں ناپارہ کے مقدمہ کی پیشی ہے، ایک طرف سے مسٹر جناح پیروی کر رہے ہیں، دوسری طرف سے مسٹر حسن امام!" میں نے کہا "ضرور چلوں گا!" چنانچہ عین دوپہر کے عالم میں ہم دونوں ندوہ کے حدود کو پھلانگتے ہوئے، پاپیادہ چیف کورٹ پہنچے۔

جسٹس گوکرن ناتھ مصرا کی عدالت میں مقدمہ جاری تھا، حسن امام اور جناح کی وکیلانہ نوک جھونک دیکھنے کیلئے کالج اور یونیورسٹی کے بہت سے طلبہ ٹوٹ پڑے تھے، نوآموز وکیلوں کا بہت بڑا قافلہ موجود تھا، ایوان عدالت کھچا کھچ معزز حاضرین سے بھرا ہوا تھا، مسٹر جناح نہایت شان سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، اور خاموشی سے کارروائی دیکھ رہے تھے، کبھی کبھی اٹھ کر ایک آدھ لقمہ دے دیتے تھے، انہیں کل بحث میں حصہ لینا تھا، آج نہیں۔

میں جب عدالت میں پہنچا، تو میں نے دیکھا، ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ ایک غیر دلچسپ لیکن وکلا کے لئے وجد انگیز حد تک دلچسپ — تمثیلاً یوں سمجھئے، آپ پکا گانا نہیں جانتے آپ کے سامنے اگر پکا گانا گایا جائے، تو وہ سامعہ خراش ہی ثابت ہو گا، لیکن ایک دوسرا آدمی اس فن سے واقف ہے، وہ سر دھننے لگے گا۔ تقریر کر رہے ہیں، موٹا بدن، غرارے دار پاجامہ ایک تنگ سی شیروانی زیب تن، سر پر شاید محرم کی مناسبت سے ہلکے ہرے رنگ کی ایک دوپلی ٹوپی، میرے دوست بار بار ان کی طرف اشارہ کرتے تھے، اور میری نگاہیں اس ایوان میں حسن امام کو ڈھونڈ رہی تھیں، آخر تھک کر میں نے پوچھا، کہاں ہیں آپ کے حسن امام صاحب! انہوں نے کہا گھنٹہ بھر سے اشارے کر کر کے بتا رہا ہوں، اب تک دیکھ ہی نہیں پائے، یہ تقریر کون کر رہا ہے؟"

سر علی امام

خود دار ــــ غیور ــــ دور اندیش

سر علی امام ہندوستان کے مایۂ ناز قانون داں تھے، لیکن ان کی زندگی کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا نہیں تھا، وہ خود دار بھی تھے، اور قومی خادم بھی، مذہبی حمیت بھی ان کے اندر ایک مخلص مسلمان کی طرح موجود تھی، لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے بقول مولانا محمد علی مرحوم ان سے وعدہ کیا تھا، کہ پٹنہ ہائی کورٹ جب قائم ہوگا، تو آپ اس کے پہلے چیف جسٹس بنائے جائیں گے، پھر جب پٹنہ ہائیکورٹ قائم ہوگیا تو ایک انگریز چیف جسٹس بنا دیا گیا، اور انہیں ججی کی کرسی پیش کی گئی، انہوں نے ایک خود دار انسان کی طرح نہایت شان کے ساتھ یہ پیشکش شکریہ کے ساتھ مسترد کردی۔

دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں ہندوستانی مندوبین کا نیا بیچ لندن بھیجا گیا، اس میں منجملہ اور لوگوں کے علامہ اقبال اور سر علی امام بھی تھے دونوں ایک ہی جہاز پر بمبئی سے روانہ ہوئے، علامہ اقبال اپنے تاثرات و مشاہدات سفر، راستہ سے لکھ لکھ کر، لاہور کے روزنامہ انقلاب کو بھیجا کرتے تھے، اور وہ نہایت نمایاں طور پر اخبار مذکور میں شائع ہوا کرتے تھے، پہلے خط میں علامہ نے سر علی امام کے بارے میں لکھا، کہ جب ہمارا جہاز عدن کی طرف سے گزرا تو دیار حبیب کا خیال کر کے سر علی امام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور وہ اپنا جوش گریہ ضبط نہ کر سکے۔

میں نے انہیں ۱۹۲۸ء میں دیکھا، لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس، نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری کی زیر صدارت منعقد ہو رہی تھی، اس کانفرنس میں ہندوستان کے ہر مکتب خیال کے لیڈروں نے شرکت کی تھی، چنانچہ معتدلین کا گروہ بھی موجود تھا، ان میں سر علی امام بھی تھے۔

کانفرنس میں عام طور پر تقریریں انگریزی زبان میں ہو رہی تھیں۔ مولانا شوکت علی اور پنڈت جواہر لال نہرو تک نے انگریزی میں تقریر کی، لیکن سر علی امام جب اسٹیج پر آئے تو انہوں نے صاف اور ستھری اردو میں تقریر کی، اور بڑی اچھی تقریر کی تقریر پر بہاری لہجہ غالب تھا۔ صوبہ بہار کے مسلمان بھی اردو ہی بولتے ہیں، لیکن ان کے لہجہ میں ایک خاص قسم کی دلکشی اور انفرادیت ہوتی ہے اور میں ان کی تقریر بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا، وہ عام طور پر انگریزی لباس میں ملبوس ہو کر جلسہ میں شریک ہوا کرتے تھے، لیکن آج وہ نوابان اودھ کے خاندان کے ایک ممتاز فرد نظر آ رہے تھے، غرارے دار پاجامہ، انگرکھا دوپلّی ٹوپی، اپنے بھائی مسٹر حسن امام کے مقابلہ میں یہ زیادہ وجاہت اور دلکشی رکھتے تھے، مہاراجہ محمود آباد کے اثر سے ان پر نیشنلزم کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔

سر علی امام کی زندگی کا سب سے قابل فخر کارنامہ یہ ہے، کہ وہ ریاست حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے، اور اس منصب پر فائز ہو کر انہوں نے عیش و تنعم کی زندگی بسر نہیں کی، بلکہ اس اسلامی ریاست کے فروغ اور ارتقاء کے لیے وہاں کے مسلمانوں کی پستی کو دور کرنے کے لئے انتھک اور ٹھوس محنت کی آج بھی حیدرآباد کے لوگ انہیں یاد کرتے ہیں، اور شکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اگر سازشوں کے جال میں انہیں نہ پھنسایا جاتا، اور آزادی کے ساتھ انہیں کام کرنے کا موقع دیا جاتا، تو کوئی شبہ نہیں، وہ حیدرآباد کی کایا پلٹ دیتے، آج جس منزل پر حیدرآباد نظر آ رہا ہے، وہ اگرچہ بڑی حد تک قابل اطمینان ہے، لیکن وہ اس سے آگے اُسے لے جاتے!

ڈاکٹر بذل الرحمٰن

مسلمانانِ بمبئی کا سرسیّد

بچپن کا واقعہ ہے، ندوہ میں مجھے ابھی داخل ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ نے محفل میلاد منعقد کی۔ ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ پڑوسی تھے۔ اس لیے دونوں کے سوشل تعلقات قائم تھے، جمعہ کی نماز ندوہ میں پڑھتے تھے، علمی، مذہبی جلسوں میں بھی وہ پورے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے، اسی طرح جب ان کے ہاں کوئی مشاعرہ یا جلسہ ہوتا تو وہ ندوہ کے طلبہ کو بھی دعوت دیتے۔

چنانچہ اس محفل میلاد میں ندوہ سے کچھ طلبہ گئے، صرف ایک ہی تقریر رسالت مآب کی حیات طیبہ پر ہوئی، وہ بھی انگریزی میں، ایک نوجوان شخص کوٹ پتلون پہنے، مخیری اور طراری کے ساتھ حقائق ومعارف کے دریا بہا رہا تھا؛ میں تو انگریزی کیا سمجھتا، لیکن یہ دیکھ رہا تھا کہ انگریزی داں حاضرین، طلبہ اور پروفیسر سب بڑی محویت کے ساتھ بیان سُن رہے تھے، معلوم ہوا، یہ ڈاکٹر بذل الرحمٰن ہیں، جو یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ کے صدر ہیں۔

کئی برس گزر گئے۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں استاد مرحوم، مولانا حیدر حسن خاں محدث دار العلوم کو، کسی نایاب عربی کتاب کی تلاش تھی، انہوں نے ندوہ کے کتب خانہ میں تلاش کیا نہیں ملی، یونیورسٹی کی لائبریری میں دیکھا، وہاں بھی سراغ نہیں لگا، ایک روز انہوں نے فرمایا "چلو میاں ذرا بذل الرحمٰن کے ہاں چلیں، وہاں شاید مل جائے، میں نے کہا چلئے۔ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے، بڑے تپاک واخلاق سے پیش آئے، بڑی دیر تک علوم عربیہ کے مستقبل، نصاب، تعلیم، طرز تعلیم وغیرہ پر گفتگو ہوتی رہی، اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی، کہ ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب ان "ڈاکٹروں" میں نہیں ہیں، جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن جنہیں فہرست کتب کے علاوہ کچھ نہیں معلوم ہوتا، جو کسی فن پر گفتگو نہیں کر سکتے،

جن کی تہی دامنی معمولی طالب علم سے زیادہ عبرت انگیز ہوتی ہے۔ واپسی میں مولانا سے میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا: میاں اس کا باپ بھی عالم ہے، اور یہ بھی عالم ہے یہ بہت بڑی سند تھی، مولانا حیدر حسن خاں جس کے علم کا اعتراف کر لیں اس کا پایۂ علم ہیچ نہیں ہو سکتا، وہ بڑے بڑے عالموں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کا ذکر عزت کے ساتھ کر رہے تھے۔

کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا، ڈاکٹر صاحب بمبئی کے ایک نئے "اسمٰعیل کالج" کے پرنسپل مقرر ہو گئے ہیں، افسوس ہوا کہ لکھنؤ یونیورسٹی ایک گوہر قابل سے محروم ہو گئی، پھر ۱۹۳۲ء میں جب میں بمبئی آیا تو یہاں آکر معلوم ہوا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی بد قسمتی اور مسلمانانِ بمبئی کی خوش قسمتی کا دور ساتھ ساتھ شروع ہوا، ڈاکٹر صاحب کے اصل جوہر یہاں آکر کھلے، تعلیمی اعتبار سے بمبئی کے مسلمان بہت پسماندہ تھے وہ تجارت کی زندگی بسر کرتے تھے، اور تجارت کے لیے علم کی ضرورت ذرا بھی محسوس نہیں کرتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہاں آکر خیالات کا رُخ موڑ دیا، اور بمبئی کے مسلمانوں میں نئی تعلیمی زندگی پیدا کر دی، انہیں بہت سے تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور سربراہی کا موقعہ ملا، آنریری طور پر انہوں نے خدمات انجام دیئے۔ اور اپنی ان تھک محنت خلوص اور دردِ دل سے کام لے کر انہیں بامِ رفعت پر پہنچا دیا، آج وہ بمبئی کے سرسید مانے جاتے ہیں، انہوں نے جس خاموشی و استقلال کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمتیں انجام دی ہیں، انہیں بمبئی کے مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے، اور اس کا ثبوت یہ ہے، کہ اب بذل الرحمٰن میموریل" قائم کرنے کی تحریک زور شور سے شروع ہو چکی ہے، اور ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہو گی۔

اسمٰعیل کالج میں سالانہ اسپورٹس کا جلسہ تھا، پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی دعوت پر میں بھی اس میں شریک ہوا تھا، کالج میں مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔ اس کا دروازہ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے کھلا ہے، ہندو، مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے، ہندو طلبہ اور طالبات کی بہت بڑی تعداد یہاں تعلیم حاصل کرتی ہے، اسپورٹس کے میدان میں بھی دونوں قوموں کی دونوں جنسیں موجود تھیں، اور اپنے کمالات کا اظہار کر رہی تھیں، تقسیم انعامات کی رسم ڈاکٹر صاحب نے انجام دی، اور اس موقعہ پر انعامات دینے سے پہلے ایک بڑی دل آویز اور شگفتہ تقریر بھی ارشاد فرمائی، یہیں سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار اور "اندلسیات" کے مشہور

محقق اور عالم، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، کافی بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ہمت اب تک جوان تھی۔

ڈاکٹر صاحب چھوٹے آدمی تو کبھی بھی نہ تھے، لیکن بمبئی آنے کے بعد بہت بڑے آدمی بن چکے ہیں، مصروفیت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے، پرنسپل کی شدید مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ملت کے تعلیم اور تعمیری اداروں کی سربراہی میں بھی وہ پورا وقت صرف کرتے ہیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ "اہل نظر" امداد و اعانت کی درخواستیں لے لے کر بھی ان کے پاس پہنچتے رہتے ہیں جانتے ہیں اس در سے کوئی خالی نہیں واپس جاتا، کسی سے سفارش کرنا، اگر خلاف مصلحت سمجھیں گے تو اپنی جیب خالی کر دیں گے۔

ایک مرتبہ مجھے "صداقت نامہ" کی ضرورت ایک کام کے سلسلہ میں پڑی، اور یہ ضروری تھا، کہ صداقت نامہ کسی گزیٹیڈ افسر کا ہو، ملا کی دوڑ مسجد میں نجیب صاحب کے پاس گیا، انہوں نے کہا، آؤ کھانا کھالیں، پھر چلتے ہیں، میں نے کہا کھانا پھر دیکھا جائے گا، پہلے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلیے، مسکراتے ہوئے فرمایا، نہیں بھئی کھانا کھا کر چلیں گے۔

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش!

تھوڑی دیر کے بعد مجھے لے کر، وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے، اس سے قبل ڈاکٹر صاحب کی میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی، دور سے انہیں محبت اور عظمت کی آنکھوں سے دیکھا، لیکن اس خلوص اور محبت، یگانگت اور شفقت سے ملے جیسے برسوں کی ملاقات ہو، تھوڑی دیر کے بعد، میں حرف مطلب زبان پر لایا، ڈاکٹر صاحب نے بے تکلف قلم دوات اٹھایا، اور ایک پُرزور صداقت نامہ مرحمت فرما دیا، اور وفور شفقت سے، اس میں میری کتاب "سیرت محمد علی"، کا بھی بڑے شاندار الفاظ میں ذکر کر دیا، میں اس لطف خاص کو دیکھ کر ششدر رہ گیا، لوگ صداقت نامے ہاتھ پاؤں بچا کر دیتے ہیں، یہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے پُرزور بنانے کی کوشش کر رہے تھے، حیرت کی بات ہی تھی۔

اب بھی کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے اور جب بھی یہ موقعہ ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نعمت مل گئی!

ڈاکٹر ذاکر حسین

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۱۹۲۹ء کی ایک گرم دوپہر کو ندوہ کے ہال میں نماز ظہر کے معاً بعد ایک جلسہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اعزاز میں منعقد ہوا، ڈاکٹر صاحب جامعہ کے کسی کام کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، اور ندوہ میں سید صاحب کے ذاتی مہمان تھے۔

یہ جلسہ طلبہ کی طرف سے تھا، میں نے ایک خیر مقدمی تقریر کی، جس میں جامعہ کی ضرورت اور ڈاکٹر صاحب کے گراں مایہ خدمات کو سراہا، ڈاکٹر صاحب نے کہا، اتنی کامیاب تقریر کے بعد، اب میں تقریر کرنا نہیں چاہتا، لیکن کچھ باتیں ضرور کرنا چاہتا ہوں، اور وہ بیٹھے بیٹھے کروں گا۔

تمام طلبہ حلقہ باندھ کر ڈاکٹر صاحب کے گرد بیٹھ گئے، جو شخص اس وقت طلبہ سے مخاطب تھا وہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارہ کا ناخدا تھا، حالات ناموافق تھے، سرمایہ ناپید تھا، رفیقان راہ گریز پا تھے، بزرگانِ قوم بے پروا تھے، لیکن وہ اپنی دُھن میں مست، اس ٹوٹی پھوٹی ناؤ کو تڑپتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی لہروں کے منجدھار سے بچا کر ساحل مراد کی طرف کھیتا لئے جا رہا تھا، یہ تھا، ڈاکٹر صاحب کے دیدار سے پہلے ان کی شخصیت کا پس منظر، اس پس منظر کی روشنی میں یہ شخص کتنا من موہن دکھائی دے رہا تھا، کردار بلند کے ساتھ صورت بھی دستِ قدرت کی بنائی ہوئی ایک دلفریب مورت، گورا رنگ سیاہ داڑھی، جو یورپ کے دوران قیام میں بھی نہیں منڈی، سفید کھدر کا موٹا سا کرتہ، موتی کی طرح آبدار دانت، بجلی کے بلب کی طرح روشن اور تابناک آنکھیں آواز میں نرمی، اور شیرینی، انداز گفتگو میں اپنایت اور یگانگت، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا، برلن یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی، اور علی گڑھ کالج کا ایم اے، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پرنسپل "تقریر" کر کے اپنی خطابت، وسعت معلومات اور قابلیت کا رعب بٹھا رہا ہے یہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں میں سے کوئی آدمی وقت کے مسائل پر سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے، گفتگو کا موضوع تھا، چرخہ! ہندوستان کے معاشی حالات کو پیش نظر رکھ کر چرخہ کی افادیت، ضرورت، اور اہمیت پر وہ نکات بیان کئے جا رہے تھے، کہ زبان گنگ تھی اور عقل دنگ، انداز بیان کسی پروفیسر اور لیکچرار کا نہیں تھا، ساتھی اور کامریڈ کا تھا، لیکن جو مرعوبیت ایک پروفیسر اپنی لچھے دار تقریر سے نہیں

پیدا کر سکتا تھا، وہ اس کامریڈ نے سیدھی سادی باتوں سے پیدا کر دی۔

سال بھر بعد ندوہ میں اسٹرائک ہوئی، اس اسٹرائک کے سلسلہ میں، میں اور چند دوسرے رفقا ندوہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خارج کر دیئے گئے، میری اور عبدالسلام صاحب قدوائی کی رائے ہوئی کہ اب جامعہ چلنا چاہیئے، سید صاحب نے ایک سفارشی خط ڈاکٹر صاحب کے نام دیا، اور ہم دونوں نے جامعہ کا ارادہ پختہ کر لیا، پہلے عبدالسلام صاحب گئے، ان کے دو تین روز بعد میں جب میں دہلی پہنچا تو عبدالسلام صاحب نے کہا، سید صاحب کے خط میں تمہارا نام پڑھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا، "یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے میرے خیر مقدم میں تقریر کی تھی؟" مجھے حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا شخص، معمولی معمولی طالب علموں کو بھی، جن سے صرف ایک بار چند لمحوں کے لئے سابقہ پڑا ہو، یاد رکھتا ہے، معلوم ہوتا ہے حافظہ کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اچھا ہے، ورنہ بڑے لوگ تو عام طور پر جان بوجھ کر انجان بن جاتے ہیں، پہچانتے ہیں، لیکن پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں عجیب و غریب قسم کا بڑا آدمی ہے یہ!

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں مولانا محمد علی کا انتقال ہوا، چند روز بعد شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی نے، مکتبہ جامعہ کے منیجر کی طرف سے مجھے پیام دیا، کہ میں مولانا مرحوم پر ایک مختصر سی کتاب لکھوں، جس کا معاوضہ بھی مجھے ملے گا، جامعہ کے زمانہ طالب علمی میں اقتصادی مصائب بادل بن کر مجھ پر چھائے ہوتے تھے، یہ پیام میرے لیے بڑا حوصلہ افزا ثابت ہوا، اپنی تعلیمی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ میں اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں بھی منہمک ہو گیا، اور ڈیڑھ دو مہینہ کی محنتِ شاقہ کے بعد میں نے تقریباً پانچ سو صفحہ کی ایک کتاب تیار کر دی، خود ڈاکٹر صاحب بھی، بعض احباب اور بزرگوں کے اصرار سے متاثر ہو کر محمد علی کی سوانح عمری لکھنے کا تہیہ کر چکے تھے، اور اس کے ابواب کا ایک نقشہ بھی انھوں نے تیار کر لیا تھا، لیکن میری کتاب کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، میری کتاب پہلے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے پاس کرائی گئی، پھر خود ڈاکٹر صاحب اسے لے کر بیٹھے، مولانا عبدالماجد کی بارگاہ سے تو بآسانی یہ مرحلہ طے ہو گیا، کیونکہ میرے سیاسی خیالات و معتقدات بلکہ مولانا محمد علی سے عقیدت و محبت تک مولانا عبدالماجد ہی کی تربیت اور تلقین کا نتیجہ تھی، لیکن ڈاکٹر صاحب کے ہاں معاملہ برعکس تھا، خود ڈاکٹر صاحب کانگریس کی طرف مائل تھے اور کانگریسی لیڈروں سے تعلق خاطر رکھتے تھے، ڈاکٹر انصاری کو جو جامعہ کے چانسلر بھی تھے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب، بڑی عظمت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اس کتاب میں کانگریس

اور ڈاکٹر انصاری کے سیاسی کردار اور خیالات کی دھجیاں اڑائی گئی تھیں، اور مولانا محمد خاں کی سیاست کو بدلائل وشواہد صحیح اور درست ثابت کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے صبر ایوبی سے کام لے کر پوری کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کیا پھر مجھے طلب فرمایا، مولانا محمد علی کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، سب صحیح ہے، اور اسے ضرور شائع ہونا چاہیئے، لیکن کانگرس اور ڈاکٹر انصاری کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے۔ اسے اگر قلمزد کر دیجئے تو کیا حرج ہے"؟ میں نے طالب علمانہ سرکشی کے ساتھ پوچھا، کیوں؟ پوری سنجیدگی کے ساتھ فرمایا، اس لیئے کہ جب آپ مولانا محمد علی کا ذکر کرتے ہیں، تو آپ کا قلم خامۂ نور افشاں بن جاتا ہے اور جب آپ کانگرس کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے قلم کی نب بچھو کا ڈنک بن جاتی ہے، میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، اس لیئے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ برہمی چہرہ سے عیاں تھی، لیکن منہ سے انگاروں کے بجائے پھول برس رہے تھے، فرمایا، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر سچ بیان ہی کر دیا جائے۔ میں نے کہا، اس لیئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہیرو کی تصویر نامکمل رہے گی! فرمایا، آپ کو میں مجبور کرنا نہیں چاہتا، کل سے ہر ہر باب پر ہم تفصیل سے تبادلۂ خیال کریں گے، اگر آپ مطمئن ہو جائیں تو زیر بحث حصہ خارج کر دیجئے گا، اگر میں مطمئن ہو جاؤں، تو اسے باقی رکھیئے گا۔ میں بہتر کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب مجھے خیال آیا کہ یہ گفتگو ایک ساتھی کی ایک ساتھی سے نہیں ہو رہی تھی۔ ایک طالب علم کی اپنے پرنسپل سے ہو رہی تھی، جو حکم دے سکتا تھا کہ یہ کتاب شائع نہ ہو، جو حکم دے سکتا تھا کہ یہ کتاب صرف ترمیم شدہ صورت میں شائع ہو سکتی ہے، لیکن اس نے حکم نہیں دیا۔ مجبور نہیں کیا، ہر ہر باب پہ ایک ساتھی کی طرح بحث کرنے۔ قائل کرنے اور قائل ہونے پر تیار ہے۔ ایسا نرالا پرنسپل اور ایسا انوکھا استاد کم از کم میں نے نہ دیکھا اور نہ سنا تھا۔

دوسرے روز سے ہر ہر باب پر باقاعدہ گھنٹوں اور پہروں بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا، جو حصہ کٹا وہ اس لیئے کہ میں واقعی قائل ہو گیا تھا، لیکن جو حصہ چھپا ہے وہ محض اس لیئے چھپا ہے کہ میں قائل نہ ہو سکا تھا، ورنہ ڈاکٹر صاحب اس سے پورے طور پہ متفق نہ تھے، یا کم از کم اسکی اشاعت کو جامعہ کے مفاد اور وقت کی مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے، جو با اختیار تھا، وہ اپنے اختیار سے دستبردار ہو گیا، جو بے اختیار تھا، اس کے ہاتھ میں اختیار کی باگ دے دی گئی، اللہ اللہ یہ عالی حوصلگی، یہ وسعت ظرف، یہ رواداری۔

۳۲ء کی گرمیوں کی تعطیل میں خلافت کمیٹی کے سکریٹری غازی صاحب نے مجھے بمبئی کھینچ بلایا، اختتام تعطیل کے بعد، انہوں نے فیصلہ صادر کر دیا، اب تم دہلی نہیں جا سکتے، تمہیں یہیں رہنا پڑے گا، میں بھاگ کر دہلی پہنچا، اور پھر اپنا تعلیمی سلسلہ جاری کر دیا، کچھ روز بعد غازی صاحب دہلی آئے، ڈاکٹر صاحب سے ملے، اور کہا "جعفری صاحب کو ہمیں دے دیجئے۔ آپ کا ان سے کام نہیں اٹکا ہوا، اور ہمیں ان کی بڑی ضرورت ہے!" ذاکر صاحب نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا، میری رائے کا جہاں تک تعلق ہے، میں ہرگز انہیں مشورہ نہ دوں گا کہ تعلیم مکمل کئے بغیر جائیں، اگرچہ ان کی کتنی ہی خوش آئند امیدیں ناکام رہ جائیں، اگرچہ آپ کا کام کتنا ہی نامکمل رہ جائے!" غازی صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔

لیکن دسمبر ۳۳ء میں مولانا شوکت علی نے چھاپہ مارا، میں سرمائی تعطیلات میں لکھنؤ گیا ہوا تھا وہاں خلافت کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا، وہیں سے شوکت صاحب نے مجھے اغوا کیا، اور بمبئی لے آئے، کپڑے، بستر، کتابیں، ہر چیز دہلی میں رہ گئی، اور نذر احباب ہو گئی، ذاکر صاحب میری اس گم شدگی سے خفا ہوئے، اور کافی عرصہ تک خفا رہے، یہ خفگی اپنے لئے نہ تھی، میرے لئے تھی، میرے مستقبل کے لئے تھی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ خفگی دور ہو گئی، اور ان کی شفقت و رحمت کا دریا پھر لہریں مارنے لگا، ایک مرتبہ مجھے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑی ایک نہایت پُر زور سرٹیفکیٹ بمبئی میں ارسال فرما دیا۔

۴۵ء میں بمبئی کے اندر جامعہ کے طلبائے قدیم کا ایک جلسہ خلافت ہاؤس میں ہوا، تاکہ باقاعدہ انجمن بن جائے، اور کام شروع ہو جائے، ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں موجود تھے، بلکہ صدارت کے فرائض وہی انجام دے رہے تھے، حارث صاحب نے انجمن کی مستقل صدارت کے لیے ڈاکٹر عبدالحمید (آف اوکاسا اینڈ سپلائز کمپنی) کا نام پیش کیا، میں نے سخت مخالفت کی، اور کہا، ان حضرت کی نااہلیت کے باوجود اگر ان کا انتخاب ہوا، تو میں آخر وقت تک اس کی مخالفت کروں گا، اور اس انجمن سے قطع تعلق کر لوں گا، حارث صاحب کچھ کہنے والے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کر دیا، یہ انجمن بغیر صدر کے کام کرے گی، سکریٹری مستقل ہو گا، اور صدر ہر جلسہ میں نیا، اس مدبرانہ فیصلہ نے ایک جنگی اکھاڑہ کو مجلس احباب میں تبدیل کر دیا!

راس مسعود

ایک بڑا انسان، ایک دلآویز شخصیت

سرراس مسعود نواب مسعود جنگ بہادر مملکت آصفیہ کے وزیرِ تعلیمات سرسید کے پوتے، جسٹس محمود کے بیٹے بہت بڑے آدمی تھے، بڑی اونچی سوسائیٹیوں کے رُکن تھے، مجھے ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا۔ اس سے زیادہ معلومات کی نہ ضرورت تھی، نہ پروا، البتہ تعلقِ خاطر اس لیے بڑھ گیا تھا، کہ محمد علی شوکت علی نے اپنے دوستانہ تعلقات کا دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کیا کہ وہ سلطنت آصفیہ کی پیش کش معتمدی سیاسیات مسترد کر دیں، اور اپنے دادا کے بنائے ہوئے ادارۂ علمی کے احیاء کی کوشش کریں۔ انہوں نے بڑی اولوالعزمی سے علی برادران کا یہ اصرار قبول کر لیا، اور حیدر آباد سے علی گڑھ چلے آئے۔

علی گڑھ پہنچتے ہی انہوں نے تعمیر و اصلاح کا ایک زبردست سلسلہ شروع کر دیا، جس علی گڑھ کے اسناد حکومت کے نزدیک غیر وقیع ہو چکے تھے، انہیں راس مسعود نے پھر باوقعت بنا دیا، علی گڑھ کے وکیلوں کو متعدد دعووں کے ہائی کورٹ پریکٹس کی اجازت نہیں دیتے تھے، راس مسعود کی کوشش سے یہ اجازت مل گئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر ایک سائنس کالج کا قیام ہمدردان علی گڑھ کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ لیکن اس کی تعبیر راس مسعود کے ہاتھوں وجود میں آئی، یہ اصلاحیں اور ترقیاں، بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ نمودار ہوئیں، علی گڑھ کے پرانے مخالفین بھی راس مسعود کی انتھک محنت اور خلوص کے قائل ہو گئے، ان واقعات نے میرے دل میں راس مسعود کی عزّت اور وقعت پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھا دی، راس مسعود کو دیکھنے کی تمنا بھی بالآخر پوری ہو گئی!

۱۹۳۳ء میں، ڈاکٹر انصاری مرحوم کی دعوت پر غازی رؤف پاشا جامعہ ملیہ میں توسیعی

لیکچر دینے تشریف لائے، دسمبر کا مہینہ تھا، جاڑے کا موسم اپنے پورے شباب پر تھا، چاند رعنائی اور زیبائی کا پیکر بنا ہوا نور سیال کی بارش کر رہا تھا، تعلیمی مرکز نمبر ا کا ہال ناظرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، دروازہ تک بلکہ سڑک تک، حسرت دیدار رکھنے والوں کی فوج در فوج کھڑی تھی، چو چند طلبا ہجوم کو قابو میں رکھنے کی خدمت پر مامور تھے، ان میں مَیں بھی تھا، اتنے میں مَیں نے دیکھا، ایک شاندار موٹر آکر رکی، اس میں سے دوہرے بدن کا لمبا تڑنگا، بارعب وجیہہ سیاہ رنگ کی بہترین شیروانی، اور سفید چوڑی دار پاجامہ زیب بر کئے، ایک شخص بڑے وقار اور دبدبہ کے ساتھ برآمد ہوا، اترتے ہی اس نے آواز دی، ذاکر! شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین فوراً سامنے آگئے، اور وہ شفقت سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھ گئے ـــــ یہی تھے سر راس مسعود!

راس مسعود کی ہر دلعزیزی، مقبولیت اور محبوبیت میں جتنا جتنا اضافہ ہو رہا تھا، اسی تناسب سے یونیورسٹی کے سابق ارباب حل وعقد کی طرف سے اس نیک نام وائس چانسلر کی مخالفت ہو رہی تھی، راس مسعود کی کوئی پارٹی نہیں تھی، وہ جتھہ بندی کے قائل نہیں تھے، انہوں نے کبھی حریفوں اور رقیبوں کو زک دینے کے لئے نہ سازش کی، نہ کنویسنگ سے اپنا دامن آلودہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ جھنجھلا کر، انہوں نے استعفیٰ دے دیا، آدمی تھے بڑے ضدی اور جذباتی، اب لاکھ لاکھ لوگ اصرار کر رہے ہیں، منتیں کر رہے ہیں، مگر وہ استعفا واپس لینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے، یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۵ء کا ہے،

میں اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کا ایڈیٹر تھا، میں نے مسلسل مقالات افتتاحیہ لکھنے شروع کئے اور جتنا زورِ قلم راس مسعود کی حمایت، اور ان کے مخالفین کی مخالفت میں صرف کر سکتا تھا، بڑی دریادلی سے بغیر کسی مزد اور صلہ کی تمنا کے صرف کر ڈالا۔ خلافت علی گڑھ بھی جاتا تھا، یہ مقالات، راس مسعود کی نظر سے بھی گزرے، یوں تو ہندوستان کے مسلم پریس کا بڑا حصہ راس مسعود کی حمایت کر رہا تھا، لیکن خلافت نے جس جوش و خروش سے اس معرکہ میں حصہ لیا، اس سے وہ بہت متاثر ہوئے، اور انہوں نے خط لکھ کر میرا شکریہ ادا کیا، میں نے انکسار سے کام لیا۔ ان کا پھر خط آیا، لمبا چوڑا خط، اور پھر شکریہ ادا کرنے پر اصرار کیا، پھر میری طرف سے خط و کتابت بند ہو گئی، وہ جب

کبھی خلافت میں کچھ دیکھ لیتے، ایک شکریہ کا خط اپنے دستِ خاص سے اُردو زبان میں ضرور لکھتے تھے۔

ایک روز ان کا خط آیا، کہ میں ولایت جا رہا ہوں، مسٹر اسٹون برج (بمبئی کے ایک انگریز انجینئر) کے ہاں ٹھہروں گا، آپ ضرور ملئے گا!

وہ تشریف لائے، اور میں اُن سے ملنے گیا، وہ اندر تشریف رکھتے تھے، آئے بڑے تپاک اور اخلاق سے ملے، فرمانے لگے "میں دینی نصاب اردو میں تیار کرانا چاہتا ہوں، سلیمان ندوی سے بھی اس سلسلہ میں خط وکتابت کر رہا ہوں، آپ سے بھی امداد کا متوقع ہوں!" میں نے عرض کیا، یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ میری عزّت تو اس میں ہے کہ آپ حضرات کے مرتب کئے ہوئے نصاب کا متعلم بنوں، نہ کہ اس کی تشکیل و ترتیب میں حصّہ لوں۔ مُسکرائے، پھر گرجدار آواز میں ہنسے۔

اتنے میں مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) تشریف لائے اُنہیں دیکھتے ہی بڑی بے تابی سے اُٹھے، آگے بڑھے کسی قدر جھک کر۔ کیونکہ وہ خود دراز قد تھے، اور مولوی صاحب خیر الامور اوسطہا کے مصداق، اُنہیں سینہ سے لگایا، اور چٹاخ چٹاخ ان کے گالوں پر بوسوں کی بارش کرنے لگے۔ کتنا دلچسپ منظر تھا، ایک لمبا تڑنگا شخص، ایک کہن سال اور باوقار شخص کے رخساروں پر مہرِ محبت ثبت کر رہا تھا۔

غالباً دوسرے روز وہ انگلستان تشریف لے گئے، جاتے وقت کہہ رہے تھے انگلستان کے دوست اصرار کرتے ہیں کہ تو ہماری ہی طرح بولتا اور لکھتا ہے۔ ہندوستان پر کچھ لکھ، اب یہی ارادہ ہے! کسی نے پوچھا، یونیورسٹی کا کیا ہوگا۔؟ فرمایا بس ایک آدمی ہے، جو اس گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال سکتا ہے اسمٰعیل خان (نواب اسمٰعیل خان) لیکن یہ لوگ شائد اسے بھی کام نہ کرنے دیں"

انگلستان سے واپس آئے اور آتے ہی بھوپال کے وزیر تعلیمات ہو گئے۔ اب بھلا میری ان کی ملاقات یا خط وکتابت کا کیا امکان تھا، کہاں گنگوا تیلی، کہاں راجہ بھوج!

بھوپال کے ایک نقاش اور مصوّر میرے پاس اکثر آیا کرتے تھے، وہ بہترین

فنکار تھے، لیکن بدقسمتی سے ریاست کے حکام و عمال سرپرستی سے پہلو تہی کرتے تھے، میں نے کئی مرتبہ ان کی تعریف میں، ان کی قابلیت، اور ذہانت سے متاثر ہو کر خلافت میں شذرات لکھے، حکومت بھوپال کو متوجہ کیا، کہ وہ اس گوہر آبدار کی طرف توجہ کرے، لیکن

کون سنتا ہے فغانِ درویش

ایک روز معلوم ہوا، حکومتِ بھوپال نے معقول مشاہرہ پر ان کے خدمات حاصل کر لئے ہیں، اور انہیں سانچی میں متعین کر دیا ہے، حیرت ہوئی، پھر تحقیقات کے بعد معلوم ہوا، ایک روز یونہی قسمت آزمائی کے لئے، وہ راس مسعود کے دربار میں پہنچے، انہوں نے ان کے بنائے ہوئے نقوش دیکھے، متاثر ہوئے، تعریف کی، امید دلائی، اور کل بلایا، وہ مایوس ہو کر چلے آئے، کیونکہ کل بڑے لوگوں کے ہاں آتا ہی نہیں، چنانچہ وہ دوسرے روز نہیں گئے، وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد ایک موٹر ان کے گھر کے سامنے آکر رکی، معلوم ہوا نواب صاحب نے بلایا ہے! "وہ بیٹھ گئے، راس مسعود نے شکایت کی، آپ آئے نہیں، پھر نواب صاحب بھوپال کو ٹیلیفون کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ اس نقاش کو لے کر وہ فرمانروائے بھوپال کے قصرِ معلیٰ میں پہنچ گئے، اور تکلف برطرف جاتے ہی فرمایا۔ جس ریاست میں ایسے ایسے ہونہار فنکار ہوں، وہ ٹھوکریں کھائیں، اور ریاست ان کی ذرا بھی سرپرستی نہ کرے، میں یہ ستم نہیں دیکھ سکتا!"

نواب صاحب راس مسعود کا بہت مان رکھتے تھے، انہوں نے فوراً معقول مشاہرہ پر انہیں ملازم رکھ لیا، اور ان کے دن پھر گئے، اب مجھے معلوم ہوا، کہ راس مسعود کے سینہ میں دل بھی بہت بڑا تھا، اور سچ پوچھئے تو سرسید اور جسٹس محمود کے دلوں کی دھڑکنیں بھی اس ایک دل میں جمع ہو گئی تھیں آکر۔

سر رفیع الدین

بمبئی کے سابق وزیر تعلیمات کی کہانی

سر رفیع الدین اب سیاسیات سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، کچھ عمر کا تقاضا کچھ حالات کی نامساعدت، لیکن ایک زمانہ تھا کہ وہ حکومت کے محبوب، گورنر کے منظور اور سیاسیات ہند کے ایک جنگجو سورما تھے۔

۴۳ء کے موسم برشگال میں وہ بمبئی آئے، اکثر چوپاٹی پر ٹھہرتے ہیں، لیکن اس مرتبہ ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب پرنسپل یوسف اسمٰعیل کالج کے دولت کدہ اندھیری میں قیام فرما ہوئے، برادر محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا ٹیلی فون پر پیام پہنچا کہ یاد فرماتے ہیں، دوسرے روز دوپہر کو میں حاضرِ خدمت ہوا۔

ایک ہوادار کمرہ میں ایک چارپائی پر

پیری و صد عیب

کا مجسمہ بنے ہوئے لیٹے تھے۔ عمر ۸۰ سال کے قریب، آنکھیں بصارت سے محروم جسم امراض گوناں گوں کا مرکز، ڈاکٹروں کی سخت ہدایت کہ نہ باتیں کیجیے، نہ ہلیے، لیکن خود اعتمادی کی یہ کیفیت کہ گھنٹوں باتیں کرتے ہیں مگر تھکتے نہیں اور ان کی گفتگو صرف انہی کو نہیں، مخاطب کو بھی، کیونکہ اپنی گفتگو کا زور اور اثر دیکھنے کے لیے لیٹے لیٹے ہاتھ زور سے جھٹکتے ہیں، اور وہ اکثر و بیشتر ٹھیک نشانہ پر ——— مخاطب پر ——— پڑتا ہے، عمر کی بالکل آخری منزل پر ہیں، کہنا چاہیئے، عمر طبعی سے تجاوز کر چکے ہیں، لیکن ہمت جوان ہے، دل جوان ہے، دماغ جوان ہے، اگر آج انہیں وزیر ہند بنا دیا جائے یا کسی بڑی انجمن کا صدر بنا دیا جائے، تو اسٹریچر پر لیٹے لیٹے روز دفتر جائیں، اور اپنے سیکریٹری سے زیادہ کام کر کے واپس آئیں، اس بیکاری اور اعتکاف کے زمانہ میں بھی

اپنے پروگرام کے مطابق وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ دوسروں کے سہارے واکنگ کا شوق اور شغل بھی بدستور جاری ہے۔

ما زندہ ازنیم کہ آرام نہ گیریم!

قوم کی فکر سے اب بھی غافل نہیں ہیں۔ اردو زبان کے تو عاشق ہیں۔ بمبئی کے یوسف اسمٰعیل کالج کے قیام میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ بمبئی میں سرکاری طور پر اُردو زبان انہی نے تسلیم کرائی۔ ان کے وزیر بننے سے پہلے، بمبئی میں حکومت کے مسودہ ہائے قانون کا ترجمہ، مرہٹی اور گجراتی میں شائع ہوا تھا لیکن ۱۹۲۴ میں انہوں نے اپنے رفقا سے لڑ جھگڑ کر، اردو کو بھی اس فہرست میں شامل کیا، جب سے اب تک سرکاری مسودات جس طرح مرہٹی اور گجراتی میں شائع ہوتے ہیں، اُردو میں بھی شائع ہوتے ہیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تشریف لائے، انہوں نے کوشش کی کہ موصوف ذرا آرام لے لیں، لیکن صاف انکار کر دیا، اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

گفتگو کا موضوع زیادہ تر خود اپنے احوال و سوانح تھے۔ معلوم ہوا کہ آپ گاندھی جی کے رفیق درس رہ چکے ہیں۔ لندن میں دونوں نے ساتھ ساتھ بیرسٹری کی تکمیل کی اور اس کے بعد:

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

لندن کے زمانہ طالب علمی کے بھی بہت سے قصے سناتے رہتے ہیں۔ نہ مسلمان طلبہ کی تنظیم کی۔ اس طرح خلیفۃ المسلمین سے قسطنطنیہ میں جا کر ملا، اس طرح مسٹر ایسکوتھ سے میری جھڑپیں ہوئیں، یوں ملکہ وکٹوریہ سے نیاز حاصل ہوا، اور اس طرح انہیں اُردو کے سیکھنے اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے پر مائل کیا؛ وہ دوسروں کو بولنے کا بہت کم موقع دیتے ہیں۔ وقت کے قدردان ہیں، لہٰذا وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے، اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملکی اور ملّی سیاسیات پر بھی گفتگو ہوئی۔ اندازہ یہ ہوا کہ موجودہ سیاسی جماعتوں میں سے کسی سے خوش نہیں ہیں۔ موجودہ سیاسی رہنماؤں میں سے کسی کے قائل نہیں ہیں، ان سب

کے شاکی ہیں۔

ان معتوبین میں مسٹر جناح بھی ہیں، لیکن ان کے متعلق مخاطب کا عندیہ معلوم کر کے گفتگو کرتے ہیں، اگر مخاطب مجاہد قسم کا جناحی ہے تو پھر اس موضوع کے علاوہ بہت سے موضوع ہیں، جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے، اور اگر روادار قسم کا جناحی ہے

پھر دیکھئے انداز گل افشانیِ گفتار

آدمی بہر حال بڑے مخلص ہیں، قوم کی سچی ہمدردی کا جذبہ دل میں موجزن رکھتے ہیں، اپنے دورِ وزارت میں مسلمانوں کی ٹھوس خدمتیں کر چکے ہیں۔

آخر دو گھنٹہ کی مصاحبت کے بعد میں نے اجازت چاہی، اُنہوں نے کہا تشریف لے جائیے، میں چند روز بعد پھر پونہ سے آؤں گا، اور کئی روز قیام کروں گا، تو مفصل گفتگو ہو گی، اب اندازہ ہوا کہ اب تک جو گفتگو ہو رہی تھی وہ "مختصر" تھی! ——— مشتے نمونہ از خروارے!

ڈاکٹر ضیاء الدین

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ!

۱۹۳۷ء کے موسمِ سرما میں، مرکزی اسمبلی کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا میں دہلی میں مولانا شوکت علی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔

رسم، آئین، وضع، اصول، ایٹی کیٹ، ہر چیز پر ان کی محبت غالب تھی، وہ اگر کسی سے محبت کرتے تو اسے اپنا ہمزاد بنا لیتے تھے، جہاں مدعو ہوں گے، وہاں خود تو جائیں گے ہی، لیکن اپنے ساتھ اپنے منظورِ نظر کو بھی ناخواندہ مہمان بنا کر مسکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے، اور اس کی کشمکش و اضطراب سے لطف لیتے ہوئے لے جاتے تھے، یہی میرے ساتھ بھی ہوتا تھا۔

گھر سے جب چلنے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا لیا، راستہ میں کئی جگہ رُکے، جہاں بھی منزل کی، ان کے حسب الحکم میں بھی ان کے ساتھ تھا، اسمبلی پہنچے، تو پریذیڈنٹ کی گیلری کا پاس فوراً دلوا دیا، خود اندر جا کر بیٹھ گئے، اور مجھے وہاں بھیج دیا۔

اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد فرمایا "میاں غیاث الدین کے ہاں چلیں گے بھائی!" ڈرائیور نے کار کا رُخ اس طرف موڑ دیا، میاں غیاث الدین پنجاب کے کسی حلقہ سے مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے، اُنہوں نے سر سکندر حیات وزیرِ اعظم پنجاب کے اعزاز میں چائے کی دعوت چند مخصوص لوگوں کو دی تھی، جن میں مولانا شوکت علی بھی تھے، اور ان کے ساتھ ان سطروں کے لکھنے والا بھی تھا۔

حاضرین میں کثرت ان لوگوں کی تھی، جو علیگ تھے، مولانا شوکت علی، سر یامین خاں، سر ضیاء الدین اور چند دوسرے سربرآوردہ اور ممتاز علیگ،

شروع میں یہ محفل بہت سونی تھی۔ سر سکندر بہت گھبرائے ہوئے تھے، میاں برکت علی نے، پنجاب اسمبلی میں مسجد شہید گنج کی بازیابی اور واگزاری کی تجویز پیش کی تھی۔ سر سکندر نے پوری دانشمندی اور تدبر سے کام لے کر، گورنر کو مشورہ دیا تھا، کہ وہ اس تجویز کے پیش کرنے کی اجازت نہ دے۔ گورنر نے یہ مشورہ مان لیا، اور تجویز اسمبلی میں پیش نہ ہو سکی۔ مسجد شہید گنج کے حادثہ سے مسلمان دیسے ہی ملول اور شکستہ خاطر تھے، اس واقعہ نے ان کی برہمی اور اشتعال میں اضافہ کر دیا۔ اور سر سکندر کی ذات وصفات پر پبلک پلیٹ فارم پر حملے ہونے لگے، مزید مشکل یہ تھی، کہ میاں برکت علی مرحوم بھی مسلم لیگ پارٹی کے ممبر تھے، اور سر سکندر بھی۔ اب مسلم لیگ کو فیصلہ کرنا تھا، کہ وہ کسے سراہتی ہے اور کسے ٹوکتی ہے۔ مسٹر جناح دہلی میں موجود تھے، لیکن سر سکندر نے ان سے ملاقات کرنے سے پیشتر یہ ضروری سمجھا کہ اپنے مخصوص دوستوں کی رائے اور مشورہ سے مستفید ہو لیں۔ یہ اجتماع اسی سلسلہ میں تھا۔

میں کہہ چکا ہوں، سر سکندر ملول اور افسردہ سے بیٹھے تھے، ان کی افسردگی اور خاموشی نے ساری محفل کو افسردہ اور خاموش بنا رکھا تھا۔

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

لیکن مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر ضیاالدین کی بذلہ سنجیوں اور لطیفہ گوئیوں نے سماں پیدا کر دیا، اس سے پہلے میں نے ڈاکٹر ضیاالدین کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ریاضی میں ان کی مہارت، علوم عصری میں ان کی قابلیت، علی گڑھ کے انتظام و انصرام کے سلسلہ میں ان کی جماعت سازی کی داستان سے میں واقف تھا۔ علمی آدمی عام طور پر خلوت کے آدمی ہوتے ہیں، جلوت میں سر سبز نہیں ہو پاتے، یہی خیال میرا ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بھی تھا، لیکن میں نے حیرت کے ساتھ دیکھا، اس محفل میں وہ بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہے ہیں۔ لطیفے بیان کر رہے ہیں، فقرے مرکز رہے ہیں، یہاں وہ صرف ایک زندہ دل، خوش طبع اور بذلہ سنج ہمنشیں تھے۔

ڈاکٹر ضیاالدین میں، اور مولانا شوکت علی میں کبھی نہیں بنی، دونوں علی الاعلان

ایک دوسرے کے مخالف تھے بلکہ مولانا شوکت علی توڈنکے کی چوٹ مخالف تھے۔ ڈاکٹر صاحب دوبارہ وائس چانسلر ہونے کی کوشش کر رہے تھے، اور مولانا شوکت علی، ان کی پُر زور مخالفت کر رہے تھے۔

ایک روز صبح قرول باغ میں مولانا شوکت علی کے مکان پر معلوم و معروف اختلافات کے باوجود ڈاکٹر صاحب موجود تھے، اور اپنی وائس چانسلری کے لئے "کنویسنگ" فرما رہے تھے، کسی اور سے نہیں، شوکت علی سے۔ شوکت صاحب ظاہری اخلاق و تکلف کے فن سے قطعاً ناواقف تھے، انہوں نے پوری بات بھی نہیں سنی، اور نہایت صفائی سے کہہ دیا، "تم نے علی گڑھ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہم تمہاری تائید نہیں کر سکتے!" اس جوابِ صاف کے بعد، مزید گفتگو کا موقع نہ تھا، مجلس برخاست ہوگئی۔

۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء کو اسلام کا نہ تھکنے والا سپاہی، شوکت علی، چند روز کی علالت کے بعد دفعتہً اس دنیا سے کوچ کر گیا، دہلی سوگوار ہو گئی، قرول باغ سے لے کر جامع مسجد تک خلقت کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا کہ اس مجاہدِ اسلام کے جنازہ کو کاندھا دے، اور آخری دیدار کی سعادت حاصل کرے۔

سب سے بڑا مرحلہ قبر کا تھا، مسلمانوں کی خواہش تھی، کہ شاہجہان اعظم کی جامع مسجد کے عین مقابل، مزار سرمد شہید کے پہلو میں، دین کے اس دیوانے اور ملت کے اس مستانے کو جگہ ملے، جگہ پر شارع عام تھا، قبرستان نہ تھا، جہاں مُردے دفن ہوتے ہوں، علاوہ ازیں یہ جگہ سرکاری کے قبضہ میں تھی، اور وہاں کے حکام والا مقام سے اجازت لینا اور فوراً ہی تمام معاملات کا طے کر لینا کار سے دارد کا معاملہ تھا، لیکن جو لوگ آگے بڑھے اور سرگرمی سے جنہوں نے اس کارِ اہم کو چند لمحوں میں انجام دے لیا، ان میں ایک سرگرم ہستی سر ضیاء الدین کی بھی تھی، خوشی ہوتی، کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو اختلافات کو ذاتیات سے بالا رکھ سکتے ہیں یا کم از کم مرنے کے بعد ان کی یاد قائم رکھنا اور یادگار قائم کرنا نہیں جانتے، ورنہ شوکت علی اور ضیاء الدین کے اختلافات کسے نہیں معلوم۔

۱۹۴۴ء کے اخیر میں ایک نجی کام کے سلسلہ میں میرا حیدرآباد دکن جانا ہوا، دو دن میں فراغت ہو گئی، واپسی کے لئے دہلی کے ٹکٹ کی کوشش کی، مگر ناکامی ہوئی۔

آخر حضرت مسلم ضیائی کی عنایت نے یہ مشکل رفع کر دی، اور عین وقت کے وقت سیٹ بھی بُک ہو گئی، اور ٹکٹ بھی مل گیا، یہ کمپارٹمنٹ صرف ۴ نشستوں پر مشتمل تھا، دو اوپر، دو نیچے، مجھے اوپر کی نشست ملی تھی، نیچے کی دونوں نشستیں ابھی تک خالی تھیں۔

ریل روانہ ہونے میں تھوڑی دیر تھی کہ وہ صاحب مع ایک ٹائپسٹ کے تشریف لائے، اور ان نشستوں پر قابض ہو گئے، ان میں ایک پروفیسر ہادی حسن تھے، دوسرے سر ضیاء الدین، جی خوش ہوا کہ راستہ اچھا کٹے گا، اور براہ راست مشاہدہ اور مطالعہ کا موقع ملے گا، میں اوپر تھا، اور بغیر دخل در معقولات کیے ان حضرات کی نقل و حرکت، اور بحث و گفتگو میں خاموش حصہ لے سکتا تھا، اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

کچھ دیر تک تو پروفیسر ہادی حسن ایک طفل مکتب کی طرح مختلف لوگوں کی شکایت کرتے رہے اور ڈاکٹر صاحب ایک سمجھدار اُستاد کی طرح ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے، پھر مسلم یونیورسٹی کی جُبلی کا ذکر چھڑا، جس کے لئے ڈاکٹر صاحب بہت بے تاب تھے، اور جسے کامیاب بنانے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر یونیورسٹی کی مختلف تعمیرات کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی خاطر بہت مضطرب تھے۔ ایک ایک بات، ایک ایک ادا سے ان کی پریشانی ٹپک رہی تھی، اور وہ فی البدیہہ اور برجستہ اسکیمیں مختلف سرمایہ داروں — آغا خان، سیدنا ملّا طاہر وغیرہ — پر چھاپہ مارنے کی بنا رہے تھے، اور ہادی حسن صاحب ان کی تائید فرما رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی عمر ماشاء اللہ کافی ہے، ستر سے نکلتے ہوئے ہوں گے لیکن اس طویل سفر کے دوران میں میں نے دیکھا، وہ جس قابلِ رشک مستعدی سے باتیں کرتے ہیں، خطوط لکھواتے ہیں، بیانات تیار کرتے ہیں، اسکیمیں بناتے ہیں، اسی قابلِ رشک سرگرمی سے اکل و شرب کا سلسلہ بھی غیر منقطع طور پر قائم رکھتے ہیں۔

کمپارٹمنٹ لیٹرن کو انہوں نے باورچی خانہ کی صورت میں تبدیل کر لیا تھا، یہیں ان کی کھچڑی پکتی تھی، پانی گرم ہوتا تھا، اور حیدر آباد سے جو ناشتہ ساتھ چلا تھا، اس کی اصلاح و ترمیم کافی احتیاط اور نظر ثانی کے ساتھ ہوتی رہتی تھی، یہ تو تھا مستقل

سلسلہ، اب ضمنی سلسلے ملاحظہ ہوں، ناگپور کے اسٹیشن پر خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب سنتروں کا ایک ٹوکرا لائے، جو قبول کر لیا گیا، اور ریل کے روانہ ہوتے ہی، اس سے استفادہ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، کسی اسٹیشن پر اچھے اچھے امرود نظر آئے، وہ لے لئے گئے۔ اور اب خانساماں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کچالو جلدی بناؤ۔ اس نے اہتمام کے ساتھ کچالو بنایا، اب اس سے شغل جاری ہے، کچھ دیر کے بعد چائے کا وقت آگیا، تو اس کا بھی اشتیاق کے ساتھ انتظار ہو رہا ہے۔

آخر ۳۶ گھنٹہ کے بعد ہم دہلی پہنچے۔ اور میں جب قلی سے اپنا اسباب اتروا رہا تھا، ڈاکٹر صاحب پورے اطمینان سے چائے نوشی میں (مع ضروری لوازمہ کے) مصروف تھے، — سچی بات تو یہ ہے کہ پرانے لوگوں میں بڑا دم خم ہوتا ہے!

پروفیسر طاہر الیس محمدی

"دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے!"

جامعہ کے اساتذہ میں ایک صاحب تھے۔ مسٹر طاہر الیس محمدی۔ بمبئی کے رہنے والے بدرالدین طیب جی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یورپ کے تعلیم یافتہ تھے۔ انگریزی ادب اور اقتصادیات کے ماہر تھے، کچھ عرصہ تک شیخ الجامعہ بھی رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تشریف لانے کے بعد، شیخ الجامعہ کی مسند سے اٹھ کر پھر پروفیسری کی کرسی پر پہنچ گئے۔

مجھے سب سے زیادہ عجیب و غریب ہستی جامعہ میں انہی کی معلوم ہوئی۔ جامعہ کے تمام اساتذہ طلبہ میں گھل مل کر رہتے تھے۔ ان کے جلسوں میں، ان کی مجلسوں میں، ان کی تفریحوں میں برابر شریک رہتے تھے، لیکن طاہر صاحب سب سے الگ تھے۔ وہ گھر سے نکلتے تھے، درجہ میں آ بیٹھتے تھے، درجہ سے اُٹھتے تھے، گھر چلے جاتے تھے۔ ملنا جلنا، آنا جانا یہ چیزیں ان کے پروگرام سے بالکل خارج تھیں۔ عید کے دن بھی نہ یہ کہیں جاتے تھے، نہ ان کے گھر پر کسی کو آنے کی اجازت تھی، اگر کوئی آ بھی جائے تو ملنے سے صاف انکار۔ گھر کے مکین صرف دو تھے، ایک یہ خود، ایک ان کی اہلیہ محترمہ، وہ بھی بمبئی کی تھیں۔ پردہ نہیں کرتی تھیں، لیکن بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو شاید یہ جنگل میں رہنا شروع کر دیتے۔

ایک مرتبہ ایک گھنٹہ ان کا بھی ہمیں مل گیا۔ "دیکار آف ویکفیلڈ" پڑھاتے تھے۔ ان کے کلاس میں جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان سے بڑھ کر شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور برجستہ گو استاد شاید ہی کوئی ہو۔ یہ ہنسا ہنسا کر پڑھاتے تھے اور مسکرا مسکرا کر کام لیتے تھے، لیکن جیسے ہی گھنٹہ بجتا تھا، تبسم کو ناتمام چھوڑ کر فوراً ایسے سنجیدہ بن جاتے تھے،

گویا وہ ہونٹ مسکرانا جانتے ہی نہیں ، درجہ میں اسی اخلاق و تپاک اور گرم جوشی سے پیش آتے تھے کہ جی خوش ہو جاتا تھا ، لیکن درجہ سے باہر اگر کبھی مڈبھیڑ ہو جائے تو سلام کا جواب بھی بے تکلف دیتے تھے ، اور گفتگو تو کسی قیمت پر نہیں کرتے تھے ۔

فرض ادا کرنے میں وہ بڑے چوکس تھے ، لیکن حد کے اندر حد سے باہر نہیں ، پانی برسے ، آندھی آئے ، کوئی مصیبت ہو ، وہ غیر حاضر ہونا جانتے ہی نہیں تھے ۔ ٹھیک وقت پر جامعہ پہنچتے تھے ، اور آخری گھنٹہ بجتے ہی دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے ، گھنٹہ ختم ہونے کے بعد ایک سیکنڈ بھی نہیں دیتے تھے ، گھنٹہ کے اندر آپ جو بات پوچھئے ، اس کا شافی و کافی جواب دیں گے ، گھنٹہ بجنے کے بعد اگر آپ ایک لفظ کے معنی بھی پوچھ لیں تو وہ نہیں بتائیں گے ، انکار تک نہیں کریں گے کہ یہ بولنا خلاف وقت ہوا ، خاموش ہو جائیں گے ، گھنٹہ ختم ہو گیا ، اب آپ کو کیا حق ہے کہ ان سے کچھ پوچھیں ؟

وقت کے بڑے پابند تھے ، ٹھیک اسی وقت پہنچتے تھے ، جب افتتاح درس کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ رہی ہوتی تھی ، کبھی کبھی ان کی گھڑی میں اور دفتر کی گھڑی میں ، دو ایک منٹ کا اختلاف ہو جاتا تھا ، مثلاً پہلا گھنٹہ ابھی نہیں بجا ہے ، بس اب بجنے ہی والا ہے ، طلبہ اپنے اپنے درجوں میں پہنچ چکے ہیں ، اساتذہ بھی اپنے اپنے درجوں میں آ چکے ہیں ، لیکن یہ درجہ سے باہر ٹہلتے رہیں گے ، درجہ میں قدم اس وقت رکھیں گے ، جب گھنٹہ سن لیں گے ۔

پروفیسر حبیب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) طاہر صاحب کے ہم زلف ہیں ، وہ اکثر دہلی تشریف لاتے رہتے تھے ، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ طاہر صاحب ان سے ملے ہوں یا انہوں نے طاہر صاحب کی کوٹھی پر جانے کی ہمت کی ہو ، وہ اتنے مردم بیزار تھے کہ حیرت ہوتی تھی ، زندہ کیسے ہیں ۔

مسز طاہر ۱۹۳۲ء میں ایک روز چاندنی چوک کے اندر کانگریسی جلوس کی قیادت کرتی ہوئی گرفتار ہو گئیں ، مقدمہ چلا اور انہیں چھ مہینہ کی سزا ہو گئی جہاں یہ خبر اس اعتبار سے دل خوش کن تھی ، کہ ایک مسلمان خاتون نے اس ہمت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا ، وہاں یہ خیال تکلیف دہ تھا کہ اب طاہر صاحب بالکل اکیلے رہ گئے ،

لیکن خود طاہر صاحب پر بظاہر کوئی اثر نہیں تھا، ان کے پروگرام میں کوئی فرق نہیں آیا، درجہ میں ان کی شگفتہ روئی، اور درجہ سے باہر ان کی پُر اسرار سنجیدگی بدستور قائم رہی، معلوم ہوتا تھا، کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں، کسی کی ہمت نہ پڑی کہ ان سے اظہارِ ہمدردی کرتا، سب دل ہی دل میں اظہارِ ہمدردی کر کے رہ گئے۔

چھ مہینہ کے بعد مسز طاہر رہا ہوئیں، جامعہ کے لوگوں نے ان کے لئے ہار پھول کا بندوبست کیا، لیکن اظہارِ عقیدت کی یہ آزادیاں، جیل کے پھاٹک سے کوٹھی کے دروازہ تک حاصل تھیں، گھر پر پہنچنے کے بعد کس میں ہمت تھی کہ انہیں مبارکباد دے یا اظہارِ مسرت کرے، البتہ طاہر صاحب آج پہلی مرتبہ گھر سے نادقت باہر نکلے، اور ایک ہلکے تبسم کے ساتھ استقبال کیا ؂

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

اس خاموشی، اس مردم بیزاری، اس گوشہ نشینی کو دور کرنے کی بڑی کوششیں شروع شروع میں کی گئیں، لیکن کامیاب نہیں ہوئیں، یہ چپ دفعتاً لگی، ورنہ لوگوں کا بیان ہے کہ طاہر صاحب ایک زمانہ میں سب سے زیادہ "سوشل" انسان تھے، پھر یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جسے کوئی نہ حل کر سکا۔

ڈاکٹر عابد حسین

اردو ادب کا مایہ ناز ادیب اور محقق

جامعہ پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا، سب سے زیادہ محبوب اور ہر دل عزیز شخصیت ذاکر صاحب کے بعد، ڈاکٹر عابد حسین کی ہے اور اس کی وجہ بھی تھی۔ برلن سے وہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر آئے، حوصلوں سے معمور، اور امنگوں سے چور، لیکن نہ سرکاری ملازمت کی طرف متوجہ ہوتے، نہ کسی کالج کی پرنسپلی یا یونیورسٹی کی پروفیسری نے ان کی عنان توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ جامعہ چلے آئے اور روشن مستقبل سے منہ موڑ کر تاریک تر، غیر متیقن اور تکلیف دہ "حال" میں مبتلا ہو گئے، جہاں زیادہ سے زیادہ تنخواہ سو روپیہ تھی، جس کا نہ کوئی گریڈ تھا نہ ترقی کا امکان۔ اس رقم میں گزر کرنا تھا اور بہت زیادہ محنت اور مستعدی اور ایثار سے کام لے کر قوم کی ٹھوس اور بے نمک خدمت کرنی تھی، جس میں نہ نعرے تھے نہ خیر مقدم کے جلسے، نہ پھولوں کے ہار اور طرے، نہ جاں نثاروں اور رضاکاروں کے پرے۔

جس زمانہ میں میں جامعہ پہنچا ہوں، ڈاکٹر صاحب حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز میں ذاکر صاحب سے ملنے گیا تو میں نے دیکھا ان سے بالکل قریب ایک صاحب بیٹھے ہیں۔ دبلا پتلا بدن، چہرہ پر مختصر سی داڑھی (اب منڈچکی ہے)، کھدر کا لباس، زبان میں لکنت، معلوم ہوا، یہی عابد صاحب ہیں، اب وہ مستقل طور پر آچکے تھے۔ اتفاق سے چند روز بعد ان کا گھنٹہ بھی مل گیا۔ اب اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب صرف یہی نہیں کہ فلسفہ مغرب کے ماہر ہیں، بلکہ اردو زبان کے بھی بے مثل محقق ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان کے لب ولہجہ اور تعلیل و تعریف پر ان کی جتنی وسیع نظر ہے شاید ہی کسی کی ہو۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے مشہور اور قابل فخر لغت کنسائز انگلش ڈکشنری کے ترجمہ کا کام کر رہے تھے، یہ لغت چھپ چکا ہے۔ اور جن مترجموں یا زبان کے طالب علموں کو اس سے استفادہ کا موقع ملا ہے وہ اعتراف کریں گے کہ انگریزی

کے محاورات کا، ان کے لطف کا، اختصار کا، اس سے بہتر، مکمل، جامع اور شگفتہ ترجمہ ناممکن ہے۔ یہ ترجمہ سب کا سب ڈاکٹر صاحب کا نہیں ہے۔ اس میں متعدد ارباب زبان شریک ہیں۔ لیکن اس کی تکمیل میں ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ترجمہ کے فن کے امام ہیں، وہ اتنا رواں، سبک اور دل نشین ترجمہ کرتے ہیں اور اس تیز رفتاری سے کرتے ہیں کہ مشکل سے ان کا کوئی حریف ثابت ہو سکے گا۔ گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ "تلاش حق" تمام و کمال ڈاکٹر صاحب کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے اور جن لوگوں نے اس ترجمہ کو اور گاندھی جی کی اصل کتاب کو دیکھا ہے، ان کا بیان ہے، کہ جو اثر اور کیفیت گاندھی جی کی انگریزی میں ہے۔ بالکل وہی کیف اور اثر ڈاکٹر عابد کے اردو ترجمہ میں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک بہت بڑا وصف یہ ہے کہ وہ نئے اور پرانے طلبہ سے یکساں برتاؤ کرتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ تعصب عام ہے، جو طالب علم نیا ہے وہ نگاہ توجہ سے محروم ہے اور جسے کئی برس ہو چکے ہیں، وہ مرکز نگاہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میں یہ بات نہیں، [illegible] میں لکھنؤ یونیورسٹی نے ایک ڈبیٹ کا انتظام کیا جس میں ہندوستان کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے دو مقررین طلب کیے گئے۔ جامعہ کو بھی دعوت نامہ بھیجا، اور ڈاکٹر صاحب کی رائے ہوئی، کہ یہاں سے بھی دو طلبہ بھیجے جائیں، چنانچہ ان کی طرف سے اعلان ہوا، کہ جو صاحب جانا چاہیں وہ ڈبیٹ کے عنوانات پر تیاری کریں، اور فلاں تاریخ کے جلسہ میں تقریریں کریں۔ جن دو مقررین کی تقریریں اچھی سمجھی جائیں گی، انہی کو لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

متعدد طلبہ نے تیاری کی جن میں عبدالسلام قدوائی اور راقم الحروف بھی تھے ہم دونوں نئے تھے، دوسرے بہت پرانے، ڈاکٹر عابد حسین جج تھے، ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ ہم دونوں کے حق میں کیا، حالانکہ مشہور تھا کہ فلاں صاحبان کے ڈاکٹر صاحب سے بڑے تعلقات ہیں، انہی کو ڈاکٹر صاحب پاس کریں گے اور وہی بھیجے جائیں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب کا انصاف جانبداری اور تعلقات سے بالا تھا!

پروفیسر کیلاٹ

ایک نیک دل اور پاک نہاد عیسائی

مدراس یونیورسٹی کے گریجویٹ ایم۔ اے ہیں۔ کچھ دن لندن میں بھی رہ چکے ہیں۔ انگریزی ان کی مادری زبان بن چکی ہے، مدراس کے تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے بھی انگریزی تحریک کا گرمی و خلافت کے زمانہ میں ان کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں مولانا محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی۔ یہ اپنے مستقبل کو خیر باد کہہ کر ایک قلیل اور حقیر معاوضہ پر اس میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ اور عیسائی ہونے کے باوجود اپنی ساری زندگی پورے اخلاص اور سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کو تعلیمی حیثیت سے سربلند کرنے میں صرف کر دی۔ جامعہ پر بڑے بڑے کٹھن وقت آئے، ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ پرانے پرانے رفیقوں نے منہ موڑ لیا۔ لیکن مسٹر کیلاٹ کے ثبات قدم میں کبھی لغزش نہ ہوئی۔ ساری زندگی تجرد کے عالم میں بسر کر دی۔ انہیں بچوں سے بڑی محبت ہے ایک مسلمان ملازم کے لڑکے کو گود لے لیا۔ اور اسے اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح ایک محبت کرنے والا باپ اپنی اولاد کو چاہتا ہے۔ اور اس محبت میں بھی دیانت کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اس لڑکے کی اسلامی تعلیم و تربیت اور نگہداشت پر پورے اخلاص کے ساتھ توجہ کرتے رہے۔

جب میں جامعہ میں داخل ہوا، تو وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا۔ یہاں ورزش لازمی ہے، اور صبح تڑکے فیلڈ میں جا کر ورزش کرنی پڑتی ہے، چنانچہ دوسرے روز ہم نوآموز اور نو وارد لوگوں کا قافلہ علی الصباح فیلڈ میں پہنچا، وہاں ایک صاحب انتظار میں ٹہل رہے تھے، سیاہ رنگ، مضبوط ہاتھ پاؤں، نیکر اور جرسی پہنے ہوئے، دانت موتی کی طرح سفید، باتوں میں اکھڑ بھی اور کڑک بھی۔ یہی مسٹر کیلاٹ تھے، انہوں نے سب سے پہلے ہم نو واردوں پر توجہ کی، اور ورزش کرانے لگے۔

کیلاٹ صاحب کو ورزش سے شوق نہیں عشق ہے۔ وہ خود بھی اس مرض میں مبتلا ہیں، اور جامعہ کے ہر طالب علم تک اس کے جراثیم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر کیلاٹ صاحب پروفیسر نہ ہوتے تو ریسلر ہوتے، اس بڑھاپے میں بھی ان کی توانائی اور مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی نوجوان کے ایک طمانچہ مار دیں تو وہ قلابازیاں کھا جائے،

فرض شناسی کیلاٹ صاحب پر ختم ہے، کچھ روز تک ہمارے "محمد علی ہوسٹل" کے ٹیوٹر بھی رہے، ان کا یہ معمول تھا کہ صبح چار ساڑھے چار بجے بورڈنگ آتیں، اور ہر طالب علم کو سوتے سے اٹھائیں، اپنی نگرانی میں فجر کی نماز پڑھوائیں، اور پھر گھدیرتے ہوتے، جس طرح گلہ بان بھیڑوں کو چرائی کے لئے لے جاتا ہے۔ یہ طالب علموں کو فیلڈ کی سیر کرائیں، اور اس کا خیال بھی رکھیں، کہ طلبہ کے اخلاق و عادات پر کوئی برا اثر تو نہیں پڑ رہا ہے؟ جب تک کیلاٹ صاحب ٹیوٹر رہے، اپنے ان فرائض کو بڑی سچائی اور بڑی ہمت اور مستعدی کے ساتھ انجام دیتے رہے، دسمبر اور جنوری کے جاڑے میں دمہ کے مریض ہونے کے باوجود زور زور سے سانس لیتے ہوئے صبح تڑکے بورڈنگ پہنچ جاتے تھے۔

میں محمد علی ہوسٹل کا ہاؤس مانیٹر تھا۔ ہاؤس مانیٹر کا فرض ہے کہ وہ ٹیوٹر کی خدمت میں ڈائری پیش کرتا رہے، اور ہر روز کے احوال وکوائف اور ضروریات اور احتیاجات اور شکایات و مطالبات سے اُسے واقف کرتا رہے۔ ایک روز میں نے اپنی ڈائری میں، ایک طالب علم کی شکایت لکھی کہ جب مغرب کی نماز ہو رہی تھی تو یہ ہاتھ میں اسٹک لئے ہوئے سامنے کھڑے سگریٹ پی رہے تھے نہ صرف یہ کہ نماز میں نہیں آئے بلکہ زور زور سے ہنس ہنس کر نماز میں خلل بھی ڈالتے رہے۔ اس سے قبل بھی یہ اس طرح کی حرکتیں کئی بار کر چکے ہیں، یہ آزاد خیال بھی بہت ہیں، اور مذہب کا مذاق بھی اڑاتے رہتے ہیں، لہٰذا ان کی طرف خاص توجہ کی جائے۔

کیلاٹ صاحب نے جیسے ہی میری ڈائری پڑھی بادو باراں کی طرح گرجتے اور برستے تشریف لائے، اور ان صاحب کو اتنا لتاڑا، اتنا ڈانٹا، اتنی سرزنش کی کہ ان کا مزاج درست ہوگیا۔ میں نے کیلاٹ صاحب کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا، انہوں نے زور سے ان کا کالر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا، ایک اسلامی ادارہ میں رہتے ہوئے تمہیں یہ باتیں کرتے شرم نہیں آتی، تم اگر لامذہب ہو بدعقیدہ ہو، بے دین ہو، تو بہت سی درسگاہیں ہیں جن کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوتے ہیں، لیکن جامعہ کا دروازہ تمہارے لئے ہرگز نہیں کھولا جاسکتا، اب اگر کسی وقت کی بھی نماز باجماعت سے تم غیر حاضر رہے تو نہ تم بورڈنگ میں رہ سکو گے نہ جامعہ میں۔ کیلاٹ صاحب ڈانٹ ڈپٹ کے چلے گئے۔ اور میں سوچتا رہ گیا یہ شخص کتنے اونچے کیرکٹر کا۔ عیسائی ہے، لیکن مسلم ادارہ کو ایک سچے مسلمان کی طرح چلاتا ہے!

پروفیسر محمد مجیب

اے تماشا گاہ عالم روئے تو

بوٹا سا قد، شرمیلی آنکھیں، روشن اور تابناک چہرہ، فراخ پیشانی، رنگ انگریزوں کی طرح گورا، دل، روح مسلمان کی طرح صاف اور شفاف، باتیں جیسے ابن مریم، پلکیں جیسے دامن مریم، کیا مجال جو کسی کے سامنے اٹھ جائیں، شرمیلے ایسے جیسے عروس نو، باوقار اتنے جیسے سورج کا نور، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، تحقیق و تدقیق کا خاص موضوع انگریزی ادب پر، اہل زبان کی طرح عبور، عیش و تنعم کے گہوارے میں پلے، دولت اور امارت کے جھولے میں جھولے، لندن اور برلن کی دانش گاہوں سے سند فضیلت حاصل کی، باپ (مولوی محمد نسیم) لکھنؤ کے مشہور و معروف متمول وکیل، ایک بھائی (مسٹر وسیم) لکھنؤ چیف کورٹ کے چوٹی کے بیرسٹر، دوسرے بھائی (پروفیسر حبیب) علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے چیئرمین، چاہتے تو واپس آکر بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہو سکتے تھے۔ لیکن جامعہ کے جادوگر (ڈاکٹر ذاکر) سے مسحور ہو چکے تھے، طلب دنیا سے بے نیاز ہو کر جامعہ پہنچے، اور اسّی روپیہ کے "گراں قدر" مشاہرہ پر حلقہ اساتذہ میں شامل ہو گئے، اور زندگی بھر کا پیمانِ وفا لکھ کر دے دیا، جسے کم و بیش بیس برس کی مدت ہو گئی برابر نباہے جا رہے ہیں۔

طبیعت میں شوخی اور زندہ دلی، بذلہ سنجی اور برجستہ گوئی کا مادہ بھی موجود ہے ہمارے درجہ کو پہلے تاریخ پڑھاتے تھے۔ پھر شیخ الجامعہ نے تاریخ خود لے لی، اور انگریزی ان کے حوالہ کر دی۔ ہم لوگ اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر پہنچے، ہمیں دیکھ کر مسکرائے، پھر نہایت سادگی کے ساتھ فرمایا، آپ لوگوں نے کچھ ترقی کی ہے یا میں نے تنزل کیا ہے؟

آرٹ اور فنون لطیفہ سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، ایک مرتبہ جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر ایک اصلاحی ڈرامہ پروڈیوس کیا، مہینہ بھر پہلے سے اس کی تیاریوں میں اور پھر ریہرسل میں منہمک ہو گئے، ایک روز اپنے کمرہ میں مجھ سے اور عبدالسلام صاحب قدوائی سے فرمایا،

آج ظہر بعد ذرا میرے گھر پر تشریف لایئے گا۔ ہم لوگ ظہر بعد پہنچے تو فرمایا اس ڈرامہ کے فلاں دو کیریکٹر آپ دونوں پر بہت فٹ آتے ہیں۔ انہیں مجھ سے سمجھ لیجیے اور کل سے باقاعدہ ریہرسل میں شرکت کیجیے۔ عبدالسلام صاحب کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، داڑھی کا رنگ تو بیشک سیاہ تھا ورنہ سارا چہرہ سفید پڑ چکا تھا، ڈرامہ میں حصہ لینا ان کے نزدیک زیادہ معیوب نہیں تھا، لیکن وہ خدا کی طرح سید صاحب کو سمیع و بصیر، علیم و خبیر سمجھ رہے تھے، یہ سوچ سوچ کر ان کا خون خشک ہوا جا رہا تھا کہ اگر سید صاحب نے سن لیا۔ اگر سید صاحب کو معلوم ہوگیا تو کیا ہو گا، یہ اندیشہ بڑا بھیانک تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس میں پھانسی سے لے کر خلود فی النار تک کی سزا شامل ہو سکتی ہے اور وہ ان میں سے کوئی سزا بھگتنے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ بار بار میرے چٹکی لے رہے تھے کہ تم انکار کر دو میں تائید کر دوں گا۔ میں بار بار چٹکی کا جواب زور کی چٹکی سے دے رہا تھا کہ پہلے تم انکار کرو تائید میں کروں گا۔ مجیب صاحب ہمارے جواب کے منتظر تھے، ہماری خاموش آنکھیں اور خاموش لب ان کی طرف تھے، لیکن ہم دونوں میں نہایت تیزی کے ساتھ چٹکیوں کے ذریعہ تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری تھا، مجیب صاحب حیران تھے کہ ان دونوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں بولتے، انھوں نے پھر پوچھا، تو کل سے آپ آئیں گے نا؟ عبدالسلام صاحب نے "جی ہاں" کہا، اور اٹھے ان کے ساتھ میں بھی، باہر آکر میں نے پوچھا، چلو گے کل؟ جواب دیا "اور سید صاحب"؟ میں نے کہا "پھر؟" فرمایا "یہی تو سوچ رہا ہوں" عشا کے بعد ایک ترکیب ذہن میں آئی، عبدالسلام نے کہا "چلو شفیق صاحب کے پاس!" انہیں بڑی لمبی حجت کے ساتھ شفاعت پر آمادہ کیا، انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا، اور ذاکر صاحب نے مجیب صاحب سے سفارش کی کہ ان دونوں کو معاف کر دیجیے، مجیب صاحب نے معاف تو کر دیا لیکن انہیں حیرت تھی کہ "اس میں حرج کیا تھا"۔ وہ کیا جانتے تھے کہ حرج کچھ نہیں تھا "مالک الرقاب" کی دہشت تھی۔

احمد شاہ بخاری

بوئے دل از غبار مے آید

مولانا شوکت علی کے بعد روزنامہ خلافت کی ایڈیٹری، اور خلافت ہاؤس کے قیام سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا، اور میں نے طے کر لیا کہ اب میں خلافت سے ترکِ تعلق کر لوں گا، زاہد صاحب وغیرہ نے باچشمِ گریاں مجھے روکنے کی کوشش کی، لیکن میرا ارادہ اٹل تھا۔

اتفاقاً اس زمانہ میں، میری نظر سے ٹائمز آف انڈیا میں ایک اشتہار گزرا آل انڈیا ریڈیو کو ایک جرنلسٹ کی ضرورت تھی، شرط یہ تھی کہ وہ صحافت کا تجربہ رکھتا ہو، خبروں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر سکتا ہو، کچھ لٹریری ذوق بھی رکھتا ہو، اور کسی بلند پایہ روزنامہ سے کچھ عرصہ تک وابستہ بھی رہ چکا ہو، میں نے فوراً ایک درخواست ہی دہلی بھیج دی۔

بعض دوستوں نے بتایا کہ صرف اہلیت اور استحقاق سے کام نہیں چل سکتا "سفارش" بھی ضروری ہے، حکومت کے کسی محکمہ میں بالعموم، اور ریڈیو کے محکمہ میں بالخصوص بغیر "سفارش" کے کوئی ملازمت نہیں مل سکتی، میں نے ایک خط خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا، معلوم تھا یہ محکمہ ان سے نیازمندانہ تعلقات رکھتا ہے، دوسرا خط حضرت سالک بٹالوی مدیر روزنامہ انقلاب (لاہور) کو لکھا، مشہور تھا کہ ان سے اور احمد شاہ بخاری (کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو) سے بڑا یارانہ ہے، تیسرا خط، اپنے محترم اور سراپا اخلاق و شفقت اُستاد پروفیسر مجیب کو لکھا، وہ ریڈیو کی مشاورتی کمیٹی کے ایک با اثر ممبر تھے، اور خود بمبئی سے پونہ پہنچا، اور سیدھا، مسٹر یٰسین نوری، وزیر حکومت بمبئی کے دفتر میں آموجود ہوا اور ان سے کہا تکلّف برطرف، آپ بھی بےحد مصروف ہیں اور میں بھی دوسری ٹرین سے واپس جانا چاہتا ہوں، بخاری صاحب کے نام ایک سفارشی خط چاہیئے آپ کا، انھوں نے فوراً اپنے اسٹینو گرافر کو بلایا، اور خط کے بجائے ایک قصیدہ مدحیہ میری شان میں لکھا اور لفافہ میں بند کر کے میرے حوالہ کر دیا، اور کہا یہ بخاری صاحب کو

دے دینا، جب میں چلنے لگا، تو آواز آئی ٹھہر و میں رک گیا۔ فرمایا۔ یہاں آؤ، میں سامنے پہنچا، کہنے لگے بخاری صاحب کو میں نے خط تو لکھ دیا ہے۔ لیکن میرے ان کے ذاتی تعلقات کچھ زیادہ نہیں میں تمہیں ایک اور خط دیتا ہوں۔ یہ تم ابھی جاکر ڈاکٹر نذیر کو دے دینا، وہ بخاری صاحب کے بچپن سے لندن تک کے دوست ہیں۔ ان کا خط میرے خط سے زیادہ اثر کرے گا۔ اندھا کیا چاہتے دو آنکھیں، میں نے کہا لائیے۔ انھوں نے جلدی سے ایک اور خط لکھا، اور میرے حوالہ کر دیا۔ بہرحال پہنچ کر میں نے ڈاکٹر نذیر سے بھی خط لے لیا، وہ مجھے بالکل نہیں جانتے تھے، لیکن نوری صاحب کے اعتماد پر انہوں نے بھی ایک پُر زور سفارشی خط مجھے دے دیا۔ اور تاکید کی کہ اپنے ہاتھ سے بخاری صاحب کو دینا۔ اور لفافہ پر احتیاطاً BY HAND بھی لکھ دیا۔

چند روز بعد خواجہ حسن نظامی صاحب کا جواب آیا، کہ ریڈیو والے کسی کی سنتے نہیں، جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔ میں نے آپ کی سفارش خود بخاری صاحب کے دولت کدہ پر جاکر دی ہے۔ لیکن نہ میں زیادہ پُر امید ہوں نہ آپ کو زیادہ امید قائم کرنی چاہیئے، اسی ڈاک سے پروفیسر مجیب کا خط ملا، لکھا تھا کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔ ریڈیو کے حکام من مانی کارروائیاں کرتے ہیں، کسی سفارش سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ ان کی خود مختاری پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا، دوسرے روز سالک صاحب کا خط ملا۔ انہوں نے زیادہ صفائی کے ساتھ صورتحال منکشف کر دی۔ انہوں نے لکھا۔ آپ کا خط ملتے ہی میں نے بخاری صاحب کو ایک پُر زور سفارشی خط آپ کے بارے میں لکھ دیا ہے۔ اتفاق سے ایک دوست آج لاہور سے دہلی جا رہے تھے، ان کی معرفت پیغام بھی کہلا دیا ہے۔ لیکن یاد رکھیئے "ریڈیو والے ملازمت کا اشتہار بالعموم اس وقت دیتے ہیں، جب اشتہار سے پہلے کسی کو رکھ چکے ہوتے ہیں یا کم از کم طے کر لیتے ہیں کہ یہ جگہ فلاں شخص کو دینی ہے۔ پھر خانہ پُری کے لیے اشتہار دے دیتے ہیں لہذا اگر کامیابی نہ ہو جس کا اندیشہ ہے، تو دل برداشتہ نہ ہو جیئے گا۔

ان یاس انگیز جوابات نے حوصلہ پست کر دیا، امیدوں کا قلعہ مسمار کر دیا۔ لیکن دنیا امید قائم ابھی نوری صاحب کا نسخہ آزمانا باقی تھا، اسی اثنا میں مجھے ایک خط محکمہ ریڈیو کی طرف سے ملا، جس میں انٹرویو کے لیے دہلی طلب کیا گیا تھا، مایوسی کی تاریکی میں امید کی کرن پیدا ہوئی اور میں امیدوں اور آرزوؤں کا زاد راہ لے کر دہلی کے سفر پر چل پڑا، فرنٹیر میل سے روانہ ہوا۔ میرے ڈبے میں سعادت حسن منٹو بھی موجود تھے، یہ بھی دہلی جا رہے تھے، انٹرویو میں یہ بھی

بلائے گئے تھے اور یہ مجھ سے بہت زیادہ پُرامید تھے، بلکہ کہنا چاہیے یہ طے کر کے جا رہے تھے کہ اب بمبئی نہیں آنا ہے، تقرر یقینی ہے، دہلی ہی میں رہ ہیں گے راستہ میں کئی بار انہوں نے دلی کے تانگہ والوں کی، موسم کی، وہاں کے گرد و غبار کی شکایت کی کہ ایسی جگہ مستقل طور پر قیام جہاں نفع بخش ہوگا، وہاں تکلیف دہ بھی ہوگا۔

دوسرے دن انٹرویو ہوا، یہاں صرف رئیس احمد جعفری اور سعادت حسن منٹو نہیں تھے، ہجوم عاشقاں تھا، بلا مبالغہ کئی سو صحافی "انٹرویو کے لیے موجود تھے ان میں وہ بھی تھے جو اُردو میں بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے، اور وہ بھی تھے جو انگریزی سے ناواقف محض تھے، لیکن بخاری صاحب کے ریڈیو نے انہیں انٹرویو کے لیے بلایا تھا، اور اس لیے بلایا تھا، کہ ان سے کامیاب اُمیدوار کی دو برس کی تنخواہ درخواست کی فیس داخلہ کی صورت میں وصول کی جا چکی تھی اور دوسرے یہ کہ ان کا سفر خرچ انہی کے ذمہ تھا۔ ریڈیو کے محکمہ کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

یہ رنگ دیکھ کر اور دہلی میں مزید واقعات "ریڈیو گردی" کے سُن کر میں نے بخاری صاحب سے ملنا مناسب نہ سمجھا، نوری صاحب، اور ڈاکٹر نذیر صاحب کے خطوط اپنے ایک خط کے ہمراہ ڈاک سے بھیج دیئے، اور دوسرے روز بمبئی چلا آیا۔

بمبئی آنے کے چند روز بعد نتیجہ شائع ہوا، اور خواجہ صاحب، سالک صاحب، مجیب صاحب کے بیانات کی تصدیق ہوگئی، میں تو میں منٹو صاحب بھی نظر انداز کر دیئے گئے، حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ معقول بنیادوں پر اُمید کی دنیا بسائے ہوئے تھے۔

چند روز بعد احمد شاہ (بخاری) کا ایک خط اُردو زبان میں مجھ کو ملا، لکھا تھا آپ کے خط نے میرے دل پر دستک دی، لیکن کیا کروں حکمہ ہے اور اس کے قواعد و روایات سے مجبور ہوں، کاش! میں آپ کا نام منظور کر سکتا، لیکن کوئی مضائقہ نہیں میں دل سے خیال رکھوں گا، اور ضرور آپ کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ نکالوں گا۔ یہ مرہم کارگر ہوا، اور اُمید کا ٹوٹا ہوا تعلق پھر خود بخود آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

اب میں خلافت سے الگ ہو چکا تھا۔ اور اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہندوستان نکال رہا تھا، لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا پھر میں نے بخاری صاحب کو ایک خط لکھا، کہ آپ کا وعدہ، اب تک دل پر نقش ہے، لیکن آپ شاید اسے بھول گئے، چند روز بعد جواب آیا، میں فلاں تاریخ کو بمبئی آ رہا ہوں، آپ مجھ سے ضرور ملیے، فلاں تاریخ کو میں احمد شاہ

سے ملنے ریڈیو کے دفتر پہنچا۔ بہت مصروف تھے، لیکن دروازہ تک آکر معانقہ کیا، اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ بڑی دیر تک گھل مل کے باتیں کرتے رہے، معلوم ہوتا تھا، ان سے بڑھ کر ہمدرد، ملنسار، خادم خلق، بہی خواہ ملت، علمبردار اردو کوئی نہیں ہے، بار بار اپنے وعدہ کا اعادہ کرتے تھے اور شرما کر سر جھکا لیتے تھے۔ اور از سر نو اس کی تجدید کرتے تھے، اور دہلی جاکر "فوراً" کوئی اقدام کرنے کا خوش آئند اعلان کرتے تھے، میں ان کے اس حسن اخلاق سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فرمایا ذوالفقار بخاری کے زمانہ میں تو اکثر آپ کا پروگرام ہوا کرتا تھا میں نے کہا جی ہاں، وہ اس قابل سمجھتے تھے، لیکن اب وہ جنگ کی وجہ سے لندن میں ہیں، اور ان کے جانشیں مجھے اس قابل نہیں سمجھتے میری عادت نہیں کہ پروگرام حاصل کرنے کے لیے طواف اور سجدۂ تعظیم کروں۔ مسکرائے، بھر لاحول کہہ کر منہ بنایا، پھر گھنٹی بجائی اور پروگرام ڈائریکٹر کو بلایا، اُسے ڈانٹا، جعفری صاحب بمبئی میں ہیں، پھر بھی ان کا پروگرام نہیں ہوتا یہ کیا لغویت ہے۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا، اور دوسرے روز میرے پاس کنٹریکٹ فارم پہنچ گیا، ایک ٹاک کا، لیکن احمد شاہ کے جانے کے بعد پروگرام ڈائریکٹر نے اس غلطی کا پھر اعادہ نہیں کیا، اور دہلی پہنچنے کے بعد احمد شاہ پھر "مصروف" ہو گئے، بعد میں معلوم ہوا ان کے حسن اخلاق اور "مصروفیت" اور "وعدۂ فردا" کے شہیدوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان کشتگانِ نازکی فہرست میں ایک نام میرا بھی تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن احمد شاہ بخاری یاد اکثر آتے ہیں۔ لیکن پھر نہ ملاقات کی نوبت آئی نہ خط و کتابت کی۔

رشید احمد صدیقی

شوخ نگار ـــــ سنجیدہ گفتار

ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ حسب عادت میں مولانا عبدالماجد دریا بادی سے شرف نیاز حاصل کرنے خاتون منزل گیا، تانگہ تیار کھڑا تھا، اور مولانا کہیں باہر تشریف لئے جا رہے تھے، فرمایا آپ بھی بیٹھ جائیے، میں بیٹھ گیا۔

تانگہ میڈیکل کالج کے دروازہ پر جا کر رکا، ہم اسپیشل وارڈ میں پہنچے، ایک صاحب نہایت آرام سے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، لیٹے لیٹے انہوں نے مولانا کا خیر مقدم کیا، یہ رشید احمد صاحب صدیقی تھے، صاحب طرز مزاح نگار، علیگڑھ میگزین کے مشہور ایڈیٹر، گردہ کا آپریشن ہوا تھا، اور شاید ایک نکال بھی دیا گیا تھا، شروع میں حالت بہت نازک تھی، لیکن اب قابل اطمینان حد تک تندرست ہوتے جا رہے تھے۔

رشید صاحب کی شوخ سنجیدگی، یا سنجیدہ شوخی کے اہل نظر قائل تھے، شوخی پہلے ہو یا بعد میں، لیکن تھی، ان کے ادب کا ایک غیر منفک جزو، خیال تھا، گفتگو میں بھی شوخی ہو گی، باتوں میں بھی زندہ دلی کے عناصر ہوں گے، لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ تحریر میں شوخی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، اور گفتگو میں وہ اسے پاس نہیں پھٹکنے دیتے، اتنے نستعلیق، سنجیدہ اور سراپا وقار نظر آتے ہیں کہ گمان بھی نہیں ہو سکتا، یہ شوخی سے آشنا ہیں، مولانا نے ایک آدھ بار انہیں اکسانے کی کوشش کی، لیکن وہ "چھٹے ہوئے کارتوس" کی طرح خاموش ہی رہے حیرت ہوئی، کہ جو شخص روتے کو ہنسا سکتا ہے وہ خود۔

صورت یہ ہیں، حالت میری

کا مصداق بنا ہوا ہے، یہ سنجیدگی اور متانت علالت کے سبب نہ تھی تندرستی کے عالم میں بھی میں نے انہیں دو ایک بار دہلی میں دیکھا ہے، جب بھی یہی رنگ غالب تھا، اسے کمال بھی کہہ سکتے ہیں

کہ گفتگو کیجئے، تو شرمسار اور اشکبار، تحریر دیکھئے تو باغ و بہار، اور زعفران زار۔

تھوڑی دیر میں عیادت کے لئے مولانا ظفر الملک صاحب علوی بھی تشریف لے آئے، اور گفتگو ادب اردو پر چھڑ گئی۔ رشید صاحب نے کہا یونیورسٹی والے بھی عجیب ستم ظریف واقع ہوئے ہیں، سجاد حیدر کو رجسٹرار بنا رکھا ہے، حالانکہ اگر انہیں شعبہ اردو کا چیرمین بنا دیں تو چار چاند لگ جائیں، اس شعبہ کو چیر میر محفوظ علی کی ادبیت کا ذکر چھیڑا، کہنے لگے، یہ اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم نے اتنے بڑے ادیب کو جس کا کوئی جواب نہیں ہے، کھو دیا، اس شخص کی تحریر میں جو بات ہے وہ میں نے کسی ادب میں نہیں دیکھی۔

جامعہ آنے کے بعد رشید صاحب سے ملاقات کا کوئی موقع تو نہیں ملا لیکن انہیں دیکھنے اور ان کی شوخی سے خالی، سنجیدہ باتوں کے سننے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ ایک بار میں نے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے شکایت کی کہ آخر یہ کیا بات ہے، تحریر میں رشید صاحب جتنے شوخ ہیں، گفتگو میں اتنے ہی باوقار اور باتمکین؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے رشید صاحب کی شخصیت پر ایک پر مغز لیکچر دے ڈالا۔ اور فرمایا، ان کی قابلیت، ان کی تحریری خوبیاں، ان کی ظرافت، یہ سب چیزیں اپنی جگہ مسلم ہیں، اور قابل تعریف ہیں، لیکن یہ ان کے اصلی اوصاف نہیں ہیں، ان کا اصلی وصف یہ ہے کہ وہ بہت اچھے، بہت بڑے انسان ہیں، بہ حیثیت انسان کے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

رشید صاحب ڈاکٹر صاحب کو "مرشد" کہتے ہیں، لیکن اس وقت معاملہ بالکل برعکس معلوم ہو رہا تھا۔

سجاد حیدر یلدرم

ممالکِ اسلامیہ کا سیاح، حجاز مقدس کا رہ نورد

شمالی ہند کا کوئی سر برآوردہ شخص بمبئی آئے اور مولانا عرفان مرحوم اس سے ملاقات نہ کریں، اسے خلافت ہاؤس میں مدعو کرنے کی کوشش نہ کریں اس کی مشکلات دور کرنے میں سعی بلیغ نہ کریں یہ ناممکن تھا، اسی طرح حج کے موسم میں بندرگاہ پر روزانہ جانا، حاجیوں کی خبر گیری کرنا، انکی شکایتیں سننا اور انہیں دور کرانے کی کوشش کرنا۔ جب تک سوئے بیت الحرام جہاز روانہ نہ ہو جائے گودی پر موجود رہنا۔ اور اگر کوئی دوست جا رہا ہو تو جہاز کی روانگی کی آخری سیٹی تک جہاز میں مقیم رہنا، مولینا کا محبوب ترین اور مرغوب ترین مشغلہ تھا۔

حج کا زمانہ تھا، حاجیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز مولانا عرفان، اپنی دلآویز مسکراہٹ، اور روایتی تیز رفتاری کے ساتھ سیاہ رنگ کی ٹوپی ہاتھ میں لیے میرے کمرہ میں تشریف لاتے، کیشیئر میرے پاس بیٹھا تھا، اور میں حساب کتاب کا رجسٹر سامنے رکھے اس کی تنقیح کر رہا تھا تکلف برطرف مولانا نے قدم رنجہ فرماتے ہی بڑے زور سے رجسٹر بند کیا، اور کیشیئر کی گود میں ڈال دیا، وہ غریب اچک پڑا، میں نے پوچھا کیا ارادہ ہے، مولانا؟ فرمایا، اٹھو چلو آج تمہیں ایک بڑے اچھے آدمی سے ملائیں گے میں نے کثرت کار کا عذر کیا، فرمایا، کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا، تمہیں چلنا پڑے گا۔ اٹھو، اچکن پہنو۔

میں تیار ہو کر مولانا کے ساتھ خلافت کی موٹر پر روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ گودی پہنچ گئے، زائرین حج کا انبوہ در انبوہ جمع تھا، یہ سب مشقتیں اور مصیبتیں اٹھاتے ہوئے، جوش و خروش، بے تابی اور ولولہ کے ساتھ، دیارِ حبیب کی طرف جا رہے تھے، انہی میں ایک پستہ قد، دُبلے پتلے، منحنی سے آدمی کی طرف مولانا عرفان لپکے، انہوں نے مصافحہ کیا، مولانا نے ان کا مصافحہ والا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا، معلوم ہوا، یہ سجاد حیدر صاحب یلدرم ہیں، جو حج

کرنے جارہے ہیں۔

بمبئی کے ایک دلچسپ بزرگ نوابزادہ مرتضیٰ علی خاں، یلدرم صاحب کے ساتھ تھے یہ علیگ ہیں، اور بمبئی میں باہر سے آنے والے علیگ کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے ہیں مسٹر سید حسین صاحب جب امریکہ سے پہلی بار آئے تھے تب بھی یہ ان کے ہمزاد بنے ہوئے تھے، اب یلدرم صاحب کے ساتھ وہ ملحق تھے۔ اس لفظ کی معنویت پر غور کیجئے ان کا انداز وابستگی سمجھ میں آجائے گا۔

یلدرم صاحب کو ممالک اسلامیہ وعربیہ کی سیاحت کا بڑا شوق تھا، اور حجاز تو ان کا مرکز آرزو تھا۔ انہوں نے مصر کی رنگینیاں دیکھیں، عراق کی جلوہ ریزیاں ملاحظہ کیں، افغانستان کی عشوہ طرازیوں کا نظارہ کیا، ایران کی نشاط آفرینیوں کو دیکھا، اور بے محابا دیکھا ترکیہ جدید وقدیم کو دیکھا، پرکھا، اور پایا، یہ ترکیہ ہی کے سفر کا نتیجہ تھا، کہ وہ "یلدرم" ہو گئے، انہیں ترکوں سے ترکیہ کے وقار نسائیت اور شکوہ مردانہ سے، اس کے سپاہیانہ لٹریچر اور بانکے ادب سے بڑی دلچسپی تھی، ان کا سرمایۂ ادب زیادہ تر، ترکی تراجم ہی تھے، ترکی ڈراموں، افسانوں اور ناولوں کو ترکی لب ولہجہ میں ترجمہ کرنے کی طرح انہی نے ڈالی تھی، اور اپنے انداز خاص کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک بڑا مقام حاصل کر لیا تھا۔

میں نے پوچھا، حجاز کا نمبر سب سے آخر میں کیوں آیا؟ آنکھیں پُرآب ہو گئیں فرمایا۔ دیر ہی سہی، لیکن وہ نعمت مل گئی، جو زندگی میں ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہی تھی، فرسٹ کلاس کے مسافر تھے، لیکن سادگی کا یہ عالم تھا، کہ ساز وسامان کے اعتبار سے تھرڈ کلاس کے مسافروں سے چشمک زن تھے۔

بڑی دیر تک ترکیہ جدید وقدیم، اور ایران جدید وقدیم کی باتیں کرتے رہے لیکن ہر پھر کے حجاز کے ذکر پر آجاتے تھے، کم از کم اس مجلس میں وہ چھیڑ چھیڑ کر یہی ذکر سننا چاہتے تھے، اور کرید کرید کر یہی ذکر کرنا چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ حجاز کی "سیاحت"، پر نہیں جارہے ہیں، جذبۂ طواف وسعی سے مجبور ہو کر جارہے ہیں، صورت دیکھئے تو تفریح کا ب، باتیں سنئے تو مرد مسلمان، دل دیکھئے تو نور ایمان سے معمور! رحمۃ اللہ علیہ!

ظہور احمد وحشی

کامیاب ادیب، ناکام تاجر

اُردو کے مشہور ادیب تھے، عربی زبان پر غیر معمولی قدرت تھی، علوم متعارفہ پر وسیع اور گہری نظر تھی، ندوہ کے دور اولین کے طالب علم تھے، اور اپنے زمانہ طالب علمی میں بزرگوں اور اُستادوں کی تحسین وستائش کے سزاوار بنتے رہتے تھے الندوہ میں مولینا شبلی مرحوم نے ان کے مضامین چھاپے، ندوہ کے سالانہ جلسوں میں ان کی عربی دانی کے مظاہرے ہوتے۔ اور الندوہ میں ان کی رپورٹ شائع ہوئی بڑے ذہین، پُرگو، اور زود نویس تھے۔

اگر مولانا شبلی کے ساتھ وابستہ رہتے تو علمی ترقی میں کسی سے پیچھے نہ رہتے، آج مولینا سید سلیمان ندوی کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا۔ لیکن طالب علمی کا زمانہ نیک نامی اور شہرت کے ساتھ ختم کرکے ندوہ، اور مولینا شبلی سے الگ ہوگئے، رہنے والے شاہجہان پور کے تھے، مگر دلی کو اپنا مسکن بنا لیا، اور ہیرا پھیری دیار انہیں کچھ ایسا بھایا کہ وہیں مرے اور دفن ہوئے

تجارت اور کاروبار سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی جذبہ کے ماتحت، لکھنؤ سے دلی پہنچے تھے وہاں خواجہ حسن نظامی صاحب کو اپنا کاروباری مرشد بنالیا، جب تک زندہ رہے ان کے حلقہ احباب میں شامل رہے، کئی رسالے نکالے، کئی اخباروں کی ایڈیٹری کی، ذاتی پریس قائم کیا، کتابوں کی تالیف طباعت، اور اشاعت کا کام بھی کیا، زندگی بھر اطمینان سے دال روٹی کھاتے رہے، لیکن کاروبار میں ترقی کرنے، چمکنے اور اُبھرنے کی جو امید لے کر دلی گئے تھے، وہ کبھی پوری نہ ہوئی اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ سرمایہ کم تھا، یا یہ ہوگی، کہ طبیعت ذرا متلون قسم کی پائی تھی ایک کام جم کر زیادہ دنوں تک نہیں کرتے تھے۔

افسانے بھی لکھتے تھے، اور اچھے لکھتے تھے، اصلاحی رنگ غالب ہوتا تھا، فارسی اور عربی کتابوں کے تراجم بھی کرتے تھے، اور خوب لکھتے تھے، سیاسیات پر بھی خامہ فرسائی کرتے تھے،

لیکن سوجھ بوجھ کے ساتھ ضرورت پڑ جاتی تھی، تو ذاتیات پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے، اور اپنی جولانیٔ طبع اور شوخیٔ تحریر کے وہ نمونے دکھاتے تھے کہ حریف بھی لطف لیتے اور تعریف کرتے تھے۔

مسیح الملک مرحوم کے فرزند ارجمند حکیم جمیل خاں سے، اور قاضی عبدالغفار سے جب جنگ زرگری شروع ہوئی، اور قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار "کمیشن" میں اپنے طنزیات اور کمالات ادب کا مظاہرہ شروع کیا، تو جمیل خاں کی طرف سے جس نے ترکی بہ ترکی جواب پوری شان ادبیت کے ساتھ دیا اور حریف کو زچ زچ کر دیا، وہ یہی ادیب تھا، ایک طرف قاضی صاحب کی محفل ادب جمی ہوئی تھی، جس میں بڑے بڑے پھبتیت اور لطرنت موجود تھے دوسری طرف یکہ و تنہا یہ ملا تھا، جس نے مردانگی کے ساتھ حریف کے وار اپنی سپر پر روکے، اور اپنے وار سے حریف کی سپر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔

جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میں اور عبدالسلام صاحب قدوائی ندوہ کی انجمن طلبائے قدیم کی صدارت کی دعوت دینے ایک بار پہنچے، بڑے تپاک اور اخلاق سے پیش آئے، غالباً اپنا چندہ بھی اس وقت دے دیا، لیکن صدارت تو صدارت، شرکت تک سے صاف انکار کر دیا، اپنے پریس کی مشینوں کے بیچ میں میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے، اور پروف دیکھ رہے تھے، پروف ایک طرف پھینک دیئے، اور ندوہ کے خلاف مولانا سید سلیمان ندوی کے خلاف مولانا مسعود علی ندوی کے خلاف، اس طرح گرجنے اور برسنے لگے، گویا ان کے سامنے رئیس احمد جعفری اور عبدالسلام قدوائی نہیں بیٹھے تھے، بلکہ مولانا سید سلیمان اور مولانا مسعود علی بیٹھے تھے، اور وہ تصفیۂ زمین بر سر زمین کے مطابق اسی وقت اور ابھی فیصلہ کر لینا چاہتے تھے۔ زبان کے کڑوے لیکن دل کے کھرے تھے۔

جو دل میں وہ زباں پر اللہ جانتا ہے

خدا ان کی مغفرت کرے، اب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ

"اِک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت"

ندوہ کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اعیان و عمائد، علما و صلحا، صوفیا، و حکما، کا ایک باوقار مجمع اسٹیج کے سامنے کی کرسیوں پر رونق افروز ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کرسی صدارت پر رونق افروز ہیں صدر کے پاس ایک بوڑھا، لیکن ضخیم و شحیم شخص باوقار انداز میں کھڑا ہوا اپنا ایک علمی مقالہ پڑھ رہا ہے اور حاضرین اس کی قابلیت، وسعت علم اور ہمہ دانی کی داد دے رہے ہیں، یہ فرشتہ صورت، اور انسان سیرت بزرگ فلورا فلورنڈا، مقدس نازنین، دربار حرام پور، حسن کا ڈاکو، غیب داں دلہن، تاریخ سندھ، گذشتہ لکھنؤ، اور حروب صلیبیہ وغیرہ کے یگانۂ روزگار اور مشہور انام مصنف و مؤلف مولانا عبدالحلیم شررؔ تھے۔

مولینا شررؔ ادب عربی کے ماہر تھے، اور عربی زبان کی مشہور کتاب "اغانی" کے تو گویا ماہر خصوصی تھے۔ ان کی مشہور کتابیں "قیس و لبنیٰ" "ایام عرب" وغیرہ اسی کتاب جلیل سے ماخوذ ہیں۔ وقت کے نبض شناس تھے۔ لکھنؤ کی اسلامی حکومت کا زوال بچپن کی آنکھوں سے دیکھا تھا، جس کا نقش مدت العمر مرتسم رہا۔ لکھنؤ کے ہیرو واجد علی شاہ کے زندان خانہ مٹیا برج (کلکتہ) میں ہوش کی آنکھیں کھولیں، مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر آنکھیں روتی تھیں، عیسائیوں کی قوت و شوکت پر دل کڑھتا تھا، بہت بڑے عالم تھے، چاہتے تو علمی کتابیں لکھ کر نام پیدا کر سکتے تھے، لیکن وہ عوام —— اور خواص —— دونوں تک پہنچنا چاہتے تھے، دونوں کو ابھارنا چاہتے تھے، لہٰذا قلم کا سارا زور تاریخی اور نیم تاریخی ناولوں کے لکھنے پر صرف کر دیا، کون شخص ہے، جو ان کی کتابیں —— مقدس نازنین یا پوپ ایگنس، ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا، فلورا فلورنڈا، فلپانا وغیرہ —— دیکھے اور اس کی رگوں میں ملی غیرت اور قومی حمیت کا خون نہ کھولنے لگے؟ عیسائیوں کی فریب کاریوں اور فتنہ طرازیوں کا رمز آشنا نہ بن جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مولینا شررؔ نے اپنے بہترین ناولوں کے ذریعہ

فنی نقطۂ نگاہ سے ان پر خواہ کتنا ہی اعتراض کیا جائے۔ اور غور کیجیے تو وہ بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں۔ ملک اور قوم کی بڑی گراں بہا خدمتیں انجام دی ہیں۔

ایک ماہوار رسالہ "دلگداز" بھی مولانا کی ادارت میں نکلتا تھا، آخر میں جس کی اشاعت بہت بے ترتیب ہوگئی تھی۔ اس رسالہ میں خیالی، تاریخی افسانوی مضامین شائع ہوا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر سارا پرچہ خود مولانا کی قلمکاریوں کا رہون منت ہوا کرتا تھا۔

کئی مرتبہ جی چاہا کہ مولانا سے ملاقات کی جائے، لیکن کوئی تقریب ملاقات نہ پیدا ہوسکی۔ ایک مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب حیدرآباد سے لکھنؤ تشریف لائے اور مولانا شررؔ کے ہاں مقیم ہوئے، یہ خبر سن کر ندوہ کی انجمن الاصلاح کے ارباب کار نے طے کیا کہ مولوی صاحب کو دعوت دی جائے، اور انہوں نے اردو ٹائپ کو رواج دینے کا جو اقدام کیا ہے اُسے سراہا جائے، اور ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جائے۔

میں اور شاہ محمد زبیر اردوی زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا) سائیکل پر بیٹھے اور مولانا شررؔ کے ہاں مولوی صاحب کو دعوت دینے پہنچ گئے۔ مولانا جھوائی ٹولہ کے قریب، ایک محلہ کٹرہ بزن بیگ خاں میں رہتے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ان کے دولتکدہ پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، پوچھتے، ٹوہ لگاتے آخر پہنچ ہی گئے۔ ایک بیل کھایا ہوا، پختہ لیکن کہنہ مکان تھا۔ باہر کے کمرہ میں ایک بڑی سی میز رکھی تھی، اور اس کے سامنے کرسی پر مولانا بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم نے انہیں دعوت دی، مولانا نے فرمایا، لیکن مولوی عبدالحق تو حیدرآباد واپس جاچکے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا۔ لیکن اس کی خوشی ہوئی کہ مولانا سے ملاقات ہوگئی۔ مولانا بڑے لطف اور اخلاق سے پیش آئے۔ ندوہ کے حالات پر بڑی توجہ سے گفتگو کرتے رہے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں حضرت ریاضؔ سے نسبت رکھتا ہوں ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

ان کی شفقت دوچند ہوگئی، روئے سخن شاہ زبیر سے زیادہ میری طرف جس پر وہ بہت جلے اور واپسی پر ہم دونوں میں کافی نوک جھونک بھی ہوئی، وہ کب نہیں ہوتی تھی!

مولوی عبدالحق

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

۱۹۲۵ء میں حیدر آباد کے روزنامہ "پیام" اور بمبئی کے روزنامہ "خلافت" میں معرکۂ جہاد گرم تھا، قاضی عبدالغفار صاحب اپنے محسن اور ممدوح مولانا شوکت علی کے خلاف عامیانہ لب و لہجہ میں "سر راہے" گل افشانی گفتار کے جوہر دکھا رہے تھے اور میں خلافت میں آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور ناک کے بدلہ میں ناک، اور کان کے بدلہ میں کان ـــــ کے ارشاد قرآنی پہ عمل کر رہا تھا۔

ایک روز میں مولانا عرفان کے ساتھ مسٹر ڈ مشگر کے دولت کدہ پر گیا، وہاں میں نے دیکھا ایک صاحب، سن سفید داڑھی، عمر میں گاندھی جی کے برابر، لیکن اُن سے کیا ماشاءاللہ جوانوں سے زیادہ ٹانٹھے اور مضبوط، رونق افزا ہیں، اور بمبئی میں "اردو سروے" کے متعلق گفت و شنید میں مصروف ہیں، تعارف کی رسم ادا ہوئی تو معلوم ہوا، بابائے اُردو، مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو یہی ہیں، مدہم آواز میں گفتگو کرتے ہیں، لیکن نہایت ٹھہر ٹھہر کے اس طرح کہ ایک ایک لفظ دلنشیں ہوتا جائے، گفتگو شروع ہوئی، میرے ان مضامین کی ادبیت کی بہت داد دی، جو میں پیام کی خوردہ گیریوں کے جواب میں لکھے تھے، حالانکہ سیاسی عقائد کے اعتبار سے اس وقت تک مولوی صاحب شوکت صاحب سے مختلف الرائے تھے، مولوی صاحب حیدرآباد چلے گئے، لیکن ان کی یاد میرے دل میں باقی رہ گئی، ان کی بوڑھی لیکن نوجوان شخصیت میں ایک کشش تھی، جاذبیت تھی، وہ تھکنا نہیں جانتے کام کئے جاتے ہیں، اور دوسروں سے کام لینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔

اب انجمن کی مطبوعات تبصرہ کے لئے آنے لگیں اور اس طرح ایک محدود اور

مختصر پیمانہ پر خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔

مولوی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت، یہ ہے کہ وہ کسی پر شفقت کا اظہار تو کرتے نہیں، اور اگر کرتے ہیں تو اس میں ذہنی تحفظ MENTAL RESERVATION کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا، ان کی گفتگو، ان کے طرز عمل ان کی پالیسی ہر چیز میں ایک کھرا پن پایا جاتا ہے، کچھ عرصہ بعد میرا ارادہ ہوا کہ بمبئی میں "خلافت بک ڈپو" قائم کروں، جے جے ہسپتال پر ایک اچھی سی دکان بھی دیکھ لی، شوکت صاحب نے بھی منظوری دے دی، سوال سرمایہ کا تھا، وہ ناپید تھا، میں نے سوچا، چند بڑی بڑی اشاعت گاہوں سے کریڈٹ پر کتابیں منگواؤں، جب وہ فروخت ہو جائیں تو ان کی قیمت ادا کر دوں گا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا خط مولوی صاحب کو لکھا، فوراً جواب آیا "نہایت تلخ تجربے ہو چکے ہیں، لیکن آپ کی بات ٹال نہیں سکتا، مینیجر کو میں نے ہدایت کر دی ہے، کہ انجمن کی تمام مطبوعات کے تین تین نسخے آپ کو بھیج دیئے جائیں!" مولوی صاحب کی اس عالی حوصلگی نے مجھے حیران کر دیا، اس لئے کہ بعض ایسی جگہوں سے جہاں سے بہت زیادہ توقعات تھے، اتنا زیادہ حوصلہ افزا جواب نہیں تھا، اگرچہ مولوی صاحب کی اس عنایت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا، کیونکہ بعض مشکلات ایسی پیش آئیں کہ بک ڈپو کے قیام کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

خلافت سے علیحدگی کے بعد میں نے مولوی صاحب کو خط لکھا کہ میں اقتصادی پریشانیوں میں مبتلا ہوں، میں چاہتا ہوں، آپ مجھے کچھ کام دیں، اس عریضہ پر فوراً توجہ فرمائی، اور عرب کی مشہور کتاب "اغانی" کے اردو ترجمہ کا کام سپرد کر دیا، جس کی پہلی جلد کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے، دوسری جلد کا ترجمہ زیر تکمیل ہے۔

بڑے آدمیوں کے اردگرد کچھ ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو ان کی شایان شان نہیں ہوتے، یہ صورت مولوی صاحب کے ساتھ بھی تھی، سالہ ۱۹۴۱ء میں ایک کام سے میں دہلی گیا، میں نے سوچا، مولوی صاحب سے بھی مل لوں، انجمن کے دفتر میں پہنچا اور ان کے پیش کار سے اطلاع دینے کو کہا، اس نے واپس آکر جواب دیا، مولوی صاحب نہیں ہیں! میں ابھی دفتر میں بیٹھا تھا کہ مولوی صاحب آگئے، پوچھنے لگے کیسے آئے، اس وقت ایک صاحب آئے، یہ حیدرآباد کے کوئی بہت بڑے آدمی تھے، میں نے دیکھا ان صاحب کی پیشوائی کیلئے

مولوی صاحب بہ نفسِ نفیس موجود ہیں، میں مولوی صاحب کو دیکھ رہا تھا، لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے، میں واپس چلا گیا، اور دوسرے روز دلی سے بمبئی روانہ ہوتے وقت میں نے مولوی صاحب کو ایک خط لکھا، کہ "میں آپ سے ملنے آیا، مجھے آپ کے پیش کار نے بتایا، کہ آپ نہیں ہیں، اتنے میں حیدرآباد کے ایک جاگیردار تشریف لائے، میری آنکھوں نے آپ کو اُن کی پیشوائی کرتے دیکھا، میں آپ کو بڑا آدمی ہمیشہ سے سمجھتا تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن ؎

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

فوراً جواب دیا، "میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو میری عدم موجودگی کی غلط اطلاع دی گئی، میں بیحد مصروف تھا، میں نے پیشکار کو ہدایت کردی تھی، کہ مجھے شام تک نہ چھیڑا جائے لیکن میرا مطلب یہ نہیں تھا، کہ آپ جیسے لوگ آئیں ٹال دیئے جائیں۔ میں نے پیشکار کو معطل کردیا ہے، اور اب وہ میری پیشکاری میں نہیں رہے گا، کوئی دوسرا کام اُسے دیا جائے گا، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں!" اس صفائی اور معذرت کے بعد میں واقعی مولوی صاحب کو "بہت بڑا آدمی" سمجھنے لگا۔

۱۹۴۲ء میں پھر میرا دلی جانا ہوا، مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی، بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، عمارت فنڈ کے لئے فراہمی سرمایہ کی مشکلات کا ذکر فرماتے تھے، ایک راجہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ وعدے کئی مرتبہ کرچکے ہیں لیکن ایفائے وعدہ نہیں کرتے، میں نے کہا "اس طبقہ کو ٹریننگ یہی دی جاتی ہے"۔ بہت محظوظ ہوئے، ایک تنومند قہقہہ لگایا، پھر حقہ کے کش سے جی بہلانے لگے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت

اودھ کی تہذیب و تمدن کا علمدار اور مرثیہ خواں

اُردو زبان کے بدقسمت انشاپردازوں کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کا نام نامی سرفہرست ہوگا، فن شاعری کے اسرار و رموز کے وہ ماہر تھے، عروض اور قافیہ، بحر اور ردیف، وزن اور تقطیع کی گہرائیوں پر ان کی استادانہ نظر تھی، وہ شاعر بہت اچھے نہیں تھے، لیکن شعر کے اسرار و رموز خوب سمجھتے تھے، اور ان کے اس کمال فن کو ان کے معاصرین بھی تسلیم کرتے تھے، شاعری اور اس کے متعلقات پر انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں، اور وہ کافی مقبول بھی ہوئیں۔

ہندوستان کے ملوک و سلاطین میں شاہان اودھ اپنی آن بان اور شان کے اعتبار سے ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، وہ ایک مخصوص تہذیب کے خالق اور علمبردار تھے، انہوں نے زندہ رہنے کا ایک نہایت دلکش اصول ایجاد کیا تھا، اور جب تک زندہ رہے اس دلکشی کے ساتھ کہ

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے
آوے ہے یہی جی میں، یہیں عمر بسر کر

شاہان بغداد، اور سلاطین عباسیہ کے بعد اگر ایک خاص شان کی خاص وقار اور خاص انداز کے ساتھ کسی شاہی خاندان نے زندگی بسر کی ہے تو وہ شاہان اودھ کا خاندان تھا، خود ان کی زندگی بجائے خود ایک طلسم ہوشربا تھی، لیکن جن دوسروں کی زندگی، ان کے دامن سے وابستہ ہوجاتی تھی، وہ بھی ایک ناقابل فراموش بوستان خیال بن جاتی تھی ان بادشاہوں نے اپنی زندگی میں جنت کے مزے لوٹے، اور آج بھی ان کی داستانیں پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ حور و غلمان قطار اندر قطار سامنے کھڑے ہیں اور داد عیش دے رہے ہیں،

لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے والے یہ تھے، زندگی کو فکرِ فردا سے بے نیاز، اور نشۂ حال میں مست رکھنے والے یہ تھے، ان کی ایک نگاہِ کرم، کنگالوں کو شاہ کج کلاہ بنا دیتی تھی، ان کی ایک نگاہِ گرم سرداروں اور سرفرازوں کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا کرتی تھی،

جب یہ مٹے تو ان کے ساتھ ان کی تاریخ وحکایت بھی مٹ گئی ان کے نقش ونگار بھی ماند پڑ گئے، ان کی یادگاریں بھی حرفِ غلط کی طرح مٹنے لگیں ان کی چلتی پھرتی زندگی کے نقوش بھی مرورِ ایام کے گرد وغبار میں دب گئے مگر قدرت خواجہ عبدالرؤف عشرت کو نہ پیدا کر دیتی تو شاید اودھ کی رنگین ودلفریب داستانیں اور حکایتیں بھی نذرِ تغافل ہو جاتیں۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت یوں تو شاعر بھی تھے، اور شاعر گر بھی، انشاپرداز بھی تھے، اور ادیب بھی، کتب فروش بھی تھے، اور تاجر بھی، لیکن ان کی یہ سب حیثیتیں ضمنی تھیں، وہ دراصل اودھ کی مٹی ہوئی سلطنت کے نوحہ خواں تھے، شاہان اودھ کے جاہ وجلال، دبدبہ وسطوت، تدبر وفراست، سخاوت اور عالی حوصلگی کے مرثیہ گو تھے، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چن چن کر اپنے پڑھنے والوں کے سامنے عہدِ ماضی کی وہ داستانیں بیان کرتے تھے، جن کو سن کر رونگٹے بھی کھڑے ہوتے تھے اور دل بھی دھڑکتا تھا، لب تبسم سے بھی آشنا ہوتے تھے، اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی بھی لگ جاتی تھی، وہ ہنساتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے زندگی کی اُمنگ بھی پیدا کرتے تھے، اور موت کی سوگواری بھی، وہ مطرب بھی تھے اور ذاکر بھی۔

تاریخ وتراجم کے صفحات کھنگال ڈالے، بڑھے بوڑھوں اور بڑی بوڑھیوں کی زبان سے اُنھوں نے جو کچھ سُنا محفوظ کر لیا، کرید کرید کر وہ پرانے لوگوں سے "شاہی" زمانہ کی داستانیں سُنا کرتے تھے، اس ذخیرہ سے اُنھوں نے ایسا مواد فراہم کیا، جزئیات کو ایسی تفصیل سے بیان کیا کہ آج ان کے موقلم کی گلکاری نے ایک نہایت دیدہ زیب اور نظر فروز، بلکہ "جنت نگاہ" تصویر شاہان اودھ کی تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دی ہے۔

آدمی غریب تھے، لکھنؤ کے چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی، وہی ذریعہ معاش تھی لیکن یہ وہ دکان تھی، جو مولانا شبلی مرحوم جیسے بلند پایہ مورخ، ریاض خیرآبادی جیسے یگانہ روزگار شاعر، عبدالحلیم شرر جیسے مورخ اور ناول نگار، نثار حسین مدیر پیام یار جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی نشست گاہ تھی شام کو یہ اور ان جیسے دوسرے اصحاب خواجہ صاحب کی دکان پر ضرور پہنچتے تھے اور وہاں کی دلچسپی، اور رنگین بزم آرائی میں پورا پورا حصہ لیتے تھے۔

میں ان سے اپنے بچپن میں آج سے ۲۰ ـــ ۲۵ سال پہلے ملا تھا، آغا لطیف حسن وسیم خیرآبادی کے ساتھ مدرسہ فرقانیہ میں داخل ہونے کے لئے لکھنؤ آیا لکڑہ ابوتراب خاں میں عارضی قیام ہوا دوسرے روز وسیم صاحب اپنے صاحبزادہ جناب اثیم کے ساتھ خواجہ عبدالرؤف عشرت سے ملنے گئے میں بھی ہمزاد کی طرح اُن کے ساتھ تھا۔ خواجہ صاحب احاطہ خانساماں میں رہتے تھے۔ بڑے تپاک اور اخلاق سے ملے اس وقت بھی خاصے بوڑھے ہو چکے تھے، میلے کپڑے، دوہرا بدن، کمر ذرا خمیدہ، خشخشی ڈاڑھی، مونچھ بھویں سب سفید، آواز باریک، ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، اور سامنے دو تین نظام المشائخ اور بہت سے اخبارات و رسائل کا ڈھیر لگا ہوا تھا، پاس ہی مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ اُن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔

اس واقعہ کے بعد پھر کبھی خواجہ صاحب سے ملاقات نہ ہوئی تھی، لیکن ایک نقش بیٹھ گیا دل پر جو آج تک قائم ہے۔

سنہ ۳۶ء میں بمبئی سے میں نے روزنامہ خلافت کا ایک ہفتہ وار مصور ایڈیشن نکالا، جن اہل قلم اصحاب کو اس میں لکھنے کی تکلیف دی گئی ان میں خواجہ صاحب بھی تھے، فوراً خط کا شفقت آمیز جواب دیا، اور ایک مضمون بھی بھیجا، میرے خیال میں یہ ان کا آخری مضمون تھا، اس مضمون میں اُنہوں نے لکھا تھا، میری عمر ۸۰ سے تجاوز کر چکی ہے، ہاتھ مرتعش ہو چکے ہیں، دماغ جواب دے رہا ہے۔ اب چل چلاؤ کا وقت ہے، اور واقعی ایسا ہی ہوا، کچھ عرصہ بعد وہ اس دنیا سے سدھار گئے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

قاضی عبدالغفار

ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں!

ندوہ کے تعزیرات میں، غیر درسی کتابوں کا پڑھنا جرم تھا، لیکن میں اس جرم سے اپنا دامن کبھی نہ بچا سکا۔ جس روز درجہ اوّل میں داخل ہوا غالباً اسی روز سے میزان منشعب کے ساتھ انجمن الاصلاح کی لائبریری کے اخبارات رسالے اور کتابیں بھی زیر مطالعہ رہنے لگیں۔ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا مجھے اتنا شوق تھا کہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، لیکن میں ان پر ایک نظر ضرور ڈال جاتا تھا۔ نیاز صاحب کا رسالہ نگار ابھی ابھی نکلا تھا، میں جس دلچسپی اور انہماک کے ساتھ دارالاشاعت لاہور کا "پھول" پڑھتا تھا، اسی ذوق و شوق سے مولوی عبدالرزاق کی البرامکہ اور نیاز صاحب کا نگار اور علامہ شبلی کی سیرۃ النبی بھی پڑھتا تھا۔ لائبریرین اگر اس ضد پر کتاب دینے سے انکار کرتا تھا کہ یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی تو میں اس سے لڑ جاتا تھا، اور اسی وقت ٹلتا تھا جب کتاب نکلوا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ نظر "نقش فرنگ" پر پڑی، یہ کتاب دارالاشاعت لاہور سے شائع کی تھی، اس کے مصنف، قاضی عبدالغفار تھے، لائبریرین کی جھنجھلاہٹ کے باوجود یہ کتاب بھی میں لے آیا، اپنے کمرہ میں لا کر اسے پڑھنے بیٹھا، تو صفحے کے صفحے پڑھ گیا، لیکن سمجھ میں خاک نہ آیا، میری عمر اور "مبلغ علم" کے اعتبار سے یہ کتاب بہت بلند تھی، لیکن نہ سمجھنے کے باوجود میں اسے تمام و کمال پڑھ گیا۔

آگے چل کر کچھ سال بعد جب اردو کا ذوق ذرا زیادہ گہرا ہوا، تو قاضی صاحب کی ادبی شہرت اور عظمت سے میں صحیح طور پر واقف ہو سکا۔ میں نے ایک بار پھر "نقش فرنگ" کا مطالعہ کیا، اور لکھنے والے کی سنجیدہ شوخی، اور شوخ سنجیدگی نے مجھے بہت متاثر کیا، یہ تو کتاب ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب علی برادران کے دامن دولت سے وابستہ رہ چکے ہیں، ہمدرد کے سب ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اور مولانا محمد علی کی نظر بندی اور ہمدرد کے التوائے اشاعت کے بعد خود اپنا

اخبار جمہور نکال چکے ہیں، اور ادبی و سیاسی حلقوں سے خراج تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں، بعد میں یہ بھی معلوم ہوا، کہ قاضی صاحب کی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں جتنا حصہ علی برادران نے لیا تھا، اس سے کچھ زیادہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے لیا تھا۔ اور ان کی پبلک شخصیت تمام تر اقانیم ثلثہ کی رہین منت تھی۔

قید فرنگ سے رہائی کے بعد مولانا محمد علی نے اپنے یگانہ روزگار اخبار ہمدرد کا پھر اجرا کیا۔ اب ان کی مدد کے لئے قاضی صاحب نہ تھے، دوسرے رفقا تھے قاضی صاحب یورپ میں تجارت فرما رہے تھے، پھر بھی دیرینہ تعلق کا رشتہ وہ اس طرح قائم رکھے ہوئے تھے کہ ہر ہفتہ وہاں سے ایک سیاسی مکتوب ہمدرد کے وقائع نگار خصوصی کی حیثیت سے بھیجتے رہتے تھے جو "مکتوب فرنگ" کے عنوان سے شائع ہوتا رہتا تھا، اس مکتوب میں ادب عالیہ، طنز لطیف اور حسین و جمیل شوخی کا ایسا دلچسپ امتزاج ہوتا تھا، کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

غرض قاضی صاحب کی لٹریری عظمت میرے دل میں ہر روز بڑھتی ہی رہی۔

بظاہر اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ قاضی صاحب کی ذات والاصفات کے مطالعہ کا شرف بھی ذرا نزدیک سے حاصل ہو سکے گا، لیکن غیر متوقع طور پر یہ سعادت بھی حاصل ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے نکل کر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہو گیا، جامعہ کے ایک ہوسٹل "گلشن منزل" میں قیام ہوا، نئی فضا اور نیا ماحول تھا، لیکن طبیعت جلد ہی مانوس ہو گئی، چند روز بعد معلوم ہوا کہ قاضی صاحب بھی یہیں قرول باغ میں مقیم ہیں، ہندوستانی دواخانہ کی طرف سے ایک شاندار کوٹھی تصرف میں ہے اور "ماحضر" کا سلسلہ بھی جاری ہے، اور قاضی صاحب نہایت ٹھاٹھ سے اپنے دوست اور محسن اجمل خان کی سوانح عمری لکھنے میں مصروف ہیں۔

جامعہ کے ایک دوسرے ہوسٹل "بشیر منزل" میں ایک بار قوالی ہوئی، رات کی چاندنی میں کھلی چھت پر یہ محفل جمی، اس میں اساتذہ بھی تھے، اور کچھ طلبہ بھی، اساتذہ کی صف میں شیخ الجامعہ کے پاس ایک نئے صاحب تشریف رکھتے تھے، لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ، ریشم کی قمیض، آنکھوں پر عینک، داڑھی منڈھی ہوئی تو نہیں، لیکن باریک اتنی کہ جلد سے ملی ہوئی۔ یہ صاحب بڑے ذوق شوق سے مجلس کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے، معلوم ہوا قاضی عبدالغفار صاحب یہی ہیں۔

کچھ روز بعد شیخ الجامعہ کی وساطت سے میرے رفیق درس عبدالسلام صاحب قدوائی کو اور مجھے عربی خطوط کا ایک بہت بڑا پلندا ملا، جو خط شکست میں لکھے ہوئے تھے، معلوم ہوا، قاضی صاحب چاہتے ہیں کہ ان کا ترجمہ کر دیا جائے، خطوط ممالک عربیہ کے سربرآوردہ اصحاب نے وقتاً فوقتاً مسیح الملک کو لکھے تھے، ان کی سوانح عمری میں ان خطوط کے مواد سے کام لیا جائے گا، میں اور عبدالسلام صاحب دونوں اس وقت نازک ترین مالی مشکلات کے دور سے گزر رہے تھے، اور جامعہ میں یہ عام اصول تھا کہ طلبہ سے بھی اگر کوئی غیر متعلق کام فاضل وقت میں لیا جاتا تھا، تو فوراً اس کا معاوضہ ادا کر دیا جاتا تھا، کوئی وجہ نہ تھی، کہ ہم اس کام سے امیدیں قائم نہ کرتے، چنانچہ دن رات ایک کر کے، گویا کوہ کنی کر کے جُوئے شیر نکالنے میں کامیاب ہوتے، اس کارنامہ کی کافی داد شکریہ کی صورت میں ہمیں ملی، اور بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری محنت کا یہی معاوضہ تھا، ہم بھی دل ہی دل میں شکریہ ادا کر کے خاموش رہے۔

قاضی صاحب نے ایک دوسری کتاب کا سلسلہ شروع فرمایا۔ جسے بعد میں آثار جمال الدین افغانی کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا، اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں قاضی صاحب کو العروۃ الوثقیٰ کے بعض مقالات کے تراجم کی ضرورت تھی، کچھ اور عربی لٹریچر بھی تھا، جس کے ترجمہ سے وہ مستفید ہونا چاہتے تھے، پھر انہوں نے شیخ الجامعہ صاحب کو وسیلہ بنایا، اور انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا، میں نے یہ ترجمہ پہلی فرصت میں مکمل کر کے قاضی صاحب کی خدمت میں پہنچا دیا، چند روز بعد جامعہ کی اردو اکادمی کے توسیعی لیکچروں کے سلسلہ میں انہوں نے جمال الدین افغانی پر ایک مقالہ پڑھا، اس مقالہ میں، اور بعد میں، میں نے دیکھا آثار جمال الدین میں بھی العروۃ الوثقیٰ اور دوسرے عربی لٹریچر کے میرے ترجمہ سے قاضی صاحب نے کافی فائدہ اٹھایا تھا، لیکن اس مرتبہ بے تکلفی میں انہوں نے شکریہ بھی نہیں ادا فرمایا۔

مسیح الملک کی سوانح عمری لکھنے کے بعد ہندوستانی دواخانہ کے ارباب انتظام نے حکیم جمیل خاں سکریٹری کے حسب ایما طبیہ کالج کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا۔

اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد قاضی صاحب نے حکیم اجمل خاں، اور حکیم جمیل خاں کے تعلقات ومراسم اور دادودستد کا جواب یہ دیا، کہ کالج کی ایک عظیم الشان اسٹرائک کے موجب بنے، اور کوشش فرمائی کہ کالج بند ہو جاتے۔ صرف یہی نہیں، اخبار "کمیشن" بھی نکالا، اسی اثنا میں بحق "خود" اجمل خاں اعظم" کی سوانح عمری بھی ضبط فرمالی، اور جواب تک "برف خانہ"

میں رکھی ہوئی ہے، اور طبیہ کالج والے اپنے نصیبوں کو رو رہے ہیں، کہ ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے باوجود اجمل خاں کی سوانح عمری نہ شائع کر سکے۔

بعد ازیں جب میں "خلافت" کا ایڈیٹر ہوا، تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کی یہ خوے دیرینہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور بزرگوں کے کانٹے چبھویا کرتے ہیں چنانچہ "خلافت" میں بیسیوں ان کے درجنوں خطوط "شوکت بھیا" کے نام دیکھے (شاید کچھ میرے پاس محفوظ بھی ہوں!) جس میں گزشتہ مہربانیوں کی یاد اور آئندہ کے لیے حسن طلب کا حسین و جمیل پہلو موجود تھا۔ قاضی صاحب بمبئی آئے۔ خلافت کی خدمت کرنے اور شوکت بھیا کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے بیقرار تھے، لیکن بدقسمتی سے بیقراری کی "یہ آگ" دو طرفہ نہیں تھی یعنی شوکت بھیا نے قاضی صاحب کی خدمات قبول کرنے میں کچھ زیادہ بیقراری نہیں دکھائی نتیجہ یہ ہوا کہ لبد میں جب قاضی صاحب حیدرآباد پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اپنا اخبار "پیام" نکالا تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ "شوکت بھیا" کی قیادت اور حشمت کی دھجیاں فضا میں بزعم خود اڑا دیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی، یہ تھی کہ پہاڑ سے ٹکرانے والوں کا سر پھوٹتا ہے، لیکن پہاڑ میں جنبش بھی نہیں ہوئی، اب ایک عرصہ سے قاضی صاحب کی توجہ ڈاکٹر ضیاءالحق پر مبذول ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب بے چارے دل ہی دل میں کڑھ رہے ہوں گے۔

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد؟

نورالحسن نیر

"ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی"

مشہور لغت گر محسن کاکوروی کے فرزند تھے، وکیل تھے، لیکن وکالت سے کچھ دلچسپی نہیں رکھتے تھے، شاعر بھی تھے، لیکن شاعری سے بھی کچھ زیادہ سروکار نہ تھا اردو کے بہت بڑے محقق تھے، اور ایک ایسا کارنامہ "نوراللغات" لکھ کر انجام دے گئے جسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی، بلکہ ممنونیت کے ساتھ یاد رکھے گی، نوراللغات اردو کا واحد لغت ہے، جو مکمل ہے، ورنہ اس سے پہلے اردو لغت لکھنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی، امیر مینائی نے امیراللغات شروع کیا لیکن ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھے، کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ لکھا، لیکن وہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔ بس یہی ایک لغت ہے، جو بہمہ وجوہ مکمل ہے۔

میں ان کے نام اور کام سے عہد طفلی سے واقف ہوں، نوراللغات کی ترتیب و تسوید کے زمانہ میں انہیں جو اشکال پیش آتا تھا، ان کے حل کے لیے یہ حضرت قبلہ ریاض سے رجوع کرتے تھے، اس سلسلہ میں اکثر ریاض صاحب ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ لیکن دیکھنے کا اتفاق اس وقت ہوا، جب سید سلیمان ندوی وفد حجاز کے صدر بن کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور یہ ان کی جگہ ندوہ کے معتمد تعلیمات عارضی طور پر مقرر ہوئے۔

اپنے فرائض بڑے انہماک اور مستعدی اور سرگرمی سے انجام دیتے تھے، لکھنؤ برابر آتے رہتے تھے، اور ندوہ کے تعلیمی اُمور کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کرتے رہتے تھے ندوہ جب آتے تھے تو عام کرسیوں پر بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے تھے، تاک کر ایسے وقت دفتر پہنچتے تھے جب مہتمم صاحب (مولانا حفیظ اللہ مرحوم) دفتر میں نہ ہوں، اور آتے ہی ان کی کرسی پر بیٹھ جاتے تھے، اور فوراً مشورہ اور ہدایت کے لیے مہتمم صاحب کو بلواتے تھے مہتمم صاحب آنے کے بعد خواہ کھڑے رہیں یا کسی اور کرسی پر بیٹھ جائیں، انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، یہ بڑے اطمینان سے کرسی اہتمام پر متمکن رہتے تھے۔ قد بہت چھوٹا تھا "ایک مشت دو انگشت" سے کچھ زیادہ، مہتمم صاحب کی بڑی کرسی پر بیٹھتے تھے، تو پاؤں

زمین پر نہیں ٹیک پاتے تھے، اور سر کرسی کے حدود اربعہ سے باہر نہیں نکل پاتا تھا، خود اعتمادی کا یہ عالم تھا، کہ اسباق کی تقسیم خود کرتے تھے، کون استاد کیا پڑھائے، اس کا فیصلہ مہتمم نہیں کرے گا، خود کریں گے، اسی طرح مہتمم کی کرسی پر بیٹھ کر نہایت اطمینان سے ٹائم ٹیبل بناتے تھے، کیا اس احتیاط اور چھان بین سے ریلوے کا ٹائم ٹیبل بنایا جاتا ہوگا، جس طرح یہ دیدہ کاری کرکے اس کار اہم کو انجام دیتے تھے۔

سالانہ امتحان کی تیاریاں ہو رہی تھیں، انہوں نے پرچوں کی ترتیب اس طرح رکھی تھی، جو طلبہ کے لئے تکلیف دہ تھی، میں نے اور نجم الدین صاحب شکیب نے طے کیا کہ کاکوری جا کر اپنا کیس پیش کریں، چنانچہ ہم لوگ کاکوری پہنچے، یہ اس وقت اپنی کوٹھی میں بیٹھے ہوئے مقدمات کا فیصلہ کر رہے تھے، کاکوری کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے، گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، بھوک بھی لگ رہی تھی، اور پیاس بھی، کرسی عدالت سے اٹھ کر ذرا باہر آئے، کھڑے کھڑے فیصلہ سنایا، اور برآمدہ میں جاکر پھر مقدمات کے تصفیہ میں مصروف ہو گئے، ارادہ یہ تھا، کہ اگر موقع ہوا تو رات بھی کاکوری میں گزاریں گے، لیکن تواضع کا یہ رنگ دیکھ کر الٹے پاؤں واپس ہوئے، بڑی مشکل سے چلتی ہوئی ٹرین میں سوار ہوئے، اور لکھنؤ پہنچے، بعد میں معلوم ہوا۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

یہ موصوف کی عادت تھی، کہ وہ محکوموں کو زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

سید صاحب حجاز سے واپس آ گئے، لیکن قائم مقام معتمد تعلیمات صاحب نہ آج چارج دیتے ہیں نہ کل، اور ادھر: یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

سید صاحب کی طرف سے کوئی تقاضا نہیں تھا، لیکن ان کے مداحوں اور دوستوں کو فکر تھی کہ چارج سید صاحب کو ملے اور جلد ملے، اسی کشمکش میں کئی مہینے گزر گئے آخر بڑی مشکلوں سے یہ مسئلہ حل ہوا، اور تاج اعتماد پھر سید صاحب کے سر پر رکھا گیا، ایک صاحب نے اس مصرع سے تاریخ وداع نکالنے کی ناکام کوشش کی۔

ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی!

نیازؔ فتحپوری

ایک ادیب، ایک انشا پرداز، ایک انسان!

نگار کا سال اشاعت، اور میرا ندوہ کے درجہ اوّل میں داخلہ ایک ہی سال کی بات ہے میں میزان منشعب پڑھتا تھا، لیکن نہ سمجھنے کے باوجود نگار ضرور پڑھتا تھا، اس لئے کہ گھر پر نیاز صاحب کی ادبیت اور انشا پردازی کے چرچے حضرت ریاضؔ اور برادر بزرگ عقیل احمد صاحب جعفری سے سنتا رہتا تھا، نقاد (مرحوم) کے فائلوں میں بھی نیاز صاحب کے افسانے اور تراجم کے دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ندوہ آنے کے بعد جیسے جیسے تعلیمی مدارج بڑھتے رہے، ویسے ویسے ادب اردو کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ اس اثنا میں میں نیاز صاحب کے کئی افسانے پڑھ چکا تھا "شاعر کا انجام"، "کیوپڈ سائکی"، اور سب سے آخر میں "شہاب کی سرگزشت"، یہ سب افسانے اپنی زبان و انشا کے لحاظ سے اپنے بیان و اثر کے اعتبار سے، اپنی دلآویزی اور کیف آفرینی کی حیثیت سے، نہ صرف نیاز صاحب کے شاہکار تھے، بلکہ انہوں نے ادب اردو کا ذوق پیدا کرنے میں میری کافی مدد کی۔

۱۹۲۶ء میں وصل بلگرامی نے لکھنؤ میں ایک پریس قائم کیا، اور اپنا ماہوار رسالہ مرقع نکالا اس پریس میں نگار بھی بھوپال سے چھپنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

مرقع کے دفتر میں حضرت ریاضؔ اکثر تشریف لایا کرتے تھے، وہ جب آتے تھے میں بھی ان سے ملنے جایا کرتا تھا، ایک روز میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، وصل صاحب کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا، اور وہ سوامی شردھانند کے قتل کی تفصیل ریاض صاحب کو سنا رہے تھے، اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے، دراز قد سرج کی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی، داڑھی منڈھی ہوئی، ان کے آتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے، ریاض صاحب اور وصل صاحب نے ان سے معانقہ کیا، دوسروں نے مصافحہ پر اکتفا کیا، اور وہ آکر بیٹھ گئے، یہی نیازؔ صاحب تھے، میں نے نقاد اور نگار میں نیاز

صاحب کی تصویر دیکھی تھی، لیکن اس میں ایک خوبصورت داڑھی بھی چہرہ کی زینت تھی اب وہ غائب تھی، اس لئے میں پہچان نہ سکا، ورنہ جس کی تصویر دیکھ لوں، اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوتی۔

کچھ عرصہ بعد نیاز صاحب مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے، اور جس عمارت میں مرقع کا دفتر تھا اسی کے ایک دوسرے وسیع اور کشادہ حصہ میں رہنے لگے، اب میں ندوہ کے پانچویں درجہ میں پڑھ رہا تھا۔ اور نیاز صاحب کو اور ان کے لٹریچر کو سمجھنے لگا تھا۔ اشتیاق پیدا ہوا، کہ ان سے ملوں، پھر یہ معلوم کر کے اشتیاق اور بڑھا، کہ نیاز صاحب ندوی ہیں، ہم ندوہ کے طالب علموں کو ندویوں سے ملنے کی بڑی چاٹ تھی، آخر ایک روز میں، عبدالسلام قدوائی اور حامد علی، نیاز صاحب کے ہاں پہنچ ہی گئے۔ بڑے اخلاق و تپاک اور ندویت کی یگانگت کے ساتھ ملے۔ ندوہ کے حالات دریافت کرتے رہے۔ میں ندوہ کے قلمی رسالہ الاصلاح کا ایڈیٹر تھا، یہ معلوم کر کے انہوں نے نگار میں بھی لکھنے کی دعوت دی، اور میں دل میں بہت خوش ہوا، کہ نگار میں بھی مضمون لکھ سکتا ہوں۔

کچھ عرصہ بعد نیاز صاحب نے مذہب پر گولہ باری شروع کی، اور ان کے خلاف ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی، میں نے ان کے ایک مضمون کے جواب میں ایک چھوٹا سا مضمون مؤطا امام مالک کے حوالے سے لکھا، اس مضمون کو "استفسار و جواب" کے عنوان کے ماتحت نیاز صاحب نے شائع کیا۔ میں نے پھر اس کا ایک جواب لکھا، اُسے بھی نیاز صاحب نے نگار میں اپنے جواب کے ساتھ شائع کیا، یہ مضامین عام طور پر پسند کئے گئے۔ مولانا سید سلیمان صاحب لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، انہوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔

پھر اسٹرائک کے سلسلہ میں ندوہ سے "ممنوع الدخال" ہونے کے بعد میں جامعہ ملیہ میں چلا گیا۔ سنہ [illegible]ء کی سرگرمیوں میں مولانا حیدر حسن سے بخاری کی تکمیل کے لئے لکھنؤ آیا، اس زمانہ میں ایک مضمون نگار میں "قربانی" کے خلاف نکلا، یہ مضمون نیاز صاحب کا نہیں تھا، ایک دوسرے صاحب کا تھا، لیکن نہایت فتنہ انگیز اور گمراہ کن، میں نے اس کا مفصل جواب لکھا، اور لے کر خود نیاز صاحب کے پاس گیا، لیکن نیاز صاحب نے "مصلحتہً" اس کی اشاعت سے انکار کر دیا میں نے یہ مضمون مولانا عبدالماجد صاحب کو بھیج دیا، اور وہ بتدریج کئی اشاعتوں میں شائع ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد نیاز صاحب کے خلاف مستقل شورش شروع ہو گئی، اور لکھنؤ میں زبردست احتجاجی جلسے ہوئے، میں بھی اتفاقاً لکھنؤ میں تھا، اور ان ہنگاموں میں حصہ لے رہا تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی، اور مولانا سید سلیمان ندوی ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے، مجھے

یاد ہے، نواب حسن علی خان کی کوٹھی پر، سید صاحب کو مصالحت کی دعوت دینے کے لیے مسٹر نورالرحمن تشریف لائے تھے، لیکن ان کی کوششیں رائگاں گئیں، اور یہ تحریک اس وقت دبی، جب نیاز صاحب غیر مشروط طور پر سپر انداز ہو گئے، اور انہوں نے اپنی روش پر معذرت کا اظہار کر لیا۔

پھر ایک عرصۂ دراز تک نیاز صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ جامعہ کا دور طالب علمی ختم ہوا، اور میں خلافت کا ایڈیٹر ہو کر بمبئی آگیا ۱۹۳۰ء میں میں نے سہ روزہ خلافت کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن نکالا، جو بہت مقبول ہوا۔ نگار سے بھی تبادلہ شروع ہو گیا۔ نیاز صاحب کے ایک مضمون پر پھر میں نے ایک سخت جوابی مضمون خلافت میں لکھا۔ یہ مضمون ارشد تھانوی صاحب کو بہت پسند آیا، انہوں نے ایک داد تحسین کا خط مجھے لکھا، اور تحریر کیا، نیاز صاحب سے ملاقات ہوگی، تو انہیں بھی آپ کے طنزیات لطیف کی داد دینے پر مجبور کروں گا۔

کئی سال گزر گئے، میں خلافت سے الگ ہو گیا، اور دوسرے کاموں میں لگ گیا، انگریزی دواؤں کے ایک آفس میں پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے میں نے نگار کے منیجر کو ایک خط ریٹ وغیرہ کے بارے میں لکھا، رسمی جواب آیا، پھر اپنے نام سے ایک خط لکھا، اب جو جواب آیا، اس میں لکھا تھا، نیاز صاحب کا حکم ہے، جعفری صاحب جس ریٹ پر اور جن شرائط پر اشتہار دیں، قبول کر لیا جائے، اس خط سے اندازہ ہوا، نیاز صاحب اپنے مخالفوں کو بھی یاد رکھتے ہیں، اور حسن سلوک سے ان کا دل موہ سکتے ہیں۔

پھر نیاز صاحب کا ایک خط آیا، ایک لیڈر امرد "مومن"، بن کر ان کا ایک بہترین ڈرامہ اڑا لے گیا تھا، اور واپس نہیں کر رہا تھا، نیاز صاحب نے لکھا تھا اس سے جس طرح ہو ڈرامہ واپس لے لیا جائے، میں نے کوشش کی، خود میں بھی دھوکا کھا گیا۔

ایک مرتبہ میں لکھنؤ پہنچا تو نیاز صاحب سے بھی جا کر ملا، کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی لیکن وہی شفقت و بزرگی کا برتاؤ، جس سے میں بارہا اپنے زمانہ طالب علمی میں لطف اندوز ہو چکا تھا میں بہت کچھ بدل چکا تھا، لیکن وہ ظاہر میں تو بدل گئے تھے، لیکن باطن ان کا اب بھی اتنا ہی شفاف اور پاکیزہ تھا، جتنا پہلے اور جس کا اندازہ مجھے بہت دیر میں ہوا، پاس ہی ان کے ایک دوست بیٹھے ہوتے تھے، ان سے میرا تعارف کرانے کے بعد کہنے لگے، یہ بڑے پرجوش نوجوان ہیں، میرے خلاف جو تحریک لکھنؤ میں اٹھی تھی، اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا انہوں نے، لیکن یہ مجھے جب بھی عزیز تھے۔ اب بھی عزیز ہیں، اور ہمیشہ عزیز رہیں گے!

اقبال

تاثرات و مشاہدات!

میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا ایک طالب علم تھا، جامعہ کے اساتذہ میں نذیر نیازی صاحب کو اقبال سے خصوصیت تھی، انہوں نے ایک حلقہ "اقبال" قائم کر رکھا تھا، اس حلقہ میں، اس مرد حق آگاہ کے کلام و بیان کی تشریح و تفسیر ہوتی تھی، اس کے خیالات و حیات کو اجاگر کیا جاتا تھا اس کی فکر آسمان پیما، اور اس کے پیغام حیات آفریں پر بحثیں ہوتی تھیں، اس کے مشکل اور دقیق اشعار کی "مشکل کشائی" ہوتی تھی، اس کے انداز بیان اور اسلوب کلام پر نقد و تبصرہ ہوتا تھا، ہم لوگ سامع کی حیثیت سے بیٹھتے تھے، اور نیازی صاحب بلبل ہزار داستان کی طرح اپنی خوش بیانی اور معنی آفرینی سے ایک سماں پیدا کر دیتے تھے۔ میں اس حلقہ میں باقاعدہ شریک نہیں ہوتا تھا کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ لیکن اقبال کی جو عظمت میرے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس کبھی کبھی شریک حلقہ ہونے سے اور بڑھ گئی، واقعہ یہ ہے کہ نیازی صاحب کا اقبالیات پہ نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا، اور چونکہ اکثر و بیشتر انہیں خود بھی اقبال سے براہ راست مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے اس لیے اس مسئلہ پر وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے۔

۳۲ء میں اقبال کسی کام سے دہلی آئے، ارباب جامعہ نے طے کیا کہ انہیں ایک پارٹی دی جائے، اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ اس موقع پر تعلیمی مرکز نمبر ۱ کا ہال سجایا گیا، اس کے اندرونی صحن میں پارٹی کے انتظامات ہوئے، ساتھ ہی ساتھ مکتبہ جامعہ کے مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی۔

سہ پہر کو علامہ تشریف لائے، سب سے پہلے اساتذہ اور سر برآوردہ حاضرین کا موصوف سے تعارف کرایا گیا، میں انجمن اتحاد (یونین) کا نائب صدر تھا، میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ حضرت علامہ مطبوعات جامعہ کی نمائش کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے، ان کی نظر "سیرت محمد علی" پر پڑی، یہ میری

پہلی تصنیف تھی اسے میں نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ترتیب دیا تھا اور ابھی شائع ہوئی تھی، اب علامہ سے میرا مزید تعارف ہوا "سیرت محمد علی" کے مصنف بھی یہی ہیں!

حضرت علامہ رک گئے، کتاب اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے گئے نہایت شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، فرمایا "بہت سے واقعات ہیں محمد علی کے بارے میں ایسے بتا سکتا ہوں، جو صرف مجھی کو معلوم ہیں، ان سے بھی فائدہ اٹھا لیتے" میں نے کہا ضرور فائدہ اٹھاؤں گا، میں تو ایسے نادر معلومات کا جویا ہوں، بات ختم ہوئی، علامہ آگے بڑھے اور حلقہ اساتذہ میں جا کر بیٹھ گئے، میں طالب علموں کے ساتھ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا نگاہ عقیدت سے ان کا نظارہ کر رہا تھا، اس وقت مجھے ان کی وہ نظم یاد آ رہی تھی جو سنہ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے "محمد علی، شوکت علی" کی طویل نظر بندی اور سزایابی سے رہائی کے موقع پر کہی تھی۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند	قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے	مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر	کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

جس شاعر اعظم نے محمد علی کی عظمت کا ان بلند الفاظ میں اعتراف کیا، اس کے نادر معلومات یقیناً محمد علی سے متعلق خاص طور پر قابل اخذ و استفادہ ہوں گے، یہ سوچتے سوچتے مجھے اقبال کی وہ نظم یاد آ گئی، جو اس نے "دریوزۂ خلافت" کے نام سے کہی تھی، یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی، جب محمد علی "وفد خلافت" لے کر یورپ گئے تھے۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے	تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا	خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے	مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چناں عار ناید!
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

کتنا خود دار ہے یہ شخص!

یہ وہ زمانہ تھا کہ "مسلم کانفرنس" مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی، عوام کو تو کچھ اس سے

بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، لیکن خواص...... سر، خان بہادر، جاگیردار، دولت مند ...... اس محور کے گرد گردش کر رہے تھے۔ مسلم کانفرنس مسلم سیاست پر اسی طرح اثر انداز تھی، جس طرح آجکل مسلم لیگ نظر آ رہی ہے۔

سر آغا خان اس کے پہلے صدر تھے، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں اور اس نہج کے دوسرے ارباب ہمم اس کے خاص الخاص کارکنوں میں تھے اب اس کی صدارت پر اقبال فائز تھے۔ یہ صدارت اقبال کے لیے باعثِ اعزاز نہیں تھی البتہ مرحوم مسلم کانفرنس کی روح تا ابد اس پر نازاں رہے گی، کہ اس کی صدارت کی کرسی پر مشرق کا سب سے بڑا شاعر حیات متمکن ہو چکا ہے۔

اسی مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا، اقبال لاہور سے دہلی آئے۔ اب کی مرتبہ دہلی میں مولوی محمد شفیع داؤدی ایم اے ایل ایل بی کی قیام گاہ پر مقیم ہوئے شام کو میں محمد علی ہوسٹل سے کسی کام سے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی، موصوف نئی دہلی اقبال سے ملنے تشریف لیے جا رہے تھے، از راہ کرم گستری مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا، ہم لوگ نئی دہلی پہنچے شفیع داؤدی صاحب کی قیام گاہ پر اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے، مسلم لیگ کے لیڈر مسلم کانفرنس کے رہنما خلافت کے پرانے کارکن مرکزی اسمبلی کے ممبر اور بعض وہ لوگ بھی موجود تھے جو برطانوی ہند کی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، مثلاً مسٹر شعیب قریشی۔

علامہ اپنے کمرے میں تشریف لائے، کسی سے معانقہ، کسی سے مصافحہ، کسی سے آنکھوں میں پیام سلام ہوا، سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، اور باتیں شروع ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد علامہ نے ڈاکٹر عابد حسین کی طرف رجوع کیا، اور گفتگو شروع ہو گئی۔ گفتگو کا موضوع سیاسی نہیں تھا، علمی اور تاریخی تھا، باتوں باتوں میں ہر قسم کے مباحث چھڑ جاتے تھے۔ پھر کبھی انگریزی میں بات کرتے رہتے، کبھی اردو میں۔ تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اس عرصہ میں نہ معلوم کتنے مباحث پر گفتگو ہوئی، لیکن ہر بحث پر اتنی جامع و مانع، اتنی مکمل اتنی سیر حاصل اور اتنی شگفتہ گفتگو ہوئی کہ میں تو علامہ کی حاضر دماغی، برجستہ گوئی، وسعت علم اور بلندی فکر پر عش عش کر گیا۔ اقبال کی شاعری، ان کی فلسفہ دانی ان کی قابلیت ان میں سے ہر چیز اصول موضوعہ کی طرح اپنی جگہ پر مسلم تھی، لیکن یہ آج اندازہ ہوا کہ نجی صحبتوں میں بھی اقبال کی شخصیت کتنی دلآویز، کتنی پرکشش اور کتنی سحر طراز تھی؟

اس مجمع میں بڑے بڑے اہل علم و دانش موجود تھے، بڑے بڑے مفکر اور سیاسی موجود

تھے، بڑے بڑے نکتہ رس اور ہمہ داں موجود تھے، بڑے بڑے دانا و بینا اور ارباب بینش موجود تھے، لیکن اقبال کے علم، ان کی ہمہ دانی، ان کی معرفت اور ان کے داب دانش کے سامنے طفل مکتب معلوم ہو رہے تھے، مجھے "کتاب الاغانی" کا واقعہ یاد آ گیا، جب عہد ہارون الرشید کے مشہور مغنی ابراہیم موصلی نے اپنے بیٹے اسحٰق کو اس عہد کے کامل فن ماہر غنا ابن جامع سے ملایا تھا ابن جامع نے باپ بیٹے کی فرمائش سے مجبور ہو کر اپنے راگ سنائے، مجلس ختم ہوئی اور یہ دونوں واپس آ گئے، راستہ میں ابراہیم نے اسحٰق سے پوچھا "کیوں بیٹا ابن جامع کو کیسا پایا؟" اسحٰق نے کہا، "آپ سے بڑھ کر راگ راگنی کے فن میں کسی کو بھی میں نہیں سمجھتا تھا، لیکن ابن جامع کو سننے کے بعد آپ کچھ نہیں رہے۔"

یہی حال میرا تھا، اس مجمع میں متعدد اصحاب ایسے تھے، جن کے علم و فضل، مہارت و قابلیت ذہانت و ذکاوت کا میرے دل پر سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں سب "طفل کم سواد" نظر آ رہے تھے اور اقبال ایک یگانہ شخصیت کی طرح جلوہ آرا تھا جو سب پر چھایا ہوا تھا، سب جس کے سامنے گردن جھکائے ہوئے تھے۔

۱۹۲۴ء میں عالم اسلام کی مایۂ ناز شخصیت غازی رؤف پاشا کو ڈاکٹر انصاری مرحوم، امیر (چانسلر) جامعہ نے دہلی آ کر توسیعی خطبات دینے کی دعوت دی، رؤف پاشا نے یہ دعوت بمسرت منظور کر لی، اور ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے انہوں نے مشرف فرمایا۔

رؤف پاشا خلافت عثمانیہ کے دور میں ایک ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے حمیدیہ جہاز کے سلسلہ میں انہوں نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے ان سے ایک دنیا واقف ہے، خلیفۃ المسلمین کی حکومت کے امیر البحر تھے، پھر انقلاب کے بعد یہ ترکی میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا اور ان سے اختلاف ہوا، نتیجہ یہ ہوا، کہ یہ ترکی چھوڑ کر ایک جلا وطن کی طرح پیرس میں رہنے لگے،

قبل اس کے کہ رؤف پاشا ہندوستان پہنچیں، ان کا نام نامی ہندوستان پہنچ چکا تھا، مسلمان تو مسلمان ہندوستان کے غیر مسلم بھی ان کی شخصیت میں غیر معمولی جذب و کشش محسوس کر رہے تھے جامعہ میں ان کے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا، تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی، کئی روز تک خطبات کا سلسلہ جاری رہا، ہر روز صدارت کے فرائض اسلامی ہند کی کوئی مقتدر شخصیت انجام دیتی تھی۔

ایک جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی، جلسہ رات کو تھا، علامہ صبح فرنٹیئر میل سے تشریف لے آئے، جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھی، اس مرتبہ علامہ نے غالباً پروفیسر محمد مجیب صاحب کی کوٹھی (قرول باغ) پر قیام فرمایا۔

جلسہ کا وقت آگیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تعالی پھینکیے تو سری سر جائے ایک تو رؤف پاشا کی دلربا شخصیت، دوسرے اقبال کی صدارت سونے پر سہاگہ آج ہجوم اور زیادہ تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین مدظلہ (شیخ الجامعہ) نے ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ اور زبردست تقریر میں پہلے اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا تعارف کرایا، پھر صدارت کیلئے ان کا نام پیش کیا۔

توقع تھی کہ اقبال اردو میں تقریر کریں گے۔ لیکن انہوں نے شاید مجمع کی مناسبت سے انگریزی ہی کی تقریر کے لئے پسند کیا، بڑی معرکہ آرا تقریر کی علامہ نے اس مجمع میں۔

ابھی کچھ عرصہ پیشتر علامہ سفر یورپ سے واپس آئے تھے، تیسری گول میز کانفرنس میں وہ مندوب کی حیثیت سے حکومت ہند کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعد علامہ نے اپنی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری کی، یعنی اسپین کی سیاحت۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی تھی، بادشاہت کی تھی، اور وہ بھی اس جاہ و جلال کے ساتھ کہ دیار فرنگ ان کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

اب اسپین میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو چکا ہے، ان کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی ہے لیکن اب بھی وہاں کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کے ثقافت کے نشانات موجود ہیں، اب بھی وہاں قصر الحمرا کے کھنڈر، مسجد زہرہ کے باقیات الصالحات، اور عہد اسلامی کی تعمیرات کے آثار موجود ہیں۔

اقبال ابھی ابھی اس سفر سے واپس آئے تھے، تاثرات تازہ تھے، اور وہ اشعار کی صورت اختیار کر رہے تھے، ان کی نظم "ہسپانیہ" ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی، لیکن محرمان ناز اور خلوتیان حرم کی معرفت ایک آدھ شعر خلوت سے جلوت میں آچکا تھا۔

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے	مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں	خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں	خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی | باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں | مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن | تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی | ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

اب اقبال کی شاعری پھر اردو کا جامہ حریر پہن رہی تھی۔

بہرحال اقبال نے تقریر شروع کی، سارا مجمع گوش بر آواز تھا۔

اس تقریر میں انھوں نے فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کیا، اور فرمایا، جب میں نے اُسے "لاتسبوا الدہر وانا الدہر" یعنی خدا کہتا ہے زمانہ کو بُرا نہ کہو، میں خود زمانہ ہوں، سنایا تو وہ اسلام کے اس فلسفہ پر بھونچکا رہ گیا۔

اسی تقریر میں انھوں نے اپنے چند تازہ اشعار بھی سنائے، لیکن اس لحن اور طرز میں نہیں، جس کی گونج انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اکثر و بیشتر سنی جاتی تھی بلکہ تحت اللفظ، لیکن اس تحت اللفظ میں بھی جو اثر جو کیف، جو جادو تھا، اُسے سننے والے اب تک نہیں بھولے ہیں، نہ شاید کبھی بھول سکیں۔

قبل اس کے کہ وہ اشعار درج کیے جائیں، ان کا پس منظر بھی اگر پیش کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اسپین پر ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں نے حکومت کی، اس دوران میں وہ وہاں اجنبی نہیں رہے بلکہ گھل مل گئے، عیسائی خاندانوں سے انھوں نے رشتۂ ازدواج بھی قائم کیا، پھر وہ دور آیا کہ مسلمانوں کی نااتفاقی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے ان کا شیرازہ بکھر گیا، اور وہ اندلسی حکومت جس کی طرف یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتی تھیں، اور جس کی عظمت، ہیبت، دبدبہ سطوت اور جلال کا یہ عالم تھا کہ سارا فرنگستان اس سے بید لرزاں کی طرح کانپتا تھا، اسپین پر ٹوٹ پڑا، اور اسلامی حکومت ختم ہوگئی، صرف یہی نہیں ہوا کہ اسلامی حکومت ختم ہوگئی، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان بھی وہاں سے نکال دیے گئے، یہ الجزائر، ٹیونس رلیف وغیرہ کے عربوں کا جو نام آپ سنتے ہیں، یہ زیادہ تر وہی ہے۔ خاندان ہیں جو اسپین سے ہجرت کر کے یا جلاوطن کر کے یہاں بھیجے گئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

لیکن کچھ خاندان ایسے بھی تھے، جو اسپین ہی میں رہ گئے اور وہاں کے نئے ماحول سے اتنے

متاثر اور مرعوب ہوئے کہ انہوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا۔

عربی زبان کے ایک مشہور انشا پرداز نے ایک مختصر لیکن بلند پایہ کتاب "اندلس کا ماضی اور حال" کے عنوان سے لکھی تھی، اس کتاب میں بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس کتاب میں یہ انکشاف بھی ہے کہ قدیم عرب خاندان جو بعد میں عیسائی ہوتے تھے، آج بھی اسپین میں موجود ہیں، اور اب بھی وہاں عیش و نشاط کی زندگی بسر کر رہے ہیں، دولت و امارات ان کے گھر کی لونڈی ہے وہ لارڈ ہیں۔ نواب ہیں، جاگیر دار ہیں، زمیندار ہیں، دولت مند ہیں، اور وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی پر اثر رکھتے ہیں، انہیں اس پر فخر ہے، کہ ان کی رگوں میں عرب خون دوڑ رہا ہے، بعض خاندان تو ایسے ہیں جو اپنے "صدیقی" اور "فاروقی" ہونے پر نازاں ہیں۔

شاعر مشرق جب اندلس پہنچا تو صرف ایک عام زائر اور سیاح کی حیثیت سے اس نے کوچہ گردی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہ نظر غائر وہاں کے لوگوں کا۔ ان کے رہنے سہنے کا۔ ان کے انداز کا، ان کے اصول اور ضابطہ کا مطالعہ کیا، اسکی آنکھوں نے بھی وہی دیکھا، اور پایا، جس کی طرف کچھ عرصہ پیشتر ایک عرب مصنف اور انشا پرداز اپنی ایک مایۂ ناز تصنیف میں اشارہ کر چکا تھا، اور اپنے تاثرات کو ایسے الفاظ میں قلمبند کیا کہ پڑھنے والے ہمیشہ پڑھیں گے اور روئیں گے۔ سننے والے سنیں گے اور سر دھنیں گے۔

اقبال نے اس جلسہ میں جو اشعار سنائے، وہ ایک طویل نظم "مسجد قرطبہ" کا ایک حصہ تھے یہ وہ مسجد ہے، جو آج بھی موجود ہے، اور اپنی گزشتہ عظمت کا فسانہ زبانِ درد سے سنا رہی ہے وہ اشعار جو اقبال نے اس مجمع میں سنائے، یہ ہیں:۔

کعبۂ ارباب فن۔ سطوت دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل "خلق عظیم"۔ صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں!
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنیٔ شورش اصلاح دیں!
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہد کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

یہ اشعار اقبال نے ترنم سے نہیں پڑھے تھے، بلکہ تحت اللفظ انہیں پڑھا تھا، پھر

بھی تاثر کا یہ عالم تھا، کہ مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا، کان علی دود وسہم الطیور۔

مجھے اقبال سے ملاقات یا اخباری زبان میں "انٹرویو" کی سعادت نہیں حاصل ہوئی، البتہ مجھے ان کے نظارہ کا دو ایک مرتبہ موقع ملا، یہ تاثرات و نقوش اسی اجمال کی تفسیر ہیں!

اختر شیرانی

"عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں"

بہت بڑے باپ کے بیٹے ہیں، اور خود بہت بڑے شاعر ہیں، ان کے والد ماجد پروفیسر محمود شیرانی کے علم و فضل کے سامنے فضلائے روزگار سرنگوں ہیں ان کی مست اور البیلی شاعری نے اہل دنیا کو متوالا بنا رکھا ہے، خود بھی متوالے ہیں، خواہ پیئے ہوئے ہوں یا بغیر پیئے ہوئے۔

ایک زمانہ تھا، کہ نوجوان اختر کی شاعری، فضائے ہند میں ایک تہلکہ مچائے ہوئے تھی، کالج کے لڑکے ان کے اشعار پڑھتے تھے، اور رندوں کی طرح جھومنے لگتے تھے۔ کالج کی لڑکیاں ان کے اشعار پڑھتی تھیں اور نسیم بہار کی طرح خود اٹکھیلیوں پر مائل ہو جاتی تھیں، ان کی یاد زرکار ساریوں کے دامن سے بندھی رہتی تھی اور دھڑکتے ہوئے دلوں کو اور زیادہ دھڑکا دیتی تھی، ان کی مشہور نظم

اے عشق کہیں لے چل!

جب نگار میں شائع ہوئی، تو جس نوجوان نے پڑھا، وہ اسی کو گنگنانے لگا، اپنے وقت میں اختر عاشقوں اور دل گرفتوں کا امام تھا، لوگ اس کے اشعار سے فال دیکھا کرتے تھے، پھر کرچہ محبوب کی طرف رخ کرتے تھے،

اختر پہلا شاعر ہے، جس نے معشوق کے سبزۂ خط کو چھوڑ کر کاکل مشکیں کی طرف توجہ کی، جس نے آدم کے بیٹوں سے منہ موڑ کر حوّا کی بیٹیوں کو مرکز نگاہ بنایا، اختر کی سلمیٰ حقیقی ہو، یا "ضرورت شعری"، کی پیداوار، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں، وہ پھلی پھولی، اور اس رنگ شاعری نے یکسر شاعری کی فضا بدل دی۔

اختر شیرانی نثر بھی لکھتے ہیں مضامین و مقالات بھی، افسانے اور قصے بھی۔ نثر میں بھی وہ اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، لیکن شاعری کی بات ہی اور ہے۔ ان کی شاعری دل کی شاعری

ہے، وہ دل جو کبھی امراء القیس کے سینہ میں دھڑکا کرتا تھا، جس نے حافظ کے سینہ کو اپنا نشیمن بنایا تھا، اور یہ دل شراب کی ایک سربند بوتل کے سوا کچھ نہیں ہے، وہی مستی، وہی ترنگ، وہی اُمنگ، وہی جوش .....

مجھے ان سے دو تین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ہر مرتبہ میں ایک نیا نقش لے کر اٹھا ہوں، ان کے پاس سے، اس اپنایت، بے تکلفی، خلوص اور محبت سے ملتے ہیں، معلوم ہوتا ہے، برسوں کی ملاقات ہے، مدت کی شناسائی ہے۔

جنگ کے دوران میں طاہر خاں صاحب نے ایک "جنگی مشاعرہ" کیا، اس مشاعرہ میں اختر بھی شریک ہوئے، یہ شاہجہاں محل ہوٹل میں ٹھہرے، میں ایک دوست سے ملنے وہاں پہنچا، ان کے کمرہ کے بعد ان کا کمرہ تھا، میں نے انہیں دیکھا، اور یہ سوچ کر آگے بڑھ گیا، انہیں کیا یاد میں کون ہوں؟ فوراً پیچھے پیچھے آئے، ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرہ میں لے گئے، اور بڑی دیر تک بٹھلائے رکھا، اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

اختر اب بھی جوان ہیں، ان کی شاعری بھی جوان ہے، لیکن وہ خود بڑھاپے کی طرف لپک رہے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان کی شاعری کا رس ختم ہو گیا ہے، وہ تو اب بھی باقی ہے، اور ہمیشہ باقی رہے گا، دل وہی ہے، جذبات وہی ہیں، زور کلام، اور دل آویزئ بیان وہی ہے، لیکن گراں باریوں نے حالت بدل دی ہے، یہ وہ شاعر تھا، جو اپنی شاعری کی آگ سے، ہر دل کی انگیٹھی گرم کر سکتا تھا، لیکن اس کی شاعری حوادث کی نظر ہو کر رہ گئی ہے، اور یہ آگ سے برف بن گیا ہے، لیکن اس برف کے نیچے شعلے دہک رہے ہیں۔ کیا جانے کب برف پگھل جائے ان شعلوں سے اور شعلے پھر خرمن سوز بن جائیں۔

بہزاد لکھنوی

اقلیمِ معانی کا بہترین صورت گر

ہندوستان کے غزل گو شعرا کی صفِ اوّل میں شریک ہیں۔ بہت خوب کہتے ہیں اور بہت خوب پڑھتے ہیں، خود بھی بہت خوب ہیں، چھوٹی بحریں خوبصورت اور سبک الفاظ دل میں اُتر جانے والا لہجہ، یہ سب چیزیں مل کر بہزاد کی شاعری بن جاتی ہیں، لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، خلق و تواضع ان کی فطرت ہے، جس سے ملتے ہیں سراپا اخلاق و محبت بن کر، ان میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اپنے تئیں بڑا نہیں سمجھتے، اور اس سے بھی بڑا وصف یہ ہے کہ دوسروں کو چھوٹا نہیں سمجھتے، خوبصورت بھی ہیں، خوب سیرت بھی، یہ دونوں خوبیاں بیک وقت شاعروں اور ادیبوں میں کم جمع ہوتی ہیں، لیکن ان میں ہیں۔

مشاعروں کے بازار میں ان کی مانگ بہت زیادہ ہے، ہندوستان کے جن مشاعروں میں جی چاہتا ہے شریک ہو جاتے ہیں، لیکن چند خاص شرائط کے ساتھ مثلاً لکھنؤ سے بمبئی جانا ہو، یا کلکتہ سے پشاور جانا ہو، یا کراچی جائیں گے، لیکن ریل پر نہیں، موٹر پر، کسی قیمت پر ریل کا سفر نہیں کر سکتے، ہر قسم کی صعوبت جھیل لیں گے لیکن دور دراز سفر کی مسافت موٹر ہی سے طے کریں گے، قدر دان بھی ان کے اتنے متوالے ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں مان لیتے ہیں، جب بھی بلائیں گے، موٹر کا بندوبست کر دیں گے۔

بمبئی کے عالیشان، اور یادگار مشاعروں میں کئی مرتبہ بلائے گئے مگر نہ آسکے لیکن اپریل ۱۹۴۶ء کے یومِ اقبال کی کشش انہیں کھینچ لائی، مشاعرہ شروع ہوا، آنکھیں انہیں ڈھونڈنے لگیں، اسٹیج پر بھانت بھانت کے شعرائے کرام جلوس فرما تھے، ان میں کوئی مرغ زریں نظر آرہا تھا، کوئی بلبل خوشنوا، زاغ و زغن کی بھی کمی نہیں تھی، لیکن اس ہجوم میں اقلیم معانی کا وہ بہزاد نہیں تھا، جو اپنے موقلم کی جنبش سے الفاظ میں رنگ بھر کر جذبات و معنی کی آنکھوں

میں کھب جانے والی، اور دل میں بس جانے والی تصویر کھینچ دیتا ہے، منتظمین میں سے ایک صاحب ملے۔ دریافت کیا، بہزاد کہاں ہیں؟ فرمایا لکھنؤ سے موٹر پر چل چکے ہیں، لیکن ابھی تک نہ جانے کیوں نہیں پہنچے، تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے تشریف لائے، اور فرمایا، بہزاد صاحب آ گئے.. پوچھا، کہاں؟ فرمایا، وہ بیٹھے ہیں، اسٹیج کے ایک کونہ میں، قدیم لکھنؤ کے ایک صاحب داڑھی رکھے، اچکن پہنے نظر آئے، خیال ہوا یہی بہزاد صاحب ہیں! خود بخود غالب کا یہ شعر زبان پر آ گیا ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خوں، نہ نکلا!

تھوڑی دیر کے بعد، یہ شمع کے سامنے آئے ــــ آج کل مشاعروں میں شمع کا کام مائک سے لیا جاتا ہے ــــ اور انہوں نے اپنی ایک غزل چھیڑی اور مشاعرہ کی دنیا بدل دی، دلکش اور خوشگوار طرز تکلم، دلنشیں اور اثر انگیز اشعار، عوام اور خواص دونوں لطف لے رہے تھے، سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔

پھر کئی مشاعروں میں ان سے ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات، ربط باہمی میں اضافہ کا باعث ہوئی، باتیں بھی، بڑی دلچسپ اور معنی خیز کرتے ہیں، ایک مرتبہ، اپنے ایک معاصر کا ذکر کیا، فرمایا وہ ہر جگہ میری برائیاں کرتے تھے، میں ہر جگہ ان کا ذکر خیر کیا کرتا تھا، آخر وہ شرمندہ ہوئے اور آخر کار ایک روز انہوں نے اپنے پچھلے کارناموں پر معذرت کر ڈالی، میں نے کہا، معذرت کی کیا ضرورت ہے، آپ کی رائے میرے بارے میں بری تھی، آپ میری برائیاں کرتے تھے، میری رائے آپ کے بارے میں اچھی تھی، میں آپ کی اچھائیاں کرتا تھا، مجھے آپ سے شکوہ نہیں کرنا چاہیئے آپ کو میرا شکریہ نہیں ادا کرنا چاہیئے، یہ تو اپنی رائے ہے، اور اپنی رائے میں ہر شخص آزاد ہے!

جگر مراد آبادی

مست الست، منچلا اور البیلا شاعر

جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے سلسلہ میں ایک بزم مشاعرہ بھی ترتیب پاتی تھی اس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے چوٹی کے شعرا تشریف لاتے تھے، ۱۹۳۲ء کے مشاعرہ میں حضرت جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے۔ اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔

جگر ہندوستان کے محبوب اور سرمست شاعروں میں تھے۔ انکی غزلیں عام وخاص سب کی زبان پر تھیں، بچے انہیں گاتے تھے۔ جوان ان سے لطف لیتے تھے، بوڑھے ان میں اپنی زندگی کا جلوہ دیکھتے تھے، کالج کی لڑکیاں انہیں گنگناتی تھیں، اور بلند بام وبالانشیں خواتین ان کے کلام پر فدا تھیں، میں نے جگر کی غزلیں اخباروں اور رسالوں میں پڑھی تھیں، ان کے کلام پر بڑے بڑے نقادوں کا تبصرہ دیکھا تھا، لیکن اب تک انہیں نہ دیکھ سکا تھا، ان کا کلام ان کی زبان سے نہ سن سکا تھا، لیکن اس مرتبہ یہ موقع بھی مل گیا۔

اس زمانہ میں جگر صاحب شراب ـــــ شراب معرفت نہیں ـــــ بہت پیتے تھے، اور ہر وقت مست رہتے تھے، ان کی بادہ نوشی نے، ان کی سرمستی نے، ان کے والہانہ طرز کلام نے، ان کے بیخودانہ اور سرفروشانہ اندازِ تکلم نے، ان کی شاعری میں ایک نیا حسن پیدا کر دیا تھا، بہت سے لوگ ان کی شاعری سے زیادہ ان شاعرانہ اداؤں پر جان دیتے تھے، انہیں سرشاری اور سرمستی کی حالت میں اپنا کلام پڑھتے دیکھ لیں، یہی بہت تھا!

مشاعرہ کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، اتنے میں جگر صاحب تشریف لائے، پاؤں رکھتے کہیں تھے، پڑتا کہیں تھا، وہ مشاعرہ میں بھی اسی حالت میں آتے تھے، آتے نہیں تھے، دست بدست دگرے، پا بدست دگرے لائے جاتے تھے انہیں مشاعرہ میں شرکت کا شوق نہیں تھا، ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا سے بھی بے نیاز تھے

جسے ہزار دفعہ غرض ہو وہ ان کی ان ناقابل برداشت باتوں کو برداشت کرے، اور جس حالت میں ہوں اسی میں مشاعرہ تک لائے۔

وہ آئے، اسٹیج پر نمودار ہوئے، اور اپنی غزل سنانا شروع کر دی، جگر کو دیکھ کر مجھے عربی زبان کا زندہ جاوید ادیب جاحظ یاد آجاتا ہے، وہ بڑا بدصورت تھا، لیکن اس کی علمی اور ادبی کشش نے لوگوں کا دل موہ لیا تھا، اور وہ اس پر پروانہ وار جان دیتے تھے آج ہندوستان کا جاحظ میرے سامنے تھا، رنگ کالا اس پر کالی داڑھی، شراب کے نشہ میں مست، لیکن جب اس کے منہ سے شعر کی شراب ابلنے لگی، ترنم کا آبشار گرنے لگا تو جو اس کی یہ حالت دیکھ کر بیزار اور متنفر ہو گئے تھے، وہ بھی متوجہ ہوئے، قائل ہوئے، اور فریفتہ ہو گئے، آواز میں بلا کا رس اور غضب کا جادو اشعار میں قیامت کا زور اور شعلوں کی لپک، وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے دبا تا کہ کہیں سینہ توڑ کر باہر نہ نکل آئے، وہ ان کا جوش اور بیخودی کے عالم میں لہک لہک کے پڑھنا، وہ ان کی زبان، وہ ان کی معاملہ بندی وہ ان کا بیان، وہ ان کی دل سے نکلی ہوئی، دل سے نکلی ہوئی اور دل کو برمانے والی آہیں اور تانیں اور ان کی لغزش مستانہ، وہ ان کی جرأت رندانہ جو دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا، جگر صرف شاعر نہیں تھا عاشق بھی تھا، عاشق ناکام۔ اس کے اشعار میں سوز و گداز، اسکے انداز و اظہار میں بے چینی اور اضطراب اس کے لب و لہجہ میں درد اور ٹیس، اس کی آواز میں چبھن اور خلش اسی لئے تھی کہ وہ اشعار میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو نمایاں کر دیتا تھا۔

دوسرے روز ہم چند دوستوں نے جگر صاحب کی پرائیویٹ دعوت کی اس میں وہ کھل کھیلے موج میں تھے، سرگزشت دل بھی بیان کر ڈالی، اور داستان محبت بھی اور تاثرات حرماں بھی، آج وہ اتنے خوش تھے کہ وہ تین گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور شعر سناتے رہے اور ان کی شان نزول بیان کرتے رہے۔

اب جگر صاحب کا وہ دور ختم ہو چکا ہے، ایک مومن کی شان استقامت و حزمیت کے ساتھ، وہ شراب نوشی ترک کر چکے ہیں۔ اور یک لخت ترک کر دینے کے مہلک نتائج سے عہدہ برا بھی ہو رہے ہیں۔ وہ اب شراب نہیں پیتے۔ لیکن ان کے اشعار کا کیف اور ان کی آواز کا جادو اب بھی قائم ہے، فرق جو کچھ ہے وہ یہ کہ ان کے اشعار میں اب استادانہ پختگی اور فلسفیانہ ژرف نگاہی بھی آچکی ہے۔

جوش ملیح آبادی

”اے ریغاوہ رندِ شاہد باز!“

بہت بڑے شاعر ہیں، پہلے غزل کی شاعری کرتے تھے، پھر نظم کی طرف توجہ مبذول ہوئی، اب رباعیات پر مائل بہ کرم ہیں، اس سے وقت بچتا ہے، تو فلموں کے گیت لکھتے ہیں ان کا گیت

میرے جوبنا کا دیکھو اُبھار!

تو شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، جان صاحب اور رجب کا نام اگر زندہ ہے تو جوش کے فلمی گیتوں کے دم سے۔

ایک زاہد اور متقی شخص جس طرح شیطان سے بدکتا ہے، یہ اسی طرح خدا سے بدکتے ہیں، جتنی کو جتنی نفرت مودیوں سے تھی انہیں اتنی ہی نفرت مذہب سے ہے، لیکن مذہب اور خدا سے بیزاری کے باوجود امام حسین علیہ السلام کے قائل ہیں، انہوں نے حمد اور نعت میں کوئی شعر نہیں کہا ہے، لیکن سوز، سلام اور مرثیہ پر طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔

نازک دماغ بہت ہیں، مشاعرے میں سب سے پیچھے آتے ہیں اور سب سے پہلے جاتے ہیں لیکن آتے ضرور ہیں، جس طرح واعظ اور قوال وعظ اور قوالی سے پہلے اپنی شرح طے کر کے پیشگی وصول کر لیتے ہیں، اسی طرح یہ بھی شریکِ مشاعرہ ہونے سے پہلے اپنے مطالبات وصول کر لیتے ہیں، تشریف آوری کے شرائط میں منتظمین مشاعرہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں، جی نہیں ہوتے کہ مصارف آمد و رفت اور فیس کے علاوہ شراب کا خرچ بھی آپ کے ذمہ ہوگا، غنیمت ہے کہ شراب کے ساتھ ساقیِ گلفام کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ورنہ منتظمین کے لئے:

بلائے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ
کی دو گونہ مصیبت پیش آ جاتی

کہتے بہت خوب ہیں، پڑھتے بہت خوب ہیں، گانا نہیں جانتے، لیکن مجمع پر چھا جانے کا گر جانتے

ہاں مشاعرہ میں بڑی خوشامد درآمد اور منت سماجت کے بعد کم سے کم اشعار سُنا کر اسٹیج سے رخصت ہو جائیں گے، پرائیویٹ صحبتوں میں کبھی کبھی بے فرمائش بھی اپنی بیاض کھول کر بیٹھ جائیں گے اور گھنٹوں اپنی رباعیاں اور اپنے اشعار سُناتے رہیں گے۔ مجلس میں کم کھلتے ہیں، یاران بے صفا کے مجمع میں ایک کھلی ہوئی کتاب بن جاتے ہیں، جس کا جہاں سے جی چاہے پڑھ لے۔

بمبئی کے ایک مشاعرہ میں ایک دفعہ خلاف معمول انہیں بہت دیر تک بیٹھنا پڑا، یہ چاہتے تھے، اپنا کلام سنا کر رخصت ہوں، اور مشاغل شبینہ میں منہمک ہوں، لیکن مقامی شعراء کی نہ ختم ہونے والی تعداد اپنا کلام بلاغت نظام سنانے پر مصر تھی، سنتے سنتے اُکتا گئے، تو کچھ کہے بغیر اُٹھے، اور چل دیئے ایک صاحب ــ یکے از منتظمین مشاعرہ ـــــ نے پوچھا کیا، آپ کہاں تشریف لئے جارہے ہیں فرمایا زاغ و زغن کی کاؤں کاؤں سننے کی زیادہ تاب نہیں ہے، میں نہیں بیٹھ سکتا، آخر بڑی مشکلوں سے

لائے اس بُت کو التجا کر کے!

مقامی شعراء کا سلسلہ "سوز و ساز" بند کر کے انہیں موقع دیا گیا، اور یہ اپنے اشعار سُنا کر رخصت ہو گئے، ان کے جانے کے بعد پھر زاغ و زغن کی کاؤں کاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا، اور بڑی دیر تک جاری رہا، مگر یہ جا چکے تھے۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا
اس کی بلا سے بُوم بسے یا ہُما بسے

ملیح آباد کے رہنے والے ہیں، اوّل و آخر پٹھان ہیں، گورا رنگ، بلند و بالا قد، خوبصورت اور دلکش ناک نقشہ، متناسب اور تنومند اعضا، بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں، ماشاءاللہ جوانوں سے مضبوط اور تندرست، بہادر اتنے کہ موت کا مذاق اُڑاتے ہیں، بزدل اتنے کہ شراب پی پی کر موت کو دعوت دیتے ہیں۔ مداحوں اور قدر شناسوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں اس حلقہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان سے نفرت کرتے ہیں، ان کے اشعار سے محبت کرتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو ان کے اشعار سے نفرت کرتے ہیں لیکن ان سے محبت کرتے ہیں، یہ دونوں میں سے کسی کی پروا نہیں کرتے، اور یہ خود نہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں، نہ اپنے اشعار سے۔

حفیظ جالندھری

بڑے بڑے مجمعوں کو بہا لے جانیوالا طوفان

یادش بخیر جامعہ ملیہ کی تعلیمی زندگی کے دوران میں "یوم تاسیس" اپنی دلچسپیوں اور رنگا رنگیوں کے سبب یوم عید کی حیثیت رکھتا تھا، سال ۱۹۳۱ء کا یوم تاسیس تو اپنے امتیازات کے اعتبار سے جامع کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہ یوم تاسیس کئی سال کے التوا اور تعطل کے بعد منایا گیا تھا، لہذا اُسے کامیاب بنانے کے لئے اساتذہ طلبہ اور اسٹاف کے ممبران نے ایسے تعاون اور جذبہ اشتراک کا ثبوت دیا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

یوم تاسیس کا پروگرام خاصا طویل تھا، لیکن سب سے زیادہ دلچسپ پروگرام مشاعرہ کا تھا۔ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا اور انوکھا تھا۔ اب تک مشاعروں کا دستور یہ تھا کہ "طرح" پر ہوتے تھے، لیکن یہ مشاعرہ "بے طرح" تھا، ہر شاعر کو اجازت تھی کہ وہ اپنے کلام کا جو منتخب حصہ چاہے سنائے، اس جدت نے مشاعرہ کی دلچسپی تنوع اور لطف میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

کچھ جامعہ کی کشش، کچھ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا اثر، کچھ ڈاکٹر عابد حسین کی شخصیت بڑے بڑے شاعر اس مشاعرہ کی شرکت کیلئے تشریف لائے حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، صفی لکھنوی، سب ہی تھے، اور سب ہی کے قدردان اور عقیدت کیش اور مداح بھی موجود تھے۔

یوں تو ہر روز کے جلسہ میں کافی ہجوم و ازدحام رہتا تھا لیکن مشاعرہ کے دن تو خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ خاص طور پر کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد پہلے سے پہنچ گئی تھی، مشاعرہ پر جگر مرادآبادی چھائے ہوتے تھے ان کی بیخودی ان کا ترنم ان کی شاعرانہ صورت نے لوگوں کے دلوں پر جادو کر دیا تھا، ان کے بعد جو شاعر بھی آیا، اس کی مٹی پلید ہوئی، حسرت موہانی تک نہ چمک سکے۔ اصغر گونڈوی بڑے اچھے شاعر تھے، پڑھتے بھی اچھا تھے لیکن آواز بہت نحیف تھی وہ پڑھنے آئے تو یار لوگوں نے انہیں

چٹکیوں اور تالیوں پر اڑا لیا، اور مشکل سے ایک شعر پڑھ پائے ہوں گے، کہ "رخصت قہقہی" پر مجبور ہو گئے۔

اب حفیظ جالندھری کا نام پکارا گیا، اور فوراً ہی ایک صاحب اسٹیج پر آ کر کھڑے ہو گئے بالشت بھر کا قد، دُبلے اتنے کہ مولانا شوکت علی کی جیب میں سما جائیں، سر پر سر سے بڑی سیاہ بالوں کی ٹوپی، اس ہیئت کذائی میں انہیں دیکھتے ہی مجمع میں کے اہل نظر قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے لیکن اس دُبلے پتلے "منشت بھر" نے ان قہقہوں کو کوئی اہمیت نہیں دی، اور ایک مرتبہ جو گنگنا کے تان لگائی ہے تو سارا مجمع دم بخود مسکرانے والے بھی چپ تھے اور قہقہہ لگانے والے بھی، حالانکہ ہنسنے والوں کے لئے پہلے سے زیادہ اب ہنسنے کا موقع تھا کیونکہ شعر پڑھتے وقت ایک انداز خاص کے ساتھ ہونٹوں کا سکڑنا، منہ کا بنانا نتھنوں کا پھلانا اور ان اداؤں کے ساتھ ان میں اداکاری کی جھلک کافی خندہ آور تھی، لیکن حفیظ کی آواز میں جادو تھا، اور سب اس جادو سے مسحور تھے۔ غزل ختم ہوئی۔

غزل ختم ہوئی تو نظم کا مطالبہ ہوا، نظم ختم ہوئی تو مجمع سے "ہل من مزید" فلک شگاف صدا بلند ہوئی اس سر پھرے شاعر نے مجمع کی مناسبت یا کم از کم خواص کی افتاد مزاج کا اندازہ کئے بغیر اپنی تازہ ادھوری نظم "سر پھرا ملاح" سنانا شروع کر دی، نظم مولانا محمد علی مرحوم کے حادثہ وفات پر کہی گئی تھی "اس میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے دلوں میں چٹکیاں لی گئیں تھیں" بدقسمتی سے جامعہ کے چانسلر ڈاکٹر انصاری پہلی صف میں شاعر کے بالکل سامنے بیٹھے تھے اور شاعر جوشِ بیخودی میں جو اشارے کر رہا تھا، ان کی زد براہ راست ڈاکٹر انصاری پر پڑ رہی تھی اور وہ گم سم بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔

حفیظ کی اس جرأت رندانہ نے جہاں بہت سے دلوں میں ان کی اخلاقی جرأت کی قدر پیدا کر دی وہاں بہت سی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں ایسے موقعوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر ۱۹۴۶ء کے آغاز میں پنجاب مسلم ایسوسی ایشن نے یوم اقبال کے سلسلہ میں مشاعرہ کیا، اس مشاعرہ میں حفیظ صاحب بھی تشریف لائے، حفیظ وہی ہیں، ان کی اخلاقی جرأت اور بیباکی کچھ اور بڑھ گئی، ان کے کلام میں اب پختگی بھی آگئی ہے، لیکن ان کی وہ دل نشین اور سحر طراز آواز اب "بوڑھی" ہوتی جا رہی ہے، یہ عمر کا تقاضا ہے۔

ذوالفقار علی خاں گوہر

ایک ستر سال کا نوجوان!

مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی کے حقیقی برادر بزرگ، خدا کے فضل سے ان سطروں کے لکھتے وقت تک بقید حیات ہیں، تقریباً ۸۰ بہاریں اس دنیا کی دیکھ چکے ہیں، بڑے مضبوط عقیدہ اور کیریکٹر کے انسان ہیں۔

خلافت ویکلی میں "نفس مطمئن" کے عنوان سے میں نے افسانوں کا سلسلہ شروع کیا تھا یعنی ایک شخص قلب مطمئن کی تلاش میں نکلتا ہے، اور دنیا کے بازار میں گھومتا ہے وہ بالاخانوں پر بھی جاتا ہے، اور زنہ خانوں میں بھی پہنچتا ہے، عالم کے حلقۂ درس میں بھی بیٹھتا ہے اور صوفی کے حجرۂ ذکر میں بھی پہنچتا ہے، غرض قلب مطمئن کی تلاش میں وہ انسانی کردار کے ہر رنگ ہر رخ اور ہر زاویہ کا معائنہ اور مشاہدہ کرتا ہے۔

اس سلسلہ کے تین یا چار افسانے شائع ہو چکے تھے کہ ایک روز ڈاک دیکھنے کے بعد شوکت صاحب نے ایک انگریزی خط میری طرف بڑھا دیا، میں نے اسے پڑھا چند سطروں کے بعد دلچسپی بڑھ گئی، کیونکہ میرا ذکر تھا اور نفس مطمئن کے افسانوں کی نہایت بلند الفاظ میں تعریف کی گئی تھی، اور شوکت صاحب سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ مجھے تاکید کریں، افسانوں کا یہ سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے، دستخط دیکھے تو "ذوالفقار علی خان گوہر" اب میں سمجھا یہ ہیں علی برادران کے مشہور بھائی قادیانیت نے انہیں اور زیادہ مشہور کر رکھا تھا، عہد شباب میں انہوں نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا، اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد "نفس مطمئن" کے انعام میں گوہر صاحب کی غزلیں بھی خلافت میں اشاعت کے لئے آنے لگیں، اب میرے اور گوہر صاحب کے مراسم خط و کتابت باقاعدہ قائم ہو چکے تھے، غزلیں دیکھیں تو زبان و بیان، خیال اور بندش کے اعتبار سے بڑی بلند پایہ، قدیم طرز کی

شاعری کرتے ہیں، لیکن اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے، مجھے تو چسکہ پڑ گیا، اور میں تقاضے کر کر کے غزلیں منگانے اور خلافت میں شائع کرنے لگا۔

۱۹۳۰ء میں، غالباً مارچ کا مہینہ تھا ــــــــ میں دہلی گیا، ٹھہرا ایک دوست کے ہاں تھا لیکن وقت کا زیادہ حصہ شوکت صاحب کی کوٹھی پر قرول باغ میں صرف ہوتا تھا، آج شوکت صاحب نے فرمایا، چلو تمہیں اسمبلی دکھالائیں، موٹر آکر دروازہ پر کھڑی ہوگئی، اتنے میں ایک دبلے پتلے لیکن نہایت مضبوط اور تنومند صاحب تشریف لائے، شوکت صاحب نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا، حضرت گوہر یہی ہیں، بڑی خوشی ہوئی مل کر، اور تعجب بھی ہوا، تعجب اس بات پر کہ یہ شوکت صاحب کے بڑے بھائی تھے، عمر میں کئی سال بڑے تھے، لیکن بیس سال چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ شوکت صاحب پر بڑھاپا غالب تھا، اور یہ بڑھاپے کو دھکے دے کر پیچھے دھکیل رہے تھے، اور اسے اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے، مولانا محمد علی بھی دوہرے بدن کے آدمی تھے اور مولینا شوکت صاحب سے بھی دو چار قدم آگے ہوں گے لیکن ان کے برعکس وہ اکہرے بدن کے چھریرے آدمی نکلے، مولینا محمد علی نے شوکت صاحب پر ایک بار فقرہ کسا تھا،

کمر پتلی صراحی دار گردن

لیکن گوہر صاحب کے لئے یہ امر واقعہ تھا،

اب اسمبلی چلنے کا وقت آیا، شوکت صاحب آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھے، پیچھے کی نشست پر یہی، گوہر صاحب اور شوکت صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری حبیب احمد صاحب ندوی اور گوہر صاحب کے داماد باقی تھے، جگہ نہیں تھی، سوال پیدا ہوا یہ کہاں بیٹھیں، گوہر صاحب ذرا پیچھے ہٹے، اور دونوں کو اندر بلا یا، ایک کو ایک زانو پر، دوسرے کو دوسرے زانوں پر بٹھایا اور قرول باغ سے نئی دہلی تک بٹھائے رہے، بڑھاپے میں جوانی کا یہ نیرنگ دیکھ کر میں تو دنگ رہ گیا، ستر برس کی عمر میں صحت کا یہ عالم واقعی ایک معجزہ تھا، گاڑی رکی تو تنتے ہوئے سینے کے ساتھ اترے، نہ تھکن نہ تکان، چہرہ پر تبسم اور باتوں میں جوانوں کی سی شوخی اور زندہ دلی!

اس مختصر سی ملاقات میں حضرت گوہر سے علمی و ادبی مسائل پر گفتگو ہوئی، انہوں نے ہندی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، چونکہ ہندی شاعری میں جذبات کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔

اس لئے وہ بہت اثر انگیز ہوتی ہے، مثلاً اُنہوں نے فرمایا، ایک سپاہی جنگ پر جا رہا ہے، روانہ ہوتے وقت وہ اپنی عروس نو سے ملتا ہے، وقت کم ہے، اس لئے جلد از جلد وہ دلن بدرانہ ہو جانا چاہتا ہے، لیکن نئی نویلی دلہن چاہتی ہے کہ محبوب شوہر کچھ دیر اور بیٹھے سپاہی اُٹھتا ہے، دلہن اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتی ہے، وہ ہاتھ چھڑا کر روانہ ہو جاتا ہے، اس موقع پر وہ جذبات سے نڈھال ہو کہتی ہے ؎

ہاتھ چھڑا ئے جات ہو نرمل جان کے موئے
ہر دے سے جب جاؤ گے تب مرد گنوں گی توئے

گوہر صاحب نے یہ شعر پڑھ کر کہا، اور بالکل سچ کہا "مرد گنوں گی" میں جو زور اور آمد ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جاتا!

نوح ناروی

باکمال شاعر، مستند زبان داں

دہلی کا پھیرا تقریباً ہر سال ہوتا رہتا ہے، اور مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، ایک مرتبہ جناب مقرب حسین صاحب دہلوی، اور حکیم محمد تقی صاحب مدیران "مشہور" سے بھی شرف نیاز حاصل ہو گیا، مشہور ملک کا بلند پایہ رسالہ ہے کشش کچھ کم نہ تھی، لیکن مشہور کے دفتر میں پہنچکر معلوم ہوا کہ خود حکیم صاحب کی ذات گمنامی بھی سر تا سر پر کشش واقع ہوئی ہے، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد، وہ اصرار شروع ہوا جس سے میں بہت گھبراتا ہوں، یعنی دعوت کا، بلکہ آغاز تو یہاں سے ہوا تھا، کہ قیام دفتر مشہور میں کرو، لیکن صلح دعوت پر ہوئی۔

بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود!

وقت مقرر پر شام کو میں مشہور کے دفتر میں پہنچا، حکیم صاحب مع مقرب صاحب کے چشم براہ تھے، حکیم صاحب کا دولتکدہ دفتر سے تھوڑی دور پر واقع تھا اب وہاں پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد ماہر القادری صاحب بھی تشریف لائے چند دوسرے مقامی ارباب سخن بھی رونق بخش بزم تھے، مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، کہ حضرت نوح ناروی تشریف لائے۔

نوح صاحب کے دیکھنے کا شرف آج سے پہلے نہیں ہوا تھا، اگرچہ ان کے کلام بلاغت نظام کا ایک عرصہ سے لذت آشنا تھا، ندوہ کی سنہ ۳۰ء کی اسٹرائک میں حکیم مختار احمد ندوی نے لہرا لہرا کر ان کی غزل

ہم سے تو نہ دیکھی جائے گی پامالی مالی پھولوں کی

گائی تھی، تو وقت اور موقع کی مناسبت نے ایک سماں پیدا کر دیا تھا۔

دعوت کے بعد یہ محفل مجلس مشاعرہ بن گئی، ماہر صاحب، مقرب صاحب، کیف مرادآبادی صاحب اور دوسرے حضرات نے اپنا کلام سنایا، اور خوب خوب داد حاصل کی، پھر نوح صاحب کی باری

آئی، وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، دُبلے پتلے منحنی سے آدمی ہیں، لیکن آواز ماشاءاللہ ایسی کڑک دار پائی ہے، کہ مُردے سُن لیں تو زندہ ہو جائیں اُنھوں نے ایک نیا سماں پیدا کر دیا، الفاظ، محاوروں پر، زبان پر انہیں جو استادانہ قدرت ہے، آج اس کا نظارہ سامنے آ گیا۔

بیچ بیچ میں مشاعرہ ملتوی ہو جاتا تھا، اور بحث و گفتگو بھی شروع ہو جاتی تھی، نوح صاحب کو سائل دہلوی سے شرف تلمذ تھا، سائل صاحب داغ کے مستند جانشین تھے، لیکن یہ دعویٰ حضرت بیخود دہلوی کو بھی ہے، یہ قضیہ اب تک طے نہیں ہو پایا ہے، حالانکہ ایک بڑے فریق حضرت سائل کا انتقال ہو چکا ہے، اس مسئلہ جانشینی پر بھی بحثیں رہیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ نوح صاحب معاصرانہ رشک، زعم خودی اور بے جا تعصب سے بالکل بری ہیں، ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے، شاعر جتنا پختہ ہوتا جائے گا، اپنے کمالات کا قائل ہوتا جائیگا جتنا مشہور ہوتا جائے گا، انانیت کی نعمت سے مالامال ہوتا جائیگا، جتنا مرجع انام بنتا جائیگا، تعصب اور ہٹ دھرمی، معاصرین کی تحقیر و تضحیک کے فن میں نکھرتا جائیگا، لیکن نوح صاحب نے اس کئی گھنٹہ کی صحبت میں ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اپنے کسی معاصر کو فرومایہ سمجھتے ہیں، اگرچہ معاصرین کا تذکرہ آیا، یا اپنے تئیں یادگار سلف سمجھتے ہیں اگرچہ بہتوں نے شہرہ دی، یا اپنی زبان دانی کو معیار سمجھتے ہیں، اگرچہ بعض نے یہ دام پھینکا، بیخود صاحب کے اعتراف کمال میں بھی میں نے انہیں بخل کرتے نہیں دیکھا۔

حکیم اجمل خاں

"آرزوئے ما غریباں کوئے تو!"

حکیم اجمل خاں کی متعدد حیثیتیں تھیں، اور ہر حیثیت میں وہ منفرد تھے، وہ ایک بے مثل طبیب تھے، مسیح الملک کا خطاب ــــ حاذق الملک کا سرکاری خطاب ترک کرنے کے بعد ــــ قوم کے جذبات عقیدت کا سچا ترجمان تھا، وہ ایک باوقار حکیم تھے۔ گاندھی جی ہوں یا مسٹر جناح، موتی لال نہرو ہوں یا مولینا شوکت علی، مولانا محمد علی ہوں یا مولینا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال ہوں یا لالہ لاجپت رائے، اس بارگاہ میں سب سرنگوں ہو کر حاضر ہوتے تھے، وہ اردو فارسی، اور عربی پر غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے، بے تکلفی سے بولتے تھے، اور روانی سے لکھتے تھے، وہ بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے، مصر، ترکیہ، عراق اور یورپ، ہر جگہ ان کا نام عزت سے لیا جاتا تھا، غازی امان اللہ خان فرمانروائے افغانستان خاص طور پر ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، وہ بہت بڑے دولتمند تھے، لیکن ان کی دولت عزیزوں پر، ناداروں پر، بے محابا صرف ہوتی تھی، علوم دینیہ میں ان کے تبحر کا یہ عالم تھا کہ علما کی مجلسوں کی صدارت کرتے تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان میں ایک عظیم الشان طبی درسگاہ ــــ طبیہ کالج، اور ایک مایہ ناز دواخانہ ــــ ہندوستانی دواخانہ کا قیام ہے۔ ان کا دوسرا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب جامعہ علی گڑھ زندگی اور موت کے مابین معلق تھی، وہ مسیح بن کر نمودار ہوئے، اور قوم کے اس مرتے ہوئے عظیم الشان ادارہ کو انہوں نے پھر سے زندہ کر دیا، اپنی جیب سے اور دوسروں کی جیب سے جو کچھ ہو سکتا تھا وصول کرتے تھے، اور جامعہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

ندوہ کا سالانہ جلسہ کانپور میں منعقد ہوا۔ مسیح الملک اس اجلاس کے صدر تھے۔ میں نے سب سے پہلی اور آخری بار حکیم صاحب کو یہیں دیکھا، وہ دبلے پتلے آدمی تھے، بڑھاپے کی [illegible] نے

انہیں اور زیادہ نحیف و زار کر دیا تھا، لیکن اُن کی آواز میں قوت و شوکت تھی، صرف قوت و شوکت نہیں، اثر اور سحر بھی، وہ جو کچھ کہتے تھے اس کا اثر دل پر ہوتا تھا شاید اس لئے کہ وہ وہی بات کہتے تھے، جو ان کے دل میں ہوتی تھی۔

حکیم صاحب نے ایک مختصر لیکن نہایت ہی جامع و مانع خطبہ پڑھا، جس وقت یہ خطبہ پڑھا گیا تھا، اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ نہ تھی کہ اس کے امتیازات و خصائص کو سمجھ سکتا، لیکن چند سال ہوئے ایک کام کے سلسلہ میں ندوہ کی روداریں دیکھیں، اور صدران محترم کے خطبۂ صدارت دیکھے تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ حکیم صاحب نے اپنے خطبہ میں وقت کے کیسے اہم مسائل، ضروریات اور احتیاجات کی طرف علمائے کرام کو توجہ دلائی تھی، ان کے خطبہ میں تعمیری اسکیمیں بھی تھیں، اور وقت کے پیدا کردہ مشکلات کا حل بھی، طول طویل خطبات اتنی کام کی باتیں نہیں کہی گئی تھیں جتنی اس چند ورقی خطبہ میں مسیح الملک نے کہہ دی تھیں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ دین کی مصلحت، امت کی ضرورت اور علما کی فرض شناسی پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔

اجلاس کے دوران ندوہ کے عمارت فنڈ میں متعدد اصحاب کی طرف سے چندوں اور عطیوں کا اعلان ہو رہا تھا، کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اعلان کیا کہ صدر اجلاس حکیم اجمل خاں صاحب بھی اپنی جیب خاص سے ایک ہزار کے عطیہ کا اعلان کرتے ہیں، اس اعلان نے ہال میں ایک نئی زندگی، اور ایک نئی لہر پیدا کر دی، مجھے اس وقت بھی حیرت تھی اور آج بھی اس عطیہ پر حیرت ہے، ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ خود لیڈر چندہ دینے لگے ہوں، جن کا کام چندہ لینا ہے، وہ اگر چندہ دینے لگیں تو اس پر کون حیرت نہ کرے گا؟

ڈاکٹر انصاری

دشمنوں کا دوست، دوستوں کا جاں نثار

ڈاکٹر انصاری کے سیاسی مخالف بہت، لیکن یہ سیاسی مخالف بھی، ان کی شرافت اور نیکی کے قائل تھے، زندگی کے آخری دور میں مولینا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری ایک دوسرے کے مخالف تھے، ڈاکٹر صاحب کانگرس کے حامی تھے، اور مولینا کانگرس سے قطع تعلق کر چکے تھے، پبلک طور پر مخالفت بہت نمایاں ہو چکی تھی، لیکن ذاتی طور پر دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں مولینا محمد علی کا لندن میں انتقال ہوا ڈاکٹر صاحب اس وقت جیل میں تھے، کچھ عرصہ کے بعد مولینا شوکت علی لندن سے واپس آئے، دہلی کے مسلمانوں نے اس غمزدہ بھائی کے پرتپاک استقبال کا انتظام کیا، بہت بڑا مجمع اسٹیشن پر موجود تھا، جامع مسجد میں خیر مقدمی جلسہ ہوا، ہزاروں آدمی شریک تھے، مولانا شوکت علی مجمع کا سلام لیتے اور مجمع کو سلام کرتے جامع مسجد میں داخل ہوئے اور منبر پر کھڑے ہو کر تقریر شروع ہی کرنے والے تھے، کہ سیاہ سرج کی شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ میں، ڈاکٹر انصاری برآمد ہوئے، وہ مجمع چیرتے ہوئے آگے بڑھے منبر پر پہنچے، اور شوکت سے بغلگیر ہو کر رونے لگے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ان کی آنکھوں سے ٹپک کر شیروانی پر گر رہے تھے، اس منظر سے مجمع کا ہر فرد متاثر ہوا، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہی ٹھہرے تھے، گاندھی جی سے لے کر مولینا شوکت علی تک کانگرس اور خلافت کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر انہی کے دولتکدہ پر ٹھہرتا تھا، وہ بڑے کامیاب ڈاکٹر تھے، بالخصوص سرجری میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ہزاروں روپیہ ماہوار کماتے تھے، لیکن ساری کمائی لیڈروں کی مہمانداری پر صرف ہو جاتی تھی، ان کا گھر زعمائے ملت، اور رہنمایان قوم کا کارواں سرا بنا ہوا تھا۔

۱۹۳۳ء میں گاندھی جی پونہ کے پرودہ جیل میں قید تھے۔ آدمی تنوع پسند ہیں۔ اور تھمفوا مجالسکم" (اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو) کے اصول پر عامل ہیں، جیل میں رہتے رہتے کافی مدت ہوگئی تھی، وہ عادی سے ہوگئے تھے، اور پبلک بھی اس سانحہ سے مانوس سی ہوگئی تھی۔ دفعتاً انہوں نے حکومت کو خط لکھا کہ جیل کے دوران قیام میں "اچھوت ادھار" کا کام کرنے کی آزادی دی جائے، حکومت نے انکار کیا تو فوراً "برت" کا اعلان کر دیا، حکومت اس حملہ کی تاب نہ لاسکی، چند روز تک رنگ دیکھنے کے بعد اس نے اپنی داری محسوس کی، اور انہیں رہا کر دیا، حالت کافی تشویش انگیز ہو چکی تھی، بعض لوگ تو زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، ڈاکٹر انصاری کی طلبی ہوئی اور وہ فوراً روانہ ہو گئے اور چلتے چلتے ایک بیان شائع کیا، میں گاندھی جی کو ہرگز مرنے نہیں دوں گا۔

بمبئی کے اسٹیشن پر مولانا عرفان خلافت کمیٹی کی طرف سے ان کے استقبال کیلئے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا، فرسٹ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ سے ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے ایک انگریزی ناول ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوئے، اسٹیشن پر جو لوگ موجود تھے، ان سے کچھ دیر سیاست حاضرہ پر گفتگو کی، پھر پونہ روانہ ہو گئے، اور وہاں پہنچ کر واقعی انہوں نے اپنے لب گور مریض کو حیات نو سے آشنا کر دیا۔

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد جامعہ کی حالت بہت ڈانواڈول ہوگئی تھی، اگر ڈاکٹر انصاری کا سہارا نہ ہوتا تو شاید یہ ادارہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتا، وہ عملی طور پر جامعہ کو کچھ بہت زیادہ مدد نہ پہنچا سکے، لیکن ان کی پشت پناہی سے جامعہ کی گرتی ہوئی عمارت سنبھل گئی۔

جامعہ میں ایک روز شفیق صاحب سے سیاسیات حاضرہ پر گفتگو ہو رہی تھی، میں جس مکتب خیال کا پیرو تھا وہ ڈاکٹر انصاری کی سیاست کا سخت مخالف تھا، اور شفیق صاحب جس مکتب خیال کے ترجمان تھے وہ خالص کانگریسی تھا، میں نے دوران گفتگو ڈاکٹر صاحب کی سخت مخالفت کی، فرمایا، انہیں کچھ مت کہو، "وہ بڑے میاں پوت" ہیں، میں اس وقت ہنس کر خاموش ہوگیا، بعد میں میں نے محسوس کیا، اس سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی شریف شخصیت کیلئے کوئی جامع و مانع لفظ نہیں مل سکتا۔

حکیم انور حسین

"آں قدر زخمے کہ دل میخواست در خنجر نہ بود!"

خیر آباد وطن ہے، یوپی کے نہایت مشہور اور نامور طبیب ہیں، مہاراجہ صاحب کمال پور، مہاراجکمار وزیا نگرم، راجہ صاحب کمٹڈا، راجہ صاحب نانپارہ، اور متعدد دوسرے راجواڑوں کے طبیب خاص، خواص کے علاوہ عوام کے حسن اعتقاد کا یہ عالم ہے، کہ اگر حکیم صاحب نبض پر ہاتھ رکھ دیں، تو وہ سمجھتے ہیں۔

نبض مریض پنجۂ عیسیٰ میں آگئی!

ایک زمانہ تھا، کہ ان کی حذاقت اور دست شفا نے ان کے مطب کو مرجع انام بنا رکھا تھا۔ اودھ کے بہت سے رجواڑے انہی کے سہارے جی رہے تھے، آمدنی کی کوئی انتہا نہ تھی، عین اسی زمانہ میں تحریک خلافت شروع ہوئی، اور اُنہوں نے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ ٹوڈی اور سرکار پرست خواص ان سے بھڑکنے لگے، ان کی خودداری نے اسے بھی گوارا نہ کیا، کہ ان کی طرف رُخ کریں، پھر تحریک شدھی و سنگھٹن کا ریلا آیا، اور اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کا طوفان اُٹھا، یہ اپنی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ اُس طوفان میں بھی کود پڑے، اب ہندو روسا کا ایک بڑا طبقہ ان سے کترانے لگا، ان کی آن اس کی متحمل نہ ہوئی، کہ بیان صفائی دیں یہ پورے مردانہ عزم و استقامت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہے، اس سلسلہ میں بہت بڑے مالی نقصان سے دوچار ہوئے، لیکن ان کی جبین استقلال پر شکن نہ آئی، آج کل مسلم لیگ میں پورے خلوص اور جذبہ کے ساتھ شریک ہیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گھر میں نوجوان بھتیجے اور داماد کی لاش پڑی ہے، اور یہ نئے انتخابات کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے امیدوار کا کام کر رہے ہیں، اس کے لئے کنویسنگ کر رہے ہیں۔

آپ نے شاید حکیم صاحب کو نہ دیکھا ہو، دیکھ لیجئے، آپ ایک شاندار مکان میں داخل

ہوئے، یہی حکیم صاحب کا دارالشفا ہے، یہ سامنے وسیع صحن ہے، بہت سی کرسیاں اور بنچیں پڑی ہیں، بیچ میں ایک تخت ہے، اس پر دری بچھی ہے، اس پر قالین بچھا ہے، گاؤتکیہ لگا ہوا ہے، بڑے سلیقہ اور قرینہ سے قلم دوات، کاغذ رکھا ہے۔ اتنے میں اندر سے ایک شاندار لحیم شحیم ہستی برآمد ہوئی، میانہ قد، مضبوط اور گٹھا ہوا بدن، پاؤں میں زرد مخمل کی گرگابی، غرارے دار پاجامہ، سبز رنگ کی ایک عبا، سر پر زرد رنگ کی پگڑی، خوبصورت اور باوقار چہرہ، خوبصورت اور باوقار داڑھی، یہ تیز تیز قدموں کے ساتھ سامنے والے تخت کی طرف بڑھے، مریض استقبال کے لئے اٹھے، انہوں نے جہاں آفریں تبسم کے ساتھ سب پر نظر ڈالی، ایک جہاں نواز تبسم کے ساتھ سب کا سلام قبول کیا، اور وقار و تمکنت کے ساتھ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

جہاں بھی بیٹھے ہیں نمایاں رہے ہیں، لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے تخت شہریاری پر کوئی شاہ ذی جاہ بیٹھا ہے۔ تخت کے مالک ہیں، تاج سے محروم ہیں، لیکن دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

ان کے در سے کوئی خالی نہیں جاتا، سب کی مصیبت میں کام آتے ہیں سب کا دکھ درد بٹاتے ہیں۔ غریبوں کو دوائیں مفت دیتے ہیں، دلی میں بڑے سے بڑے رئیس سے کوئی فیس نہیں لیتے، جن پر نظر توجہ ہو، اُن کا علاج اور مدد بھی کرتے ہیں، لاکھ پریشان ہوں، لاکھ دشواریوں میں مبتلا ہوں، لیکن کوئی قومی فنڈ کھلے، تو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے، خود تکلیف سہہ لیں گے، لیکن زیادہ زیادہ چندہ دیں گے، حاتم کی دولت نہیں رکھتے، لیکن دل حاتم کا رکھتے ہیں، بہت سے طلبہ ہیں جن کو وظیفہ دیتے ہیں، بہت سے غرباء ہیں جو اس دست رزق رساں کے ممنون ہیں، بہت سے مصیبت کے مارے ہیں جن کی فریاد خدا کے بعد اسی دربار میں سنی جاتی ہے۔ حکیم صاحب کا مطلب دربارِ شاہی کا کام بھی دیتا ہے جہاں دن کو مریض جمع ہوتے ہیں، وہیں رات کو دوستوں اور مخلصوں کی محفل جمتی ہے، اسی محفل سے دربار کا کام لیا جاتا ہے، یہیں مقدمے پیش ہوتے ہیں۔ یہیں ان کے فیصلے ہوتے ہیں۔ گاندھی جی کی طرح حکیم صاحب کوئی عہدہ نہیں قبول کرتے، لیکن میونسپلٹی کی چیئرمینی سے لے کر مسلم لیگ کی صدارت تک قائد المرام وہی

ہوتے ہیں، جن پر "بابو" مہربان ہوں۔

خیرآباد کے جتنے اوقاف ہیں، ان کا بڑا حصہ انہی کی تولیت یا نگرانی میں ہے بزرگوں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں، ان کے عرسوں میں جذبہ نیازمندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اور بڑے مخدوم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا شاندار عرس تو ان کے حسن انتظام کا شاہکار ہے، محرم میں مجلس کرتے ہیں، ربیع الاوّل میں میلاد، اور دونوں میں جی کھول کر دل کے حوصلے نکالتے ہیں۔

ساری جائداد وقف علی الاولاد کر دی ہے، لیکن ایک بالکل نئی صنعت کے ساتھ، یعنی صرف اپنی اولاد پر نہیں، خاندان کے تمام افراد پر بحصّۂ مساوی، اس ایثار کی مثال، موجودہ زمانہ میں تو کہیں مل نہیں سکتی۔

مرضئ مولا پر اعتماد اور اعتقاد کی یہ کیفیت کہ نہایت مختصر مدت کے اندر دو جوان لڑکے جاں بحق ہوئے، ایک جوان لڑکی خدا کو پیاری ہوئی، ایک ہونہار اور گریجویٹ بھانجا دُنیا سے رخصت ہوا، محبوب بھتیجا اور داماد دفعتہ بیمار پڑا، اور رہگرائے عالم باقی ہوا، لیکن ان میں سے کسی حادثہ نے حکیم صاحب کے حوصلہ، استقامت، جوشِ کار، اور جذبۂ عمل پر اثر نہیں کیا، وہ اسی طرح منہمک رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ، دل میں غم کا طوفان اُٹھ رہا تھا لیکن چہرہ پر استقلال و عزیمت کا نور چمک رہا تھا، جو حوادث پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا دیں، وہ اس کوہ پیکر اور کوہ وقار انسان نے اس طرح برداشت کر لئے گویا جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا، اور اس پہ نہ نوحہ و ماتم کی ضرورت ہے، نہ گریہ و شیون کی، ہم جب تک زندہ ہیں ہمیں اپنا کام بہرحال پوری مستعدی، اور سرگرمی سے جاری رکھنا چاہیئے کیا انسانیت کا ملہ اس سے زیادہ کچھ اور ہے؟

حکیم احمد علی

ہجومِ مصائب میں رضائے الٰہی پر شاکر رہنے والا انسان

امیر مینائی کے مشہور شاگرد حکیم عابد علی کوثر کے فرزندِ دلبند، اُجڑے دیار خیرآباد کے رہنے والے، طبابت خاندانی پیشہ ہے، لیکن طبیب کے ساتھ ساتھ حافظ بھی ہیں، عالم بھی ہیں، منطقی بھی ہیں، حافظ اتنے اچھے کہ رمضان المبارک میں کئی کئی قرآن سنا ڈالتے ہیں، عالم اتنے جید کہ ہم عصر اور بزرگ سب ان کا لوہا مانتے ہیں، منطق اور فلسفہ خاص ذوق کی چیز ہے، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے فرزند مولانا اسدالحق کے شاگرد ہیں، قدیم فلسفہ اور منطق پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں، طبیعت لاابالی ہے مزاج میں سادگی ہے، باتوں میں کھرا پن صفائی اور بیباکی ہے، شرافت اور محبت خمیر میں داخل ہے، چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں، بڑوں کی عزت کرتے ہیں، دوستوں سے محبت کرتے ہیں، خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

طبیب کی حیثیت سے بھی حکیم احمد علی کا پایہ بہت بلند ہے، لیکن بہ حیثیت ایک مسلمان کے میری نظر میں ان کی عزت بہت زیادہ ہے، خدا کی تقدیر پر بھروسہ جس استحکام کے ساتھ میں نے اُن کی طبیعت اور مزاج میں رچا ہوا دیکھا، کسی میں نہیں دیکھا۔

ایک زمانہ تھا کہ خیرآباد میں، ہر دوسرے تیسرے سال طاعون پھیرا لگایا کرتا تھا اس کے آتے ہی خیرآباد شہرِ خموشاں بن جاتا تھا، محلے کے محلے خالی ہو جاتے تھے، گھروں میں اُلو بولنے لگتا تھا، جنازوں پر جنازے نکلتے تھے، اور آبادی کا بڑا حصہ، شہر سے باہر باغوں اور کھیتوں میں خیمہ زن ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ خیرآباد میں بڑے زور کا طاعون آیا۔ یہ طاعون اتنا ہولناک تھا، کہ اب تک اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، میں ندوہ سے تعطیل کے سلسلہ میں خیرآباد آیا ہوا تھا، خیرآباد میں چند خاندان ایسے ہیں جو شدید سے شدید طاعون میں بھی نقل مکان نہیں کرتے

ان میں حکیم احمد علی کا خاندان بھی ہے، چنانچہ اس طاعون میں بھی حکیم صاحب نقل مکان پر دوستوں کی ترغیب کے باوجود راضی نہیں ہوئے۔

ایک روز شام کو ایک عزیز کے جنازہ میں شرکت کے لئے میں گیا۔ ان کا طاعون ہی میں انتقال ہوا تھا، حاضرین میں حکیم صاحب کا نوعمر اور ذہین اکلوتا لڑکا بھی تھا، صبح کو اطلاع ملی کہ وہ طاعون میں مبتلا ہوگیا ہے، اور شام کو اطلاع آئی کہ وہ خدا کو پیارا ہوا حکیم صاحب اسے بہت چاہتے تھے، جب میں جنازہ میں شرکت کے لئے پہنچا، تو وہ صبر وشکر کی تصویر بنے کھڑے تھے، دل میں غم کا طوفان اٹھ رہا تھا، آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لہریں مار رہا تھا، لیکن کیا مجال جو شکر کے سوا زبان سے کوئی لفظ نکل جائے، کیا مجال جو آنکھوں کے گھر سے آبدار کو اذن خاک نشینی ملے، چھوٹے مخدوم صاحب کی درگاہ میں عشاء کے بعد نماز جنازہ خود حکیم صاحب نے پڑھائی، نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ اطلاع ملی عزیز اور محبوب بھانجہ بھی لب گور ہے حکیم صاحب تیار تھے کہ اگر جنازہ وفات مل جائے تو اس کی نماز بھی پڑھا دیں، اور بالآخر اس کا بھی انتقال ہوگیا، دو ایک روز کے وقفہ کے بعد، والدۂ محترمہ بھی اس مرض میں مبتلا ہوئیں اور واصل بحق ہوئیں، کئی موتیں اس گھر میں ہوئیں۔ طاعون زدہ چوہے بلوں سے نکلتے تھے، اور رقص بسمل دکھا کر ختم ہو جاتے تھے، حکیم صاحب بغیر کسی جھجک کے ان کی دم پکڑ کر باہر پھینک دیتے تھے، ان کے دل پر یہ دہشت کبھی غالب نہ ہوئی کہ میں مر جاؤں گا، انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سوچا کہ اگر نقل مکان کر لیا جائے تو موت ٹل سکتی ہے، وہ خدا کی تقدیر پر شاکر تھے، اور یہ ان کا اٹل عقیدہ تھا، کہ اگر موت آگئی ہے تو ضرور آئے گی، نہیں آئی تو طاعون اسے نہیں بلا سکتا، کئی ہفتہ تک طاعون قائم رہا، موت کی گرم بازاری رہی، اس گھر سے کئی لاشیں نکلیں لیکن حکیم صاحب نے اپنا مکان نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔

ڈاکٹر عبد العلی

"اے طبیب جملہ علتہائے ما"

مولانا حکیم عبد الحی صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے فرزند ہیں، گورا رنگ، دانت موتی کی طرح سفید، داڑھی کے بال کھچڑی سے تھے، اب سفید ہو چکے ہیں طب کی تکمیل والد بزرگوار سے کی۔ ڈاکٹری کی تعلیم میڈیکل کالج لکھنؤ میں حاصل کی۔ ہومیو پیتھک اور بائیو کیمک طریق علاج کا خود مطالعہ کیا، اور ان چہار گانہ طریق علاج میں مہارت تامہ حاصل کر کے تشخیص اور علاج کا ایک نیا طریقہ پیدا کیا۔ اور بہت جلد لکھنؤ میں، اور پھر صوبہ بھر میں اپنے دست شفا کے باعث مشہور ہو گئے۔ آج ان کا مطب مرجع خلائق بنا ہوا ہے وقت کا بڑا حصہ یا مطب میں صرف ہوتا ہے یا مسجد میں۔ مصروفیت کا یہ عالم کہ نہ صرف کامیاب معالج ہیں، ندوہ کے موروثی ناظم ہیں۔ اس کے انتظام و انصرام میں بھی اپنا وقت صرف کرتے ہیں، نوافل کے بھی اتنے ہی پابند ہیں جتنے فرائض کے چنانچہ نماز پنجگانہ کے علاوہ بھی اشراق سے لے کر تہجد تک کی ذمہ داریاں رضا کارانہ طور پر اپنے سر لے رکھی ہیں، اور پوری مستعدی کے ساتھ انہیں انجام دیتے رہتے ہیں۔

چہرہ سورج کی طرح روشن، دل آئینہ کی طرح صاف، خفا کبھی نہیں ہوتے، بڑی سے بڑی خطا بڑی خوشی سے معاف کر دیتے ہیں۔ بہت کم گو اور کم سخن ہیں، آپ پندرہ منٹ تک انتہائی تفصیل کے ساتھ کوئی سوال کیجئے، ان کا جواب "جی ہاں" یا "جی نہیں" سے آگے نہیں بڑھے گا۔

شرافت نفس کی یہ کیفیت کہ بعض مریض رات کو سوتے سے اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں اور بجائے ڈبل فیس دینے کے تانگہ کا کرایہ بھی انہیں سے دلواتے ہیں، فیس کسی سے طلب نہیں کرتے، دے دے گا تو لے لیں گے، نہیں دے گا، تو خوش خوش واپس ہو جائیں گے، کہنہ مریض ان کے دست شفا بخش سے آن کی آن میں اچھے ہو جاتے ہیں عبد السلام صاحب قدوائی

کا حضرت مسیح کے بعد کسی کے "دست شفا" پر اگر اعتقاد ہے تو ڈاکٹر صاحب پر۔ وہ زہرباد جیسے تکلیف دہ مرض سے لے کر آنتوں کی دق جیسے آرام دہ مرض تک میں مبتلا ہوئے اور خدا کے فضل اور ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے فوراً اچھے ہوگئے، اب بھی جب بیمار پڑتے ہیں تو انہی کا علاج کرتے ہیں؛ اچھے ہو جاتے ہیں؛ اور اکثر ایسا ہوتا ہے ـــــ تو ان کے دست شفا کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں؛ فائدہ نہیں ہوتا کسی وجہ سے اُسے ڈاکٹر صاحب کی بے توجہی پر محمول کرتے ہیں، عقیدہ ان کا بالکل غیر متزلزل ہے۔ وہ کبھی ڈانوا ڈول نہیں ہوتا، ندوہ کے موجودہ مہتمم مولانا محمد عمران خاں ندوی (فاضل ازہر) کو ایک مرتبہ شرارت سوجھی ٹھیک دس بجے رات کو "بیہوش" ہوگئے ہیں نے ایک دوست کو ساتھ لیا۔ وہ سیدھا ڈاکٹر صاحب کے "تشریف کدہ" پر پہنچا۔ مریض کی نازک حالت بتائی اور ساتھ چلنے کا مطالبہ کیا؛ بے چون وچرا راضی ہو گئے، مریض کی نبض دیکھی، سینہ ٹٹولا؛ اچھی طرح معائنہ کیا؛ میں نے قلم دوات اور کاغذ بڑھا دیا کہ نسخہ تحریر فرما دیں فرمایا، اور بغیر کسی برہمی یا غصہ کے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا، قلم دوات لے جائیے ـــــ نسخہ کی ضرورت نہیں ـــــ یہ اچھے ہیں ـــــ انہیں کوئی شکایت نہیں ـــــ میں اور جملہ حاضرین محو حیرت کہ مریض بیہوش پڑا ہے، اور یہ نسخہ لکھنے کے بجائے اسے صحت کا سرٹیفکیٹ دے رہے ہیں۔ ہم محو حیرت کھڑے تھے کہ وہ اپنا فیصلہ سنا کر تانگہ میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے

صبح کو معلوم ہوا، یہ خان صاحب کی شرارت تھی، واقعی وہ ازراہ مذاق "بیہوش" ہوئے تھے، تاکہ آزمائیں ان کی بیماری ہنگامہ خیز ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

کہتے ہیں حضرت مولانا سید احمد شہید کے وقت سے لے کر اس خاندان میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا رہا ہے یہ اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں؛ ڈاکٹر صاحب "الولد سر لابیہ" کے صحیح مصداق ہیں۔

حکیم کبیر الدین

حکیم اجمل خاں کا معتمد خصوصی جامعہ طبیہ کا بانی

جامعہ کے زمانہ طالب علمی میں میرا زیادہ وقت، طبیہ کالج کے ہوسٹل میں، اپنے بچپن کے دوست نصیر الدین صاحب اجمیری کے ساتھ صرف ہوتا تھا، میں حسب معمول ایک دن ان سے ملنے گیا، نصیر صاحب حلقۂ احباب میں شاہ والا جاہ بنے بیٹھے تھے، خود بھی چہک رہے تھے، اور دوسرے بھی نغمہ سنجیوں میں مصروف تھے، نصیر صاحب کے پاس ایک اور دبلے پتلے صاحب بیٹھے ہوئے تھے، اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ قہقہوں اور لطیفوں میں حصہ لے رہے تھے، قدرتاً مجھے گمان ہوا، یہ بھی کوئی طالب علم ہیں، عمر زیادہ سہی لیکن یہ بے تکلفی اور شگفتگی، یہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی، یہ شوخی اور زندہ دلی کسی بے فکر طالب علم ہی کے حصہ میں آسکتی ہے، اگرچہ عمر رسیدہ کیوں نہ ہو، اور سچ پوچھئے تو طب کا علم جس قدر زیادہ عمر میں حاصل کیا جائے، اُتنا ہی بہتر ہے ان کے نہ رکنے والے قہقہوں اور بذلہ سنجیوں سے عاجز آکر میں نے نصیر کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا "یہ کون ذات شریف ہیں؟" انہوں نے میری سرگوشی کا جواب پُر زور آواز میں دیا "تم نہیں جانتے حکیم صاحب کو؟ عجیب بے وقوف ہو، ہر پڑھا لکھا، حکیم کبیر الدین صاحب کے نام سے واقف ہے، اور تم اُن کے سامنے بیٹھے پوچھ رہے ہو، یہ کون صاحب ہیں؟ نصیر صاحب کا مقصد پورا ہو گیا یعنی میں جھینپ گیا، اور حکیم صاحب کو قہقہہ لگانے کا ایک نیا موقع میسر آگیا۔

حکیم صاحب کا شرف دیدار آج حاصل ہوا تھا، لیکن ان کی عظمت وجلالت سے میں بچپن سے واقف تھا، میرے خاندان میں میرے کئی عزیز حکیم ہیں، اور سب کے پاس حکیم صاحب کی ترجمہ کی ہوئی طبی کتابیں ہیں، شرح اسباب سے لے کر چھوٹی بڑی کوئی مستند طبی کتاب ایسی نہیں ہے، جسے حکیم صاحب نے اُردو میں نہ منتقل کر دیا ہو، اور لطف یہ کہ کتاب میں ترجمہ کا نہیں تصنیف کا رنگ غالب کوئی طبیہ کالج اور اسکول ایسا نہیں ہے، جہاں حکیم صاحب کے بلند پایہ

تراجم نصاب درس میں نہ داخل ہوں، جس طرح طب کا ہر طالب علم، بوعلی سینا کے نام سے واقف ہے، اسی طرح ہندوستان کا ہر طالب علم حکیم کبیر الدین کے نام اور کام سے آشنا ہے، یہ معلوم کرکے کہ حکیم کبیر الدین یہی ہیں، مجھ پر ان کا رعب طاری ہوا لیکن حکیم صاحب کی زندہ دلی، خوش کلامی، بے تکلفی اور سادگی نے اس صحبت میں مجھے بھی بے تکلف بنا لیا، مجھے حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا اہل فن لیکن نہ تصنع نہ نمائش، نہ اپنے بڑے پن کا احساس، نہ دوسروں سے اپنی فضیلت کا اعتراف کرانے کا شوق، چند ہی روز کے بعد حالت یہ ہوئی۔ کہ جس طرح نصیر صاحب میرے لئے "ضروریات زندگی" میں داخل تھے، حکیم صاحب کا گھر بھی ہو گیا، محفل جم جاتی تو بعض دن رات کے ۱۲ بجے برخاست ہوتی، اور شام کی مجلس آرائی تو روزانہ کا پروگرام تھی۔

پھر میں بمبئی آگیا، لیکن جب دہلی جاتا ان سے ضرور ملتا، اور وہ ایک دعوت بھی ضرور کرتے نہ میری وضع داری میں فرق آیا تھا، نہ ان کی وضعداری رنگ بدلتی تھی، یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا، جب تک حکیم صاحب حضور نظام کی طلبی پر حیدرآباد تشریف نہیں لے گئے، اب وہ وہاں کے طبیہ کالج کو سرفراز کر رہے ہیں، حکیم صاحب سے کوئی "نسخہ" تو میں نہیں حاصل کر سکا، لیکن ایک "چٹکلہ" ضرور میں نے ان سے حاصل کر لیا، ایک مرتبہ انہوں نے میری دعوت کی، کھانے میں مرچ بہت زائد تھا، میں نے شکایت کی، انہوں نے دہی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "یہ اسی لئے ہے، آپ چاہے جتنا مرچ کھا لیجئے، لیکن اگر اوپر سے دہی استعمال کر لیں، تو وہ ذرا بھی آپ کو پریشان نہیں کر سکتا، بالکل مطمئن رہیے!"

حکیم صاحب مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے معتمد خصوصی تھے، مرحوم نے حکیم صاحب کو کالج کی بہت سی ذمہ داریاں سونپ دی تھیں، اور وہ اب تک انہیں انجام دے رہے تھے، چنانچہ بیک وقت پروفیسر بھی تھے اور وائس پرنسپل بھی، پھر کالج کے سیکرٹری قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام حیدرآباد، اور کالج کے ناخدا حکیم جمیل خاں میں ان بن ہوئی اور وہ ایک ہنگامہ خیز اسٹرائیک کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، حکیم صاحب نے بڑی پامردی کے ساتھ اسٹرائک میں حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم صاحب کو کالج چھوڑنا پڑا۔ قاضی صاحب تو پہلے ہی رخت سفر باندھ چکے تھے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!

پھر قاضی صاحب ادھر اُدھر کے چکر لگاتے ہوئے حیدرآباد پہنچے، لیکن حکیم صاحب بدستور دلی میں موجود رہے، وہ دُبلے پتلے منحنی سے انسان ہیں لیکن قدرت نے غیر معمولی جذبہ کار انہیں مرحمت کیا ہے، کالج سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ خاموش نہیں بیٹھے، اپنے مخلص دوست حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور حکیم محمد الیاس خاں کے اشتراک و تعاون سے انہوں نے قرول باغ میں بغیر کسی پبلک چندہ اور بغیر کسی والیٔ ریاست کی سرپرستی کے جامعہ طبیہ کی بنیاد ڈال دی اور پرنسپل کی حیثیت سے آنریری خدمات انجام دینے لگے، یہ کام انہوں نے اس ذوق شوق محنت اور سرگرمی کے ساتھ کیا کہ بہت جلد جامعہ طبیہ کا شمار ہندوستان کے بہترین طبی اداروں میں ہونے لگا متعدد صوبوں کی حکومتوں نے اس کے اسناد کو تسلیم کر لیا۔ اور طلبہ کی اکثریت کا یہ عالم ہوا کہ بہت سی داخلہ کی درخواستیں ہر سال مسترد کر دینا پڑتی ہیں۔

اب حکیم صاحب حیدرآباد میں ہیں، لیکن جامعہ طبیہ کو اتنی مضبوط مستحکم بنیادوں پر قائم کر چکے ہیں، کہ ان کی عدم موجودگی میں بھی مرجعیت کا وہی عالم ہے جو اُن کے سامنے تھا، میرے نزدیک، یہ حکیم صاحب کی قوت تعمیر و تخلیق کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔

حکیم نابینا

فن نباضی کا فقید المثال ماہر

میرے ایک رفیق عبدالسلام صاحب قدوائی، نصیب دشمناں کچھ بیمار ہوئے اور حسب عادت بستر پر لیٹتے ہی "اندیشہ ہائے دور دراز" میں مصروف ہو گئے، مرض کا نام کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ قابل علاج ہے یا لاعلاج، صحت اگر ہوئی تو کتنے روز میں ہو گی؟ اور اگر پہلے سے یہ معلوم ہو جائے کہ مرنا ہے تو دہلی کے بجائے خاک پاک وطن ہی کو یہ شرف کیوں نہ حاصل ہو؟ متعدد حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کیا، لیکن گارنٹی کے ساتھ کسی نے نہ بتایا کہ موت واقع ہو گی یا نہیں؟ اور وہ اس کا یقین چاہتے تھے، اور اسی تیقن پر ان کے مستقبل کے پروگرام کا دارومدار تھا۔

ایک روز ایک دوست نے کہا، تم حکیم نابینا کے پاس چلے جاؤ۔ وہ سب کچھ بتا دیں گے۔ حکیم نابینا صاحب کا نام نامی و اسم گرامی سُننتے ہی مرجھایا ہوا پھول کھل گیا، اور قدوائی صاحب نے طے کر لیا، کہ صبح اُٹھتے ہی حکیم نابینا کے مطب کا رخ کریں گے، یہ معلوم کر کے اور اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ حکیم نابینا جامعہ کے چانسلر ڈاکٹر انصاری کے بھائی ہیں، جامعہ کے طلبہ پر خاص شفقت کرتے ہیں، اور شفقت کی انتہا یہ ہے کہ ان کو دوا تک مفت دیتے ہیں۔

دوا مفت دیتے ہیں! — یہ خوشخبری میرے لئے بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہ تھی، حکیم نابینا کی حذاقتِ نباضی، کمالِ فن، اور مہارت کی ایک دنیا قائل تھی، سب جانتے تھے وہ حضور نظام کے طبیب خاص رہ چکے ہیں، ڈاکٹر اقبال اور لالہ لاجپت رائے کی لاعلاج پتھری کا بغیر آپریشن کے نہایت کامیاب علاج کر چکے ہیں بڑے بڑے رؤسا، اور اُمراء منہ مانگے دام دے کر ان سے دوائیں لیتے ہیں، اور حیات نو حاصل کرتے ہیں، میں نے دل میں سوچا،

میں بیمار نہ سہی، لیکن ممکن ہے کوئی ڈھکا چھپا مرض مجھے بھی ہو، اور حکیم نابینا کی نباضی اس کا سراغ لگالے، چنانچہ میں نے قدوائی صاحب سے کہہ دیا، میں بھی چلوں گا، میرا یہ اعلان سنکر وہ بہت خوش ہوئے، کیونکہ کہیں اکیلے جاتے ہوئے ہمیشہ ان کا دل زور زور سے دھڑ دھڑ کا کرتا تھا۔

ہم دوسرے روز کوئی گیارہ بجے کے قریب حکیم صاحب کے مطب میں پہنچے اور جلد ہی بازیاب ہوگئے، حکیم صاحب چشم ظاہر سے محروم تھے۔ لیکن ان کا دیدہ باطن وا تھا، قدوائی صاحب کی نبض کو گرفت میں لاتے ہی انہوں نے ان کی تاریخ ماضی دہرانا شروع کردی، اور انہیں بشارت دے دی، کہ صاحب آپ کی موت واقع ہونے کا کوئی احتمال نہیں ہے آپ میں اور موت میں فی الحال اتنا ہی فاصلہ ہے، جتنا حق و باطل میں، وہم کے بادل چھٹ گئے۔ اور خوش عقیدگی کا نور قدوائی صاحب کے چہرہ پر جگمگانے لگا۔

اب میری باری آئی، اور مجھ سے کچھ پوچھے بغیر حکیم صاحب نے کہہ دیا کہ "آپ کو کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے" پھر اپنے صندوقچہ کو ٹٹول کر انہوں نے چند شیشیوں میں سے نقرئی و طلائی گولیاں نکالیں اور قدوائی صاحب کو مرحمت فرمائیں: انہوں نے ان گولیوں کو منجمد آب حیات سمجھ کر بڑے جوش کے ساتھ قبول کرلیا۔ اور اگر کچھ روز بعد حکیم صاحب اپنے "صدقہ جاریہ" کا سلسلہ بند نہ کردیتے تو قدوائی صاحب کی دلی تمنا تو دراصل یہ تھی کہ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے!

حکیم نابینا جتنے بڑے طبیب تھے، بہ حیثیت شخص کے وہ اور زیادہ بلند پایہ کے حامل تھے، دوہرا جسم، چہرہ پر چیچک کے کچھ داغ، آنکھیں نور بصارت سے محروم، لیکن نور بصیرت کی حامل، ماتھے پر سجدہ کا نشان، زبان پر اوراد و وظائف کا سلسلہ جاری، ہاتھ تسبیح کے شغل میں مصروف، ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کے بعد ممکن نہ تھا کہ ان کی عظمت اور محبت دل میں نہ پیدا ہو،

اس ایک ملاقات کے بعد پھر مدت تک حکیم صاحب سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا، ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں ایک ضرورت سے میں دہلی گیا، میری ایک عزیزہ کچھ عرصہ سے علیل تھیں، وہ حکیم نابینا کا علاج کرانا چاہتی تھیں، اُن کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوا،

اب وہ چراغ سحری کی طرح جھلملا رہے تھے، پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کمزور، نحیف اور ضعیف ہو چکے تھے، لیکن ان کا فن پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جوان ہو چکا تھا۔

حکیم صاحب کا یہ اصول تھا، کہ وہ خود نبض دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتے تھے، مریض سے اس کے حالات مرض شاذ و نادر ہی دریافت کرتے تھے۔ ان عزیزہ کی نبض دیکھ کر حکیم صاحب نے مریضہ کی تمام مدت مرض، غلط علاج اور غلط پرہیز کی خود ہی تمام تفصیل بیان کر دی، وہ بیچاری بھی غرق حیرت اور میں بھی متحیر، نباضی ہے یا سحرکاری؟

اس واقعہ کے بعد حکیم صاحب کے دیدار کا اتفاق نہیں ہوا، اور کچھ روز بعد معلوم ہوا وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے ـــــ مرنا سب کو پڑتا ہے، بڑے سے بڑے نباض اور بڑے سے بڑے طبیب کو بھی:

ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے

صلاح الدین سلجوقی

ایک غیور اور خوددار مسلمان

۳۸ء کے آغاز میں میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا، کہ تکمیل تعلیم کے لیے مصر جاؤں، میرے ندوہ کے عزیز حافظ عمران خاں (موجودہ مہتمم ندوۃ العلما) جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کا اصرار حد سے تجاوز کر چکا تھا، اور وہ از راہ عنایت و محبت میرے لیے جملہ سہولتیں فراہم کرنے کو بھی تیار تھے۔ یہ سہارا جو مجھے ملا، تو میں نے رخت سفر باندھنے کی تیاری شروع کر دی، اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کی ادارت اور خلافت پریس مینیجری مجھ ہی سے متعلق تھی، مولینا شوکت علی دہلی میں مقیم تھے، میں نے انہیں خط لکھا کہ میں سفر مصر کا ارادہ کر چکا ہوں، روزنامہ خلافت اور خلافت پریس کا کوئی انتظام کیجئے۔ مولانا اخبار اور پریس کی تمام ذمہ داریاں مجھ پر ڈال کر مطمئن ہو گئے تھے اور میری کارگزاریوں سے بے حد خوش تھے، میرے اس خط کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، انتظار کے بعد پھر میں نے خط لکھا، اور عرض کیا، میں سارے انتظامات مکمل کر چکا ہوں، صرف آپ کی اجازت کا انتظار ہے، مصر کی فلسطین کانفرنس کی شرکت کے لیے مولانا عرفان مرحوم خلافت کمیٹی کی طرف سے جا رہے تھے، میں چاہتا تھا، انہی کے ساتھ چلا جاؤں اس لئے اور جلدی کر رہا تھا، اس دوسرے خط کا مولینا نے جواب دیا، اس طرح دفعتاً تمہارا عزم سفر میرے لئے تکلیف دہ ہے، لیکن اگر تم میری رائے اپنے مستقبل کے لئے غیر ضروری سمجھتے ہو، اور خود ایک رائے قائم کر چکے ہو، تو میں کس طرح تمہیں روک سکتا ہوں؟ خلاف معمول اس مکتوب میں خوشنودی اور شفقت کی لہروں کی بجائے برہمی اور ناراضی ٹپک رہی تھی، ان کے مجھ پر اتنے احسانات تھے اور ان کی شفقتوں سے میں اتنا متاثر تھا کہ میں انھیں کسی قیمت پر بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا، دوسرے روز میں دہلی روانہ ہو گیا، رات کو گاڑی

پہنچی، ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا صبح سویرے فرول باغ بیگم محمد علی کی قیام گاہ پر پہنچا، جہاں معمولاً مولینا ٹھہرا کرتے تھے شفقت، اپنائیت کا دریا بہاتے ہوئے مولانا بغلگیر ہوئے ناشتہ کرنے جا رہے تھے، کہنے لگے چلو ناشتہ کر لو، میں ناشتہ کر کے آیا تھا، میں نے معذرت کی، کہنے لگے، اچھا چلو بیٹھو تو، میں بھی ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔

ناشتہ کی میز پر سرکا مسئلہ چھڑا، کہنے لگے، تمہارے مستقبل کی مجھے تم سے کم فکر نہیں ہے لیکن میں تمہارے اس فیصلہ سے متفق نہیں ہوں، اس میں تمہارا بھی نقصان ہے، میرا بھی نقصان ہے، اتنے دنوں کے بعد اب اخبار اور پریس کی حالت سدھری ہے اور میں بے فکر ہو گیا ہوں، تم یوں چلے جاؤ گے تو میری پریشانیاں بڑھ جائیں گی، تمہارا نقصان یہ ہے کہ یوں رواروی میں جاؤ گے تو تمہیں وہ سہولتیں نہیں ملیں گی جو میرے ذریعے سے مل سکتی ہیں، زیادہ نہیں ایک سال صبر کرو، میں خود مصر جانے والا ہوں، میرے ساتھ چلنا پھر تمہیں وہ سب کچھ وہاں حاصل ہو جائے گا، جس کی تمہیں ضرورت ہو سکتی ہے۔

میں مولینا کا کہنا ٹال نہیں سکتا تھا، میں نے اُن کی یہ تجویز منظور کر لی، انہوں نے پوچھا، بتاؤ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا، جو آپ کی ہے، بہت خوش ہوئے، ابھی ابھی ان کے چہرہ پر افسردگی سی چھائی تھی، اب وہ مسرت کے جوش سے دمکنے لگا، حقیقت یہ ہے، انہیں مجھ سے وہی لگاؤ تھا، جو ایک باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔

اب وہ اسمبلی جا رہے تھے، مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، واپسی میں سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل جنرل افغانستان سے ملنے تشریف لے گئے، ضمیمہ کے طور پر میں بھی ساتھ تھا۔

سلجوقی صاحب سے مولینا کے دیرینہ مراسم تھے، بڑے اخلاق و تپاک سے ملے مولینا نے بڑے مبالغہ آمیز الفاظ میں میرا تعارف کرایا، ہم لوگ ایک کمرے میں اطمینان سے بیٹھ گئے اور مختلف مسائل پر تبادلہ فکر اور اظہار خیال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سردار صاحب بڑے علم دوست، بڑے دوست پرور اور بڑے مردم شناس آدمی تھے، انہیں جب کوئی اپنے مذاق اور اپنی پسند کا آدمی مل جاتا تھا تو اسے اصرار کر کر کے بٹھاتے تھے، اور بڑے خلوص و محبت سے باتیں کرتے تھے، شوکت کو نودہ

اپنا بزرگ سمجھتے تھے، شملہ میں بالعموم وہ انہی کے مہمان رہا کرتے تھے۔ گفتگو کسی ایک موضوع پر نہیں ہو رہی تھی سیاسیات عالم اسلام، سیاسیات ہند، سیاسیات بین الملی، باتوں باتوں میں سب کا ذکر چھڑا، اور خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔

پھر ہندوستان موضوع گفتگو بن گیا، اور یہاں کے معاملات و مسائل پر باتیں ہونے لگیں بالکل بلا ارادہ طور پر اسلامی ہند کے ایک بڑے لیڈر کا ذکر چھڑا، اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی زیر گفتگو آئی، ان کی صاحبزادی، ایک غیر مسلم سے شادی کرنے والی ہیں، سردار صاحب کی تشفی شوکت صاحب نے لڑکی کے باپ کے کارناموں، قابلیتوں اور صلاحیتوں کا ذکر کر کے کرنا چاہی، اور پھر فرمایا، یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ اولاد ماں باپ کے اثر کو قبول نہیں کرتی، اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے، شوکت صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ لڑکی کا باپ خود اس حادثہ سے بہت ملول اور دل گرفتہ ہے، اسے اپنی لڑکی کی اس نا روا حرکت کا بڑا صدمہ ہے، وہ مذہبی احکام پر عمل کرنے میں کتنا ہی سست اور نکما ہو لیکن عقیدہ کے لحاظ سے وہ پکا مسلمان ہے، اور وہ مسلم اور غیر مسلمہ کے اختلاط و ارتباط کو کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا، خود میرے سامنے اُس نے اپنی لڑکی کو کئی مرتبہ ہدایت کی کہ وہ قرآن پڑھا کرے، اسلامی معاملات و مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے، لیکن لڑکی کسی اور ہی رنگ میں رنگی ہوئی تھی، ٹال گئی۔

شوکت صاحب کی یہ باتیں سردار صاحب، بڑی توجہ اور دلچسپی سے سُنتے رہے، جب شوکت صاحب صفائی دے چکے اور خاموش ہوگئے تو سردار صاحب نے بپھرے انداز اور ناقابل مفاہمت لہجہ میں کہا۔

"یہ ایمان کی کمزوری ہے، اگر کوئی باپ اسے گوارا کر لیتا ہے، کہ اس کی اولاد دوسرا مذہب اختیار کرے، یا کسی کافر اور مشرک سے زن و شوہر کے تعلقات قائم کرے تو اس کا ایمان استوار نہیں ہے۔

میں اپنی کہتا ہوں، اگر میری اولاد جو مجھے خواہ کتنی ہی عزیز ہو، ایسا کرے تو ایک لمحہ بھی تامل نہ کروں، اُسے گولی ماردوں اپنے ہاتھ سے، اس کا گلا گھونٹ دوں، میں اگر زندہ ہوں، تو اس کی زندگی ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔

کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا، بپھرے ہوئے شیر کی طرح سردار صاحب کی آواز گونج

رہی تھی۔ الفاظ میں برہمی کا ارتعاش، چہرہ پر تمتماہٹ آنکھوں سے شعلوں کی بارش یہ تھی اس وقت سردار صاحب کی حالت۔ وہی سردار صاحب جو ابھی چند منٹ پہلے تک بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے جن کے چہرہ پر بے تکلفی اور مسرت کے پھول کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے جن کی باتیں بکسر خلق و لطف تھیں۔

افغانوں کی حرارت ایمانی اور جوش مذہب سے سب واقف ہیں۔ میں بھی واقف تھا۔ لیکن نئی دہلی کے پرشکوہ مکان میں عیش و تنعم کے ماحول میں آج میں نے ایک افغان کی حرارت ایمانی اور جوش مذہب کا جو ناقابل فراموش منظر دیکھا اسے میں زندگی کے کسی ماحول میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔

سفیرِ عراق

حکومتِ عراق کا غیور نمائندہ

مسئلہ فلسطین پر ملتِ اسلامیہ کے تاثرات و جذبات کا اظہار کرنے کے لئے بمبئی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا: اس جلسہ کی اہمیت اس لئے اور بڑھ گئی تھی کہ قائد اعظم ، اس میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائے تھے۔ خلقت انہیں دیکھنے کے لئے اور ان کی تقریر سننے کے لئے امنڈ پڑی تھی۔

اس جلسہ میں مصر و عراق کے قناصل بھی مدعو کئے گئے تھے۔ قائد اعظم کے داہنی طرف مصر کے قونصل صاحب تشریف فرما تھے اور بائیں طرف عراق کے، سب سے پہلے ان دونوں حضرات نے صورتِ حال کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

میں نے دیکھا، عراق کا نوجوان قونصل خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا ہے۔ نہ پندار شہریاری نہ غرور بادشاہی، سادگی کی تصویر، متانت کا مجسمہ، پھر جب تقریر کرنے کی باری آئی تو وہ اس طرح کھڑا ہوا جیسے اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ وہ جوش میں بھٹنا نہیں چاہتا تھا، لیکن حاضرین تک اپنے دل کی بات پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اس کا لب و لہجہ جنگ جویانہ نہیں تھا۔ لیکن ناقابلِ مفاہمت ضرور تھا۔ وہ یہودیوں کا دشمن نہیں تھا، لیکن ان کے مفاد پر ملتِ عربیہ کے مفاد کو قربان کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ اس کے منہ سے ٹھہر ٹھہر کر الفاظ نکل رہے تھے ان میں سمندر کے تلاطم کا خروش نہیں تھا، لیکن ایک بہتے ہوئے، بل کھاتے ہوئے دریا کی روانی ضرور تھی۔ اس کے الفاظ تیر و نشتر بن کر منہ سے نہیں نکل رہے تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا، یہ پھول جو منہ سے جھڑ رہے ہیں، عزم و استقامت کے سنگ گراں ہیں جنہیں پھاند کر یہودی امریکہ اور برطانیہ کی حمایت اور سرپرستی کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکتے، اس کے منہ سے نکلے ہوئے بول، طبل جنگ نہیں تھے، لیکن ان کی معنویت اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ جس قوم کی طرف سے یہ بول بولے جا رہے تھے، وہ اگر جنگ پر مجبور کر دی جائے تو پیچھے ہٹنا نہیں

جانتی ۔ اس کے جملے اور کلمے سب وشتم سے خالی تھے۔ طنز و تعریض سے معرّیٰ تھے۔ نفرت و حقارت سے بے گانہ تھے، لیکن ان میں ایک آہنی عزم جھلک رہا تھا، ایک نہ ٹوٹنے والا ارادہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی کا دشمن نہ ہونا اور بات ہے۔ نفرت و حقارت سے کسی کو نہ دیکھنا اور بات ہے، لیکن اپنی خودی اور خود شناسی کا جلوہ جو دیکھ چکا ہو، وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ البتہ جب سر پہ آن پڑتی ہے تو دیکھنے والے دیکھ لیتے ہیں اور محسوس کر لیتے ہیں کہ بہادر تلوار دکھا کر کسی کو ڈراتا نہیں، لیکن کسی کی تلوار دیکھ کر ڈرتا بھی نہیں، وہ حملہ میں پہل نہیں کرتا۔ لیکن حملہ روکنے کی سکت رکھتا ہے۔ وہ ظلم نہیں کرتا، لیکن مظلوم بننا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔

اس تقریر کے بعد جب قائد اعظم کھڑے ہوئے تو مجمع نے فلک شگاف "زندہ باد" کے نعروں سے اپنے محبوب لیڈر کا خیر مقدم کیا، اور "پاکستان زندہ باد" کے اعلان بالجہر سے اپنی حسرتِ تعمیر کا اظہار کیا۔ میں نے دیکھا یہ سنجیدہ نوجوان اس جذباتی موقع پر بھی اپنا حصہ ادا کر گیا، اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا، لیکن پاکستان کا نام سن کر اس کا چہرہ دمک اٹھا، اور قائد اعظم جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو اس نے بڑی خوشی کے ساتھ چیئرز سے ان کا خیر مقدم کیا۔

ایک شریف اور با اصول یورپین

فیلڈ مارشل وان ہینڈ نبرگ جرمن ریشتاغ کے صدر کا انتقال ہو گیا۔ جرمن قونصل خانہ کی طرف سے، بمبئی کے چرچ میں اتوار کے روز "ایصال ثواب اور دعائے مغفرت" کے لئے ایک اجتماع کا انتظام ہوا۔ جس میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا۔ یہ اعلان لے کر جرمن قونصل خانہ کا ایک شخص میرے پاس آیا کہ اسے خلافت میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اعلان لے لیا اور کہہ دیا شائع ہو جائے گا۔

مولانا عرفان اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے اس آدمی سے کہا ہم بھی آئیں گے، وہ بولا ضرور تشریف لائیے اور چلا گیا۔ اتوار آیا اور گذر گیا، نہ مولانا عرفان کو وہاں جانا یاد رہا نہ مجھے۔

بمبئی بہت بڑا ایکہ ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی شہر ہے۔ دول غیر کے یہاں جو قونصل خانے قائم ہیں، ان کا مقصد سیاسی نہیں، صرف تجارتی ہے۔ جرمن قونصل خانہ بھی اسی مقصد کے لئے قائم تھا اور وہ جرمنی کے صنعتی، حرفتی، تجارتی اور ثقافتی حالات کا پروپیگنڈہ، یہاں کی مختلف زبانوں میں کیا کرتا تھا، تاکہ لوگوں کو صحیح معلومات حاصل ہوں، اور وہ قونصل خانہ سے براہ راست روابط پیدا کر کے جرمنی سے صنعتی اور تجارتی تعلقات قائم کریں۔ اردو میں مضامین و مقالات، اطلاعات و مراسلات کے ترجمہ کا کام، میرے ایک دوست امیر حسن صاحب مرحوم کیا کرتے تھے جو ٹائمز آف انڈیا میں ملازم تھے۔

ایک مرتبہ وہ کئی مہینہ کی رخصت پر وطن جا رہے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ ان کے تعلقات قونصل خانہ سے قائم رہیں، اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ درمیانی اور عارضی مدت کے لئے اپنا کوئی آدمی ترجمہ کا کام کرنے کے لئے دے جائیں۔ انہوں نے مجھ سے اصرار کیا، میں راضی ہو گیا، ایک دن دوپہر کو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر بیلارڈ پیر جرمن قونصل خانہ

پہنچے اور قونصل جنرل مسٹر کیپ سے میرا تعارف کرایا اور کہا میں تو جاتا ہوں، میری رخصت میں ترجمہ کا کام یہ کرتے رہیں گے۔ مسٹر کیپ نے منظور کر لیا۔

اب ہر پندرھویں روز میں قونصل خانہ جانے لگا جو ترجمہ کرتا وہ دے آتا اور آئندہ ترجمہ کرنے کے لئے نئے آرٹیکل لے آتا۔ یہ سلسلہ کم و بیش چھ ماہ جاری رہا کیونکہ امیر حسن صاحب بہت مدت کے بعد آئے اور آتے ہی بیمار پڑ گئے اور بالآخر یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔

جرمن قونصل مسٹر کیپ کی دو چیزوں سے میں بہت متاثر ہوا۔

ایک تو یہ کہ وہ بے انتہا با اخلاق تھا۔ میرا وزیٹنگ کارڈ پہنچا اور وہ دروازہ تک لینے آیا۔ تپاک سے مصافحہ کیا اور اپنے ساتھ اندر لے گیا، وہاں پہنچ کر اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ پیش کیا، ماچس جلا کر آگے بڑھایا تاکہ میں اسے سلگا لوں اور جب میں بیٹھ گیا، تب وہ کرسی پر بیٹھا مجھے نہیں معلوم گجراتی، مرہٹی، اور ہندی کے مترجمین کے ساتھ اس کا کیا سلوک تھا، لیکن کم از کم میرے ساتھ یہی تھا اور میں اس کے اس حسن اخلاق سے بہت متاثر تھا۔

دوسرے یہ کہ اس سارے زمانہ میں اس نے براہ راست یا بالواسطہ، سیاسیات ہند پر اشارۃً کنایۃً بھی کوئی گفتگو نہیں کی۔ گفتگو کا موضوع صرف تجارتی اور صنعتی حالات تک محدود رہا۔ بوڑھا آدمی تھا لیکن نہایت مضبوط اور تندرست، ناک نقشہ ہنڈنبرگ سے ملتا ہوا تھا۔ اور اس کی ایک قد آدم تصویر بھی ہمیشہ اس کے سامنے آویزاں رہتی تھی۔

جب امیر حسن صاحب آ گئے .... میں نے آنا جانا چھوڑ دیا، اور وہ خود جانے لگے پھر وہ بیمار پڑے اور اسی بیماری میں وفات پا گئے۔ اس اثنا میں مسٹر کیپ کا بھی تبادلہ ہو چکا تھا، وہ کہیں اور بھیج دیئے گئے تھے اور ان کی جگہ پر کوئی اور آ گیا تھا۔

سفیرِ مصر

حکومت مصر کا پُرجوش ترجمان

مسئلہ فلسطین پر مسلمانانِ بمبئی کے عظیم الشان اور یادگار جلسہ میں ممالکِ اسلامیہ کے جو قونصل شریک ہوئے تھے۔ ان میں مصر کا سراپا جذبات سفیر بھی تھا۔

قائداعظم کی تشریف آوری تک وہ چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچتا رہا، پھر وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا، اور اس نے عربی خطابت کا نام روشن کر دیا۔ دنیا کی ہر قوم اپنے اندر کوئی نہ کوئی امتیازی وصف رکھتی ہے۔ عربوں کو قدرت کی طرف سے خطابت کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے۔

عربوں کی خطابت طوفانی دریا کے پرشور دھارے سے مشابہ ہوتی ہے، عرب خطیب گرجتا بھی ہے اور برستا بھی ہے، اس میں بجلیوں کی چمک بھی ہوتی ہے۔ طوفان کی شورش بھی اور دریا کی روانی بھی، یہ بلند آہنگ خطیب جو اس وقت سامنے کھڑا ہوا اللہ نطق اعرابی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا تھا، اول و آخر خطیب تھا۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے وہ غیر ذمہ دارانہ نہیں تھے مبچے تُلے تھے لیکن کہیں کہیں وہ شعلۂ جوالہ بن جاتے تھے، کہیں وہ برق تپاں۔ ان میں طوفان کی شورش تھی، رعد کی کڑک تھی، برق خرمن سوز کی چمک تھی، پہاڑ کی استقامت تھی۔ سمندر کی گہرائی تھی اور بھنور کا سا پیچ و خم تھا۔ فلسطین کی آزادی و استقلال کے سلسلہ میں مصر کے جواں دل اور جواں بخت فرمانروا کی زندہ دل اور پرجوش قوم نے مصر کے دوراندیش اور نڈر رہنماؤں نے جس قدر شجاعت، مردانگی اور حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے ایک دنیا واقف ہے اور اس وقت اس خطیب کے اندر اپنے محبوب بادشاہ، اپنی محبوب قوم اور اپنے محبوب ترین رہنماؤں کی روح پورے طور پر جھلک رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا یہ ایسا طوفان ہے جو تھم نہیں سکتا۔ ایسا دھارا ہے جس کا رخ موڑا نہیں جا سکتا، ایسا عزم آہنی ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا، یہ تقریر نہیں تھی ایک زندہ قوم کے باشعور انسان کا وہ جذبہ تھا جو دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا سکتا ہے۔ عربوں کے تاثرات و جذبات فلسطین کے سلسلہ میں کیا ہیں؟

وہ اس مقدس سرزمین کی حفاظت و ضیافت کے لئے کہاں تک آگے بڑھ سکتے ہیں اور پیمبر دل کے اس مسکن کو نرغۂ عدو اور ہجوم اغیار کی دستبرد سے بچانے کے لئے کیا کچھ کرنے اور کر گذرنے کو تیار ہیں۔ اس کی صاف ستھری اور روشن تصویر آنکھوں کے سامنے اس تقریر سے آگئی تھی۔ اور ہر سننے والا یہ سمجھ رہا تھا کہ فلسطین کا زخم کس طرح ناسور بن کر ہر عرب دل میں رس رہا تھا۔ اور اس کے نتائج تکلیف دہ اور عبرت انگیز ہو سکتے ہیں۔

تقریر ختم ہوئی تو سناٹا چھا گیا جیسے فضا کا طوفان یک بیک خاموش ہو جائے، اور پھر بڑے سے بڑا شور بھی ہیچ معلوم ہوا۔

منشی احتشام علی

سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

منشی امتیاز علی مرحوم وزیر اعظم بھوپال کے صاحبزادے تھے کاکوری وطن تھا ۔ لیکن رہتے تھے لکھنؤ میں ، خیال گنج کے ایک خوش منظر ٹیلہ پر ، ایک خوشنما کوٹھی تعمیر کرائی تھی وہی مسکن تھا ، قدیم تہذیب و معاشرت کے علمبردار تھے ۔ وضعداری ان پر ختم تھی سراپا اخلاق و وتپاک ، یکسر مرحمت و شفقت ہمہ انکسار و تواضع لیکن آن پر مر مٹنے والے شان پر لاکھ کا بیکھ کر دینے والے ، بات پر سب کچھ قربان کر دینے والے ۔

یہ ندوہ کے معتمد مال تھے ، نواب حسن علی خاں ناظم تھے ، نواب صاحب سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہتا تھا ۔ انہوں نے اپنے مددگار کی تنخواہ ساٹھ روپیہ کر دی ۔ انہوں نے اپنے مددگار کی طرف دیکھا اور اس کی تنخواہ استی روپیہ کر دی ، وہ دفتر نظامت اپنی کوٹھی میں رکھتے تھے ، یہ اپنا دفتر مال ، اپنی باغ و بہار کوٹھی میں رکھتے تھے ، وہ بجٹ بناتے تھے ، یہ معتمد مال کی حیثیت سے جس مد کو چاہتے تھے ۔ رکھتے تھے ، جسے چاہتے تھے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ، موقع پا کر وہ بھی اپنی سی کر گذرتے تھے ، کبھی وہ رونے لگتے تھے ، کبھی ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں ۔

لیکن اس معاصرانہ چشمک کے باوجود دونوں کے تعلقات قائم تھے ، کاغذ پر جنگ کے گھوڑے دوڑا کرتے تھے ۔ ندوہ کے ہال میں مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں کسی ایک کی کوٹھی پر جب ملاقات ہو جائے ، تو وہ تپاک ، وہ گرم جوشی ، وہ یگانگت اور اپنائیت کہ کہیں سے یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا ، اِن میں اَن بَن ہے ، یہی اصل وضعداری تھی ۔ ملنے جلنے کا جو ڈھنگ ایک مرتبہ پڑ گیا اسے اختلاف اور مخالفت کا کوئی طوفان تہ و بالا نہیں کر سکا ، اختلاف اور چشمک کی منزل جہاں آئی وہاں سے

ہمیں میدان ، ہمیں چوگاں ، ہمیں گوئے !

اور اس جنگ اقتدار کے باوجود ایک دوسرے کے دل میں ایک دوسرے کا احترام بھی نواب صاحب کے سامنے کوئی سازشی، منشی صاحب کے عیب نہیں بیان کر سکتا تھا اور منشی صاحب باہمہ نزاع، کسی کے منہ سے نواب صاحب کی برائی نہیں سُن سکتے: ہماری لڑائی میں دوسرا کیوں دخل دے؟

اس وضعداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر وقت تک یعنی سالہا سال تک دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے رہے۔ اختلاف اپنے حدود میں تھا اور تعاون اپنے حدود میں۔ اس چشمک نے ندوہ کے مفاد کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ندوہ کے لئے دونوں مخلص تھے۔ اور بڑھ چڑھ کر اس کی ترقی اور فروغ کی اسکیموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کا باہمی اختلاف ندوہ پر، اس کے مفاد پر اس کے نظام پر کبھی اثر انداز نہیں ہوا۔

منشی صاحب ندوہ تشریف لا رہے ہیں، وہ دیکھئے، کالے رنگ کی بگھی صدر دروازہ کے پورچ میں آکر رکی، گاڑی کے پیچھے جو ملازم بیٹھا تھا، اس نے اتر کر جلدی سے دروازہ کھولا، اور ادب سے کھڑا ہو گیا، چاندی کے دستہ کی ایک چھڑی کا سہارا لے کر اُدی اچکن پر اُون کا ایک خوبصورت دوشالا اوڑھے منشی صاحب اترے۔ پیچھے پیچھے ایک ملازم ہے جس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک خاصدان ہے اور اس میں بہت سی پان کی گلوریاں رکھی ہوئی ہیں۔ جب وہ گلوری کھانا چاہتے ہیں چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ ملازم ادب سے سامنے آکر خاصدان کا ڈھکنا کھول کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ گلوری لے کر منہ میں رکھتے ہیں اور پھر چلنے لگتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ جس کا جی چاہتا ہے ملے، وہ کہیں بیٹھ کر کسی سے بات نہیں کریں گے۔ ٹہلتے ٹہلتے معائنہ عمارت کا، باغ کا، بورڈنگ کا کرتے جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی دو چار منٹ کے لئے کھڑے ہو جائیں گے اور باتوں کا سلسلہ پوری شفقت اور توجہ کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اب راؤنڈ پورا ہو گیا اور گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ملازم دروازہ کھولے ہوئے پہلے سے کھڑا ہے۔ وہ بسم اللہ کہہ کر اندر بیٹھ گئے۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھائی اور وہ قدیم وضع و شرافت کے اس مجسمہ کو لے کر ہوا ہو گیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی

شاندار ظاہر اور شاندار باطن کا شاندار اجتماع

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا شمار ہندوستان کے ان اکابر میں ہے، جو دولت وثروت کے اعتبار سے بھی ممتاز ہیں اور علم وفضل کے اعتبار سے بھی مایۂ فخر و ناز ہیں ان کی علمی منزلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شبلی سا بلند پایہ عالم اور نقد بھی ان کا لوہا مانتا تھا اور ابوالکلام جیسا خود بیں بھی۔ زنداں کی چار دیواری سے اگر کسی تک اپنے افکار دماغی اور لطائف علمی پہنچانے کے لئے مضطرب ہوتا ہے تو وہ مولانا شروانی ہی کی ذات ہے۔ دارالمصنفین کے شیوخ والا مقام کی جبین عقیدت بھی اگر کسی کے آگے جھکتی ہے تو وہ مولانا شروانی ہیں مسلم یونیورسٹی کے کورٹ میں اگر مذہبی اور دینی حیثیت سے کسی کا قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ مولانا شروانی ہیں دولت وثروت کے لحاظ سے کتنے ایسے لوگ علی گڑھ ہی میں مل جائیں گے جو مولانا شروانی پر تفوق رکھتے ہیں۔ علم وفضل کے اعتبار سے بھی ہندوستان میں متعدد ہستیاں ایسی ہیں جو مولانا پر فضیلت رکھتی ہیں لیکن علم اور دولت کا اجتماع جس کمال کے ساتھ مولانا شروانی کی ذات ستودہ صفات میں ہے مشکل سے کہیں اور ملے گا۔

مولانا شروانی کی ہر چیز میں بانکپن ہے۔ تقریر میں، اندازِ گفتگو میں، وضع معاشرت میں، قد وقامت میں، لباس اور پوشش میں، اک ایسا بانکپن جلوہ آرا رہتا ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

حیدر آباد دکن میں مولانا صدر الصدور امور مذہبی کے منصب جلیلہ پر فائز تھے، ایک بار وہ لکھنؤ تشریف لائے، سید صاحب نے طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے انہیں مدعو کیا، مولانا کی تشریف آوری سے کچھ پیشتر سید صاحب طلبہ کو خاص طور پر مؤدب رہنے کی تلقین فرما رہے تھے۔ میں اگرچہ ایک چھوٹا سا طالب علم تھا، مگر مجھے امارت کا یہ شکوہ اور اس کی نیاز مندانہ پذیرائی کچھ پسند نہ آئی۔ اتنے میں مولانا ایک ریشمی صافہ باندھے نہایت اعلیٰ

درجہ کے اچکنے کی شیروانی زیب تن کئے بانکپن کی تمام اداؤں کے ساتھ خراماں اور جولاں نظر آتے۔ طبیعت خوش ہو گئی کہ یہ اہتمام جس شخص کے لئے ہو رہا تھا، وہ اپنی وجاہت اور دبدبہ کے اعتبار سے اس کا مستحق بھی تھا۔

ندوہ کے ہال میں طلبہ اور اساتذہ کا اجتماع ہوا۔ اور مولانا تقریر کے لئے کھڑے ہوئے انہوں نے طلب علم کے راستہ میں علمائے سلف کے ذوق و شوق، ایثار و قربانی، راحت بیزاری اور اذیت طلبی کی جو داستانیں بیان کیں ان کی معنویت، افادیت، اہمیت اور دلچسپی کی یہ کیفیت تھی کہ جی چاہتا تھا۔ یہ تقریر اسی طرح جاری رہے۔ وقت کی رفتار رک جائے اور مولانا کی جادو بیانی کا سلسلہ قائم رہے۔ تقریر ختم ہوئی تو طلبہ اور اساتذہ دونوں کا تاثر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

ندوہ کا شاندار ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، سالانہ جلسہ کی کارروائی جاری تھی، مولانا شروانی کرسی صدارت پر رونق افروز تھے، علماء و اتقیا صلحا و صوفیا رہنمایانِ ملت اور خادمانِ قوم کا ایک معتبر اور پاکیزہ اجتماع تھا۔ مولانا محمد علی نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن نہ آسکے تھے۔ مولانا شوکت علی تشریف لائے تھے اور اپنی مستانہ قلندرانہ اداؤں کے ساتھ ایک کرسی پر پہلی صف میں، مرکز صاحب نظراں بنے بیٹھے تھے۔

اتنے میں صدر کی طرف سے مولانا شوکت علی تقریر کے لئے طلب کئے گئے وہ اپنی بڑی اور مطول عبا کے دامن کو سمیٹتے ہوئے اپنی خوبصورت سیاہ ٹوپی کو ترچھے انداز میں سنبھالتے ہوئے آبنوس کی سیاہ چھڑی کے نقرئی دستے کا سہارا لیتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے اور تقریر شروع کر دی۔

تقریر کا موضوع تھا "ندوہ کی اعانت کے لئے قوم سے اپیل" اس موضوع پر مختصر اور جامع الفاظ میں اظہار خیال کر کے اور فراہمی سرمایہ کے سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کر کے انہوں نے وقت کے سیاسی امور پر اظہار خیال شروع کر دیا۔ وہ ایک مضطرب اور بے چین طبیعت رکھتے تھے، بہت زیادہ مخلص اور کھرے تھے، کسی قسم کا مجمع ہو، دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی تھی، ندوہ کے عمائدین کی بہت بڑی تعداد سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھتی تھی۔ منشی احتشام علی صاحب نے بے بسی کے ساتھ نواب علی حسن خاں کو دیکھا انہوں نے بے کسی کے ساتھ صدر کی طرف دیکھا مولانا شیروانی فوراً کھڑے ہوئے اور

انہوں نے شوکت صاحب سے استدعا کی کہ وہ موضوع کے اندر رہیں اس سے تجاوز نہ کریں۔ انہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے، اس استدعا کے جواب میں انہوں نے تقریر ختم کر دی اور اپنی جگہ پر آکر متمکن ہو گئے۔

مولانا شروانی کا یہ طرز عمل بہت سے لوگوں کو بُرا لگا تھا اور ان میں میں بھی تھا۔ لیکن ان کی اخلاقی جرأت کی اب قدر ہوتی ہے، شوکت جیسے شخص کو ٹوکنا آسان نہ تھا

نواب صاحب چھتاری

خاموش لیکن مخلص رہنمائے قوم

نواب احمد سعید خان آف چھتاری کا شمار ملک کے شریف ترین، با اصول اور وضعدار انسانوں میں ہوتا ہے، وہ عنفوان شباب سے ترقی کے زینوں پر قدم رکھ رہے ہیں، اور اب تک چڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں، مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعد یوپی کے ہوم ممبر بنے، مہاراجہ بھی بڑی خوبیوں کے مالک تھے، لیکن ان کی ہوم ممبری کے زمانہ میں پولیس کے انگریز عہدہ دار نہ ہندوستانی ہوم ممبر کو سلامی دیتے تھے، نہ اس کے حضور میں حاضر ہوتے تھے، لیکن نواب صاحب چھتاری نے یہ رسم کہن بدل دی اور فرمایا، اگر اب ایسا ہوا تو پروانہ برطرفی ایسے ارکان کے استقبال کیلئے موجود ہے، یہ تہدید کام کر گئی، اور ہندوستانی ہوم ممبر آقایان سفید فام کا صحیح معنی میں افسر اعلیٰ بن گیا۔

لارڈ ستھا کے بعد نواب صاحب چھتاری پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں کئی بار عارضی اور مستقل طور پر یوپی کی گورنری کے منصب پر فائز ہونے کا موقع ملا لیکن ہوم ممبری سے لے کر گورنری کے دور ارتقاء تک، ان کی وضع درویشی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ نماز کے سختی کے ساتھ پابند ہیں حافظ قرآن ہیں، اور ہر سال پابندی کے ساتھ تراویح سناتے ہیں جس شان، اہتمام اور خوبی کے ساتھ گورنری کے زمانہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں جاری رہا، ذرا تصور کیجئے، گورنمنٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں نماز با جماعت ہو رہی ہے، رات کے گیارہ گیارہ بجے تک تراویح کا سلسلہ جاری ہے، پچھلے پہر سحری کا انتظام ہو رہا ہے، اور علی الصباح نماز فجر کے لئے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا جانفزا نعرہ لگایا جا رہا ہے، گورنمنٹ ہاؤس کے ساکنان گراں گوش محو حیرت ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے، لیکن کچھ کر نہیں

سکتے، کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود گورنر کر رہا ہے۔

نواب صاحب گورنر کے منصب پر فائز تھے، جب ندوہ کی مسجد کی تعمیر کا سوال اٹھا، انہوں نے جیب خاص سے کچھ رقم دی اور اپنے دست مبارک سے سنگ بنیاد رکھا، میں دہلی میں تھا، وہیں میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی مجھے دھچکا سا لگا، کہ خانہ خدا کے سنگ بنیاد کیلئے کسی زاہد اور متقی انسان کا انتخاب ہونا چاہئے تھا نہ کہ ایک گورنر کا۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں اس مسجد کا افتتاح ہوا، طے یہ ہوا کہ نواب صاحب چھتاری قرآت کر کے مسجد کا افتتاح کریں، اور نواب حبیب الرحمن خاں شروانی پہلی نماز جمعہ پڑھائیں، اس تقریب میں شرکت کے لئے، میں بھی دہلی سے لکھنؤ آیا، ندوہ میں اچھی خاصی جشن کی کیفیت تھی، وقت مقررہ پر نواب صاحب تشریف لائے، طلبہ اساتذہ، ارکان انتظامی اور عمائدین شہر کی طرف سے ندوہ کے وسیع ہال میں نواب صاحب کا پرتپاک استقبال کیا گیا، مجمع یہیں سے جلوس کی صورت میں مسجد کی طرف چلا، مسجد کے دروازہ پر پہنچ کر نواب صاحب نے سوز و گداز کے ساتھ آیاتِ کریمہ کی تلاوت شروع کی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے کیف و تاثر کا یہ عالم تھا کہ آیات کریمہ سن رہے تھے اور رو رہے تھے حاضرین پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا، ہر شخص ایک کیف کے عالم میں نظر آرہا تھا۔

مجھے سب سے پہلی مرتبہ نواب صاحب کو یہیں دیکھنے کا موقع ملا، اور میں ان کی اسلامی سادگی سے بہت متاثر ہوا۔

بلند و بالا قد، قیصر ولیم کی طرح شاندار مونچھیں، سر کی ایک طرح دار شیروانی چوڑی دار پائجامہ، تواضع اور اخلاق کی ایک دلآویز تصویر معلوم ہوتا تھا، آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔

انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد یو۔پی کے پہلے وزیر اعظم نواب صاحب چھتاری تھے، پھر جب کانگرس نے عنانِ وزارت سنبھالنے پر آمادگی ظاہر کی تو مستعفی ہو گئے، بعد میں ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم بنائے گئے، اور پانچ سال تک اس گراں بار ذمہ داری کو خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے، وہاں سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ پہنچے تو مسلم لیگ ترک خطابات کی مہم شروع کر چکی تھی، نواب صاحب نے بے جھجک اپنا سر کا خطاب اور دوسرے خطابات واپس کر دیئے، ابھی چند روز ہوئے ٹائمز آف انڈیا

کی گورنمنٹ نیوز ہیں میں نے پڑھا، "آج ہزاکسی لینسی وائسرائے نے نواب محمد احمد سعید خاں کو شرف ملاقات بخشا، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ نواب کے قومی خطاب کے علاوہ وہ تمام سرکاری خطابات سے دستبردار ہو چکے تھے، نہ سر، نہ اے سے زیڈ تک کے بے معنی الفاظ۔

نواب علی حسن خاں

خانوادۂ علم و فضل کا ایک گوہرِ آب دار

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی لکھنو تشریف لائے اور حسبِ معمول بھوپال ہاؤس لال باغ یعنی نواب علی حسن خان کے دولت کدہ پر مقیم ہوئے ہیں اگرچہ ندوہ کا طالب علم تھا۔ لیکن سید صاحب سے کافی رسم و راہ ہو چکی تھی، اور جب وہ لکھنو آتے تھے تو میں ان سے ملنے ان کی قیامگاہ پر جایا کرتا تھا۔ سید صاحب نے حسبِ معمول ایک باوقار لیکن دل افروز تبسم کے ساتھ پذیرائی کی، اور میں ذرا احتیاط کے ساتھ اُن کے پاس بیٹھ گیا، احتیاط اس لئے کہ سید صاحب کے تبسم کا مفہوم سمجھنا کچھ آسان نہیں تھا، جس طرح ایک ننھا بچہ کلکاریاں مارتے مسکراتے ہنستے ہنستے دفعتہ رونے لگتا ہے، اسی طرح سید صاحب کا تبسم دفعتہ زہر خند بن جاتا تھا، اور پھر آنکھوں سے قہر و عتاب کی بجلیاں برسنے لگتی تھیں، لیکن

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا!

تو میں وضع احتیاط کے ساتھ بیٹھا ہوا سید صاحب کے تبسم کی روشنی میں موضوعِ گفتگو تلاش کر رہا تھا کہ انہوں نے اپنے تبسم کو اور زیادہ وسعت دے کر پوچھا خیر راہ میں "مومن کی شاعری" پر تم نے جو مضمون لکھا ہے، مجھے بھی بہت پسند آیا، اور نواب صاحب بھی اسے پڑھ کر بہت خوش ہوئے!" خیر راہ ایک رسالہ تھا جو طالب علمی کے زمانہ میں ہمارے عزیز ہم درس حامد علی ندوی نے نکالا تھا اب دل کو اطمینان ہوا کہ تبسم کی رفتار ٹھیک جا رہی ہے، اور خطرہ سے باہر ہے۔

تھوڑی دیر میں چائے کا وقت ہو گیا، اور نواب صاحب کی طرف سے سید صاحب کی طلبی ہوئی، وہ اُٹھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اب میں ایک پُر تکلف ایوان میں

تھا، صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور نواب صاحب سید صاحب کے انتظار میں چشم براہ
تھے، سید صاحب نے میرا تعارف کرایا، یہی رئیس احمد ہیں، جن کے مضمون
کی آپ تعریف فرما رہے تھے، نواب صاحب نے بہت تپاک سے مصافحہ کیا،
اور خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

دیوار پر ایک شاندار روغنی تصویر ایک شاندار فریم میں آویزاں تھی، سرخ و
سپید رنگ، وجیہہ اور بارعب چہرہ، جبین وجمیل نقش ونگار، ہاتھ میں تلوار، آنکھوں
میں چمک، وضع میں شاہانہ رکھ رکھاؤ، اور دبدبہ، یہ تصویر تھی نواب صدیق حسن خاں
کی، جو متوسط گھرانے کے ایک شریف فرد تھے، دولت علم سے مالامال تھے، لیکن
دولت دنیا سے محروم تھے، قسمت آزمائی کیلئے بھوپال پہنچے، وہاں نواب شاہجہاں بیگم
فرمانروائے بھوپال کی نظر انتخاب میں کھب گئے، اور ان کے ساتھ شادی ہو گئی، نواب
بن گئے، دولت گھر کی کنیز بن گئی، علم اور توسیع علم پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے لگے
نواب صدیق حسن خاں کی پہلی بیوی کے بطن سے دو فرزند تھے، نورالحسن خاں
اور علی حسن خاں، اس وقت ایوان زرنگار میں نواب علی حسن خاں متمکن تھے، لیکن باپ
اور بیٹے کی صورت میں کتنا بعد المشرقین تھا، بیٹا کم روئی میں گاندھی جی کا ہم شبیہہ، اور باپ
حسن وجمال میں یوسف وقت، نواب علی حسن خاں نے حسن صورت تو بلاشبہ باپ سے
ورثہ میں نہیں پایا تھا، لیکن دولت وثروت کے علاوہ دولت اخلاق، دولت کردار، دولت
علم، دولت معرفت اور دولت شفقت وکرم کے خزینے ورثے میں ملے تھے، اور وہ ان
کا برمحل اور باموقع استعمال بھی کرتے رہتے تھے۔

ندوہ کی نظامت نواب صاحب نے بڑے اصرار سے قبول کی تھی، اور ایسے زمانہ
میں قبول کی تھی کہ ندوہ کی کشتی کو گردابوں سے بچاتے، طوفانوں سے ٹکراتے ساحل
تک لے ہی آئے، وہ جب تک ندوہ میں رہے ندوہ پر بڑے بڑے کڑے وقت
آئے، لیکن آسانی کے ساتھ گزر گئے، انہوں نے اپنے دور نظامت میں ندوہ میں
اسلامی ہند کے مشہور اور یکتائے روزگار علماء جمع کر لئے تھے، شیخ الحدیث مولانا حیدر
حسن خاں، شیخ التفسیر مولانا عبدالحلیم صدیقی، امام فلسفہ ومنطق مولانا عبدالودود ندوی،
ادب عربی کے یکتائے زمانہ فاضل، مولانا محمد یوسف ندوی، مولانا سید علی زینبی ماہر علم

ہیئت شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ یہ بزرگ یا تو نواب صاحب کے بلائے ہوئے آئے یا نواب صاحب نے اس مان سے انہیں رکھا کہ کہیں اور جانے کا انہیں خیال بھی نہ آیا، لیکن نواب صاحب کے بعد یہ شیرازہ علمی منتشر ہوگیا۔

نواب صاحب بڑے جزرس آدمی تھے، بخیل نہیں، وہ موقع پر بے دریغ صرف کرتے تھے، لیکن بے موقع ایک پائی بھی صرف کرنا نہیں چاہتے تھے، اصرار اور التجا پر بھی نہیں، با اصول بھی بہت تھے، ندوہ کو اپنا قیمتی وقت دیتے تھے، پھر ندوہ کو کیا حق تھا کہ ان کی جیب پر للچائی ہوئی نظر ڈالے ؟

سنہ ۳۳ء کی اسٹرائک کا "قائد اعظم" میں تھا، نواب صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے، بہت شفقت کرتے تھے، میری بہت سی لغزشیں نظر انداز کر چکے تھے، لیکن یہ صدمہ انہیں ایسا پہنچا کہ نہ اسے بھول سکے نہ معاف کر سکے، ادیل بلگرامی سے انہوں نے شکایت کی کہ سب سے زیادہ صدمہ مجھے یہ ہے کہ اس اسٹرائک کی لیڈری رئیس نے کی، انہوں نے مجھ سے کہا چلو میں خطا معاف کرا دوں، میں نے کہا کل آؤں گا، اور پھر نہیں گیا، نواب صاحب کی عزت اور عظمت کے باوجود، اس معاملہ میں ان سے "خطا" معاف کرانا نہیں چاہتا تھا، اور شفقت و محبت کے باوجود وہ بھی اس معاملہ میں میرے ساتھ رعایت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسٹرائک کے اختتام کے بعد جب طلبہ کے داخلہ کا سوال پیدا ہوا تو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی جیسے با اثر رکن انتظامی معتمد تعلیمات اور عزیز دوست اور محبوب رفیق کے فیصلہ کو انہوں نے منسوخ کر دیا، سید صاحب نے بہ حیثیت معتمد تعلیمات میرے داخلہ کے احکام صادر کر دیے تھے اور مطمئن ہو کر اعظم گڑھ چلے گئے تھے، ان کے جانے کے بعد پروفیسر عبد الباری کے مشورہ کے مطابق پہلا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ سید صاحب کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔

نواب صاحب کی آخری زندگی بڑے کرب میں گزری، بہت بڑے علاقے کے مالک تھے، بمبئی میں بہت سے عالیشان مکانات تھے جو کرایہ پر چلتے تھے، لیکن بد انتظامی کا یہ عالم تھا کہ عمارتیں فروخت ہو رہی تھیں اور جائداد مقروض ہو رہی تھی، حالانکہ صاحب اولاد تھے، اور اولاد سعید صالح اور تعلیم یافتہ تھی، ایک صاحبزادے بی اے، ایل ایل بی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اولاد صالح اور سعید کی موجودگی میں کورٹ آف وارڈس کے حوالہ کرنی پڑی، لیکن حالات پھر بھی کچھ بہت زیادہ نہ سنبھل سکے۔

ڈاکٹر عبدالحمید خواجہ

"ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر"

علی گڑھ کے گریجوایٹ ہیں، کچھ دنوں جامعہ ملیہ میں رہے، پھر برلن چلے گئے وہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر آئے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے علی گڑھ میں ہم سبق رہ چکے ہیں۔

برلن سے واپسی کے بعد کچھ روز وطن میں قسمت آزمائی کی، پھر بمبئی آئے اور قوت مردمی کی مشہور دوا "اوکاشا" کے ایجنٹ بن گئے، یہ اوکاشا کا زور تھا یا ان کی قسمت، بہرحال چلی، اور بہت زیادہ چلی، دوا کی افادیت کے بارے میں تو وہی رائے دے سکتے ہیں جنہوں نے اسے استعمال کیا ہو، لیکن انہوں نے اپنے پروپیگنڈے کے زور سے اوکاشا کا اشتہار، پڑھنے والی ہر آنکھ تک پہنچا دیا، استعمال کرنے والوں کی کیا رائے ہے! یہ نہیں معلوم، یہ معلوم ہے کہ ان کے لئے واقعی دوا پارسل ثابت ہوئی، جب اوکاشا کا زور گھٹنے لگا، تو انہوں نے عطاری کا کارخانہ کھول کر، انگریزی دوائیں بنانا شروع کر دیں، قسمت اب بھی زوروں پر تھی، لڑائی چھڑ گئی، اور باہر کی دواؤں کا آنا یکسر بند ہو گیا، ان کا عطار خانہ خوب چمکا، اور بہت آگے نکل گیا۔

جب تک ان کی اوکاشا ترقی کر رہی تھی، انہوں نے جامعہ کو بھی بہت کچھ دیا، اور دوسرے تعلیمی اداروں کی بھی جی کھول کر مدد کی لیکن جب ترقی کی رفتار انتہا کو پہنچ گئی اور انہوں نے دوسرے منفعت بخش مشغلے بھی اختیار کر لیے تو ان میں امساک پیدا ہو گیا، اب نہ جامعہ پر وہ نظر عنایت ہے، نہ دوسرے تعلیمی اداروں پر۔

سنہ ۳۷ء میں جب کانگرس نے وزارت پر ہاتھ ڈالا، اور ان کے دوست نوری

صاحب دفعتاً وزیر بن گئے، تو اُنہوں نے سوچا، یقیناً کانگرس کوئی بڑی اچھی چیز ہے جو وزیر تک بنا دیتی ہے، لہٰذا بغیر کھدر پہنے ہوئے، اور بغیر جیل گئے ہوئے کانگرس کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے، وضعداری کا یہ عالم ہے کہ کانگرس سے اگرچہ شیفتگی روز بروز بڑھ رہی ہے، لیکن جسم نازک کھدر سے اب تک آشنا نہیں ہوا، اور تن سیمیں جیل کی کوٹھری میں اب تک بند نہیں ہوا، حالانکہ ۳۷ء کو چھوڑیے ۴۲ء سے ۴۷ء تک تو جیل خانے کی پوری فصل بہار گزر گئی۔

ایک مرتبہ آپ مولانا شوکت علی کو سمجھانے خلافت ہاؤس تشریف لائے تھے کہ وہ مسلم لیگ سے قطع تعلق کر لیں، اور کانگرس میں شریک ہو جائیں شوکت صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری، پھر مسکراتے، پھر فرمایا:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

کانگرس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت میں کچھ دنوں تک بیانات دینے کا شوق بھی رہا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک بیان سخت قسم کا دے ڈالا، مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں نے خلافت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا، جس کا عنوان تھا "اوکاسا کا زور" یہ مضمون پڑھ کر اتنے خفا ہوتے، کہ خلافت کا اشتہار بند کر دیا۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!

حاجی غلام محمد خاں شروانی

مسند امارت، اور بوریۂ فقر کا اجتماع

شیر کا سا بارعب چہرہ، ہرن کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، دوہرا بدن، داڑھی کے بال کچھ سیاہ زیادہ تر سفید، مضبوط اور متناسب اعضا، ہاتھ کا ایک انگوٹھا شوقِ شکار کے سلسلہ میں بندوق کی نذر چہرہ پر جلال شہریاری بھی اور جمال دلربائی بھی، مزاج میں بانکپن، عادتوں میں رئیسانہ ترنگ، باتوں میں

گاہے بہ سلامے بر نجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند

کی شان، حکام والامقام کے دوست، گورنران عالی شان کے میزبان، لکھ پتی لیکن فقیر، فقیر لیکن حاتم دوراں یہ تھے دادوں (علی گڑھ) کے مشہور رئیس نواب بہادر حاجی غلام محمد خاں!

ایک مرتبہ "ہجرت" کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد واپس آگئے، مضطر خیرآبادی، ان کے دوست تھے، انہوں نے اپنی مشہور غزل!

کیوں جا کے چلے آئے دربار محمدؐ سے!

انہی پر کہی تھی، پھر خیرآباد کے مشہور صاحب طریقت بزرگ حاجی اسلم شاہؒ کے مرید ہوئے اور مرشد سے عقیدت، یہاں تک بڑھی کہ دادوں کا علاقہ چھوڑ علیگڑھ کی رنگینیوں سے منہ موڑ، خیرآباد آتے، اور یہیں بس گئے، اور "مہاجر خیرآباد" کہلانے لگے، اور آخر وقت تک اسی وضع پر قائم رہے۔

خیرآباد میں ایک مکان خرید لیا تھا، جائیداد اپنے خویش کے حوالہ کر دی تھی اپنے لئے گزارہ کی ایک رقم مقرر کر لی تھی، جس کا بڑا حصہ قوالوں اور مصاحبوں پر صرف ہوتا تھا۔

بزرگوں کے عرسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، قوالیاں بھی بڑی توجہ اور اہتمام سے سنتے تھے، حال زیادہ تر اپنے قوال کی چوکی پر آتا تھا، اور جب آتا تھا تو واقعی وہ بے حال ہو جاتے تھے، گھڑی، انگوٹھی، واسکٹ کرتا، ٹوپی، ہر چیز نذر کر دیتے تھے۔

ایک قوال زادے کو تربیت دے کر اپنے ڈھب کا بنایا تھا، اپنی پسندیدہ قوالیوں کے علاوہ اپنے کلام کا بڑا حصہ بھی اسے "برزبان" یاد کرادیا تھا، اپنا کلام خود کم سناتے تھے۔ فوراً آدمی بھیج کر اسے بلاتے تھے اور مطلع کا پہلا مصرعہ بتا کر اشارہ کرتے تھے کہ سناؤ، اور وہ لہرا لہرا کر سنانا شروع کر دیتا تھا، کچھ کلام کا اثر، کچھ ترنم کا اثر، کچھ حاجی صاحب کی شخصیت کا اثر، ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ داد حاصل کرتے تھے۔ اور بہت محظوظ ہوتے تھے، اپنے قوال سے بہت محبت کرتے تھے، اس کا بڑا مان رکھتے تھے، بے طرح نوازتے تھے۔ کئی سو روپیہ ماہوار اس کی تنخواہ تھی، اس کے علاوہ عطایا اور بخشش اور انعام کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، ایک مختصر مدت میں مالی اعتبار سے بہت بڑھ گیا، لیکن اس کا کیرکٹر بھی قابلِ داد ہے، حاجی صاحب کی طرف سے ان سرفرازیوں کے باوجود اس نے ان کی جناب میں اپنی وضع ہمیشہ قائم رکھی اور

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ!

کی منزل سے کبھی آشنا نہ ہو سکا، شاید اس لئے کہ وہ با ہمہ مرحمت و شفقت اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، انہوں نے ویانا، لندن، سوئٹزرلینڈ، حجاز مقدس ممالک عربیہ دول اسلامیہ کی سیاحت کی اس سفر میں بھی ان کا قوال ان کے ساتھ رہا۔

شاعروں سے بڑی دلچسپی تھی، اکثر اپنے گھر پر بڑے اہتمام سے کافی رقم خرچ کر کے مشاعرے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک نواب جعفر علیخاں اثر سیتاپور میں ڈپٹی کمشنر کے منصب پر فائز رہے وہ اکثر خیرآباد آتے رہتے۔ اور ان کی تشریف آوری بزمِ سخن میں ایک نئی رونق اور دلچسپی پیدا کر دیتی۔

روپیہ جی کھول کر خرچ کرتے تھے، لیکن ان کی بخشش استحقاق کو نہیں دیکھتی تھی، صرف میلان و رجحان کی پابند تھی، جس کی طرف میلان ہوگا اس کی جیب سیم و زر سے بھر دیں گے، جو نگاہ توجہ سے محروم ہے، وہ صرف حسنِ اخلاق کی دولت سے نوازا جاتا تھا، یہ بھی ایک ادا تھی۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست!

مجموعی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ دل کے مرض میں مبتلا ہوئے گھر سے اٹھ کر مرشد کی خانقاہ میں چلے آئے۔ لوگ تسلّی دیتے، زندگی کی امید دلاتے، لیکن وہ جانتے تھے وقت آگیا ہے، لہٰذا رختِ سفر باندھ کر مطمئن ہو بیٹھے تھے، اور آخر ایک روز اسی خانقاہ میں روح پرواز کر گئی اور مرشد کے پہلو میں دفن ہوئے!

سر فضل ابراہیم رحمت اللہ

ایک دلچسپ اور کارگزار شخصیت

سر ابراہیم رحمت اللہ کے فرزند ارجمند ہیں، بمبئی کے سرمایہ داروں کی صف اول میں شریک ہیں، آغا خانی خوجہ ہیں، بمبئی میں کمبالا ہل پر ایک نہایت خوشنما اور شاندار آبائی محل کے مالک ہیں لیکن اس سے بھائیوں کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں، بال بچوں کو پونہ چھاؤنی کی ایک پُرفضا کوٹھی میں رکھتے ہیں، خود تاج محل ہوٹل کے مستقل مکین ہیں، ہر سنیچر کی دوپہر کو پونہ چلے جاتے ہیں، اور ہر دوشنبہ کی دوپہر کو بمبئی آجاتے ہیں، کسی کے ملازم نہیں ہیں، خدا کا دیا بہت کچھ ہے، لیکن اس پابندی سے دفتر کی حاضری دیتے ہیں، کہ شاید دفتر کا چپراسی بھی اس مستعدی پر رشک کرتا ہوگا وقت کے بڑے پابند ہیں۔ ویسٹ اینڈ یا فیور لوبا کی گھڑی کی طرح چلتے ہیں، آپ کو پانچ بجے کا وقت دیں اور آپ سوا پانچ بجے پہنچیں تو نہیں ملیں گے اور ٹھیک وقت پر پہنچ جائیے تو دروازہ پر استقبال کرتے ہوئے نظر آئیں گے، خاندانی تجارت کے علاوہ ذاتی مشاغل کی فہرست بہت لمبی ہے، حکام سے ملاقات، دفتر کی حاضری، تجار سے تبادلہ خیالات، نیشنل وار فرنٹ کی خود اختیاری ذمہ داریاں نیم سیاسی جلسوں میں شرکت، سوشل اجتماعات میں حاضری، یہ سب چیزیں ان کی "ضروریاتِ زندگی" میں داخل ہیں چونکہ وقت کے بے حد پابند ہیں اس لئے ہر جگہ پہنچتے ہیں اور ہر کام بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔

میری ان کی پہلی ملاقات پونہ میں ہوئی تھی، سنہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے، اس وقت یہ سر آغا خاں کے فنانشل کمشنر تھے، شوکت صاحب نے مجھے اور مولانا عرفان کو ان کے پاس بھیجا تھا، کیونکہ آغا خان نے خلافت کو ایک رقم دے تو دی تھی، لیکن وہ ابھی تک فنانشل کمشنر صاحب کی تحویل میں تھی، اور انہیں فرصت نہیں تھی کہ از خود توجہ کرتے۔

ہم لوگ، صبح تڑکے پونہ پہنچے، جاڑوں کا زمانہ تھا، دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی فوراً ان کے

در دولت پر پہنچے، یہ اس وقت ناشتہ سے فارغ ہوکر، باہر جانے کے لیے گھر سے نکل چکے تھے مولانا عرفان نے پہلے ان سے ناشتہ کا مطالبہ کیا، اور پھر انہی کے مصارف پر ایک ٹیکسی کا مطالبہ کیا تاکہ ذرا "پونہ" کی سیر کرلیں، انہوں نے فوراً ناشتہ کا انتظام کیا، ناشتہ کے دوران میں مطلب کی بات چیت ہوئی پھر ہمیں یہ ٹیکسی دے کر بمبئی چلے آتے، اور ہم دن بھر اسے رگیدتے رہے۔ پونہ کی کوئی قابل دید چیز ہم نے نہیں چھوڑی۔

دوسری مرتبہ ۱۹۴۳ء میں کیپٹن مجید خاں، ہز ہائی نس آغا خاں کے اسٹیٹ منیجر کے توسط سے میری ان کی ملاقات تاج محل ہوٹل میں ہوئی، کم و بیش ایک گھنٹے تک میری نشست ان کے کمرہ میں رہی اور میں نے دیکھا یہ ایک چھوٹی سی ڈائری لیتے ہوئے بیٹھے ہیں، اور اس کے مطابق حاضرین سے باتیں بھی کر رہے، جو آنے والے ہیں، ان کا انتظار بھی کر رہے ہیں، جن سے ٹیلیفون پر گفتگو کرنی ہے، ان سے ٹیلیفون پر مصروف رہتے ہیں، بظاہر یہ مشکل کام معلوم ہوتا ہے، کہ ایک آدمی ایک وقت اتنے سارے کام کرلے، لیکن جنھیں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے وہ تصدیق کریں گے، کہ بیک وقت اس سے بھی زیادہ کام کرسکتے ہیں۔

چھوٹا سا قد، کھلتا ہوا رنگ، خود بہرے نہیں ہیں لیکن دوسروں کو بہرا سمجھتے ہیں، یہ اگر سرگوشی میں بھی بات کریں گے تو وہ آلہ مکبر الصوت کا کام دے گی، خیالات کے اعتبار سے مسلم لیگ کے بڑے حامی ہیں، میں نے ایک روز کہا آپ مسلم لیگ میں شریک کیوں نہیں ہو جاتے؟ زور سے پوچھا "کیا رائے ہے شریک ہو جاؤں؟" میں سمجھا یہ واقعی تیار ہیں، میں نے کہا ضرور! کہنے لگے ابھی نہیں کچھ دنوں بعد کچھ روز بعد انہیں "سر" کا خطاب مل گیا، اور اب خطاب یافتوں کے لیے مسلم لیگ کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لہٰذا اگر یہ مسلم لیگ سے باہر ہیں تو خطا ان کی نہیں مسلم لیگ کی ہے!

حاجی موسیٰ خاں شروانی

ایک یادگار اور تاریخی ملاقات

جاڑے کا موسم شباب پر تھا، اس سال معمول سے زیادہ سردی پڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا مودا نے اسی سال کے لیے پیشین گوئی کی تھی۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

میں لکھنؤ سے دہلی جا رہا تھا، دہلی سے بمبئی کا قصد تھا۔ پچھلے پہر کو گاڑی علیگڑھ کے اسٹیشن پر رکی، ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن طبیعت کو آمادہ کیا، اور اترا۔ میرے عزیز ترین دوست محب اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی تکمیل کر رہے تھے، لیکن اترنے کے بعد سوال پیدا ہوا۔ اب کیا کیا جائے ۲-۳ بجے صبح کا وقت۔ اس وقت، اس سردی میں یونیورسٹی کے وسیع علاقہ کا طواف کرنا۔ محب اللہ صاحب کو ڈھونڈنا ناممکنات سے تھا، میں نے طے کیا کہ سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں یہ وقت گزارا جائے پھر جب دھوپ نکل آئے تب یونیورسٹی کی نوآبادی کا رخ کیا جائے، میں آیا، اور ایک آرام کرسی پر اوڑھ لپیٹ کے لیٹ گیا، کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی ملازم مسافروں کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھا، میں نے اسے چائے کی ایک پیالی لانے کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر میں کمرہ کے اندر کسی کے "لاؤ لشکر" اور خدم وحشم کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند مہذب اور باسلیقہ ملازمین۔ بہت سا سامان، اتنا زیادہ کہ وہ تقریباً ویٹنگ روم کو محیط ہو گیا، اتنے میں ایک ضعیف شخص روئی کے ایک لبادہ میں لپٹے ہوئے روئی کا پاجامہ پہنے، روئی کا ایک کنٹوپ اوڑھے ہوتے ہاتھوں میں دستانے اور پاؤں میں پاتابے گھٹنوں تک چڑھائے تشریف لاتے اور دروازہ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے، بوڑھے بھی تھے اور کمزور بھی تھے لیکن آواز میں توانائی بھی تھی، اور گرج بھی، معلوم ہوا، اس لاؤ لشکر اور خدم وحشم

کا تعلق انہی بزرگ سے ہے۔

فوراً پانی گرم کیا گیا، آفتابہ حاضر کیا گیا، اور انہیں وضو کرایا گیا، اس سردی میں گرم پانی سے بھی وضو کرنا بڑی ہمت کا کام تھا۔ انہوں نے نماز پڑھی، کچھ دیر کچھ اور پڑھتے رہے، پھر قرآن شریف کی تلاوت کرسی پر بیٹھ کر کرنے لگے۔ ان سے فارغ ہوئے تو ملازمین کو مختلف قسم کی ہدایتیں دینے لگے، میری طرف مخاطب ہوئے، اور گفتگو شروع ہو گئی۔ بغیر کسی تعارف کے۔ دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ بھی سردی کی وجہ سے رک گئے ہیں، دھوپ نکل آئے تب جائیں گے۔

میں نے نام پوچھا، فرمایا، موسیٰ خاں! میں نے کہا "حاجی موسیٰ خاں شروانی"! فرمایا "جی ہاں" اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہ بزرگ شخصیت ہے، جس نے علیگڑھ کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے، جس نے تحریک خلافت کی پر آشوب تحریک میں مردانہ وار شرکت کی ہے، جو دولت مند ہے علیگڑھ کے بہت بڑے زمینداروں میں سے ایک جس کے اطوار و گفتار پر سچی کھری اور بے لوث مذہبیت کا رنگ غالب ہے اب میری گفتگو میں اور زیادہ گرم جوشی پیدا ہو گئی، علی گڑھ، مسلم لیگ، مسلمان قوم یہ تمام مسائل زیر بحث آئے، دوران گفتگو میں حاجی صاحب کو معلوم ہو گیا تھا، میں خلافت کا ایڈیٹر ہوں، اب دھوپ نکل آئی تھی، میں نے اجازت چاہی، انہوں نے کہا ٹھہریئے، میں ٹھہر گیا، انہوں نے بغیر طلب و تقاضہ کے خلافت کا سالانہ چندہ پیش کیا اور کہا: بمبئی پہنچ کر میرے نام جاری کر دیجئے گا، بمبئی پہنچنے کے بعد میں نے دفتر سے باقاعدہ چندہ کی رسید بھجوا دی اور اخبار جاری کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ میں نے باتصویر خلافت ویکلی نکالا تھا، پرچہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچا اور "انکاری ہے" کے لیبل کے ساتھ واپس آیا، ڈاک میرے ہاتھ میں آتی تھی مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود پرچہ جاری کرایا اور خود واپس کر دیا یہ کیا ماجرا ہے؟ کئی ہفتے تک انکاری ہے، کے ساتھ جب پرچہ واپس آیا تو میں نے خط لکھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے!

فوراً ایک بہت ہی مختصر سا جواب آیا "پرچہ ہرگز نہ بھیجا جائے اس میں تصویریں ہوتی ہیں!"

مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ ابھی تک ایسے اللہ والے مسلمان دنیا میں موجود ہیں جو دنیا کے ساتھ نہیں چلتے، دنیا کو اپنے ساتھ چلانے والی کوشش کرتے ہیں!

کیپٹن مجید خاں

ایک شریف اور بے ریا انسان

مسٹر علی محمد پکلے ایک نومسلم تھے، تحریک خلافت کے زمانہ میں ہندو مت چھوڑ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے، انگریزی بہت اچھی بولتے تھے اور اس سے کہیں زیادہ اچھی لکھتے تھے وہ بمبئی کرانیکل اور "ہندو" مدراس میں بھی کام کر چکے تھے، لیکن اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اسلام کی تاریخ انگریزی میں لکھنے کا سامان کر رہے تھے، ابھی حال میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی خدمتِ اسلام کی آرزوئیں بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئیں خدا ان کی مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، انہوں نے انگریزی زبان میں آغا خان اور ان کے مسلک پر بھی کچھ کتابیں "حسب فرمائش" لکھی تھیں اور اس محنت کا انہیں کافی صلا ملا تھا۔

ایک روز ایک مشترک دوست کے ساتھ وہ میرے پریس میں تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ آغا خان کے بارے میں میں اپنی فلاں کتاب کا اردو میں ترجمہ کرانا چاہتا ہوں کیا آپ سے اس کام میں کچھ مدد مل سکے گی؟ میں نے وعدہ کر لیا اور ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔

جب کتاب کا ترجمہ مکمل ہو گیا تو انہوں نے چاہا کہ وہ جلد از جلد چھپ جائے، زور دیا کہ میں اسے اپنے پریس میں چھاپوں، میں راضی ہو گیا، ترجمہ اور طباعت کا یہ کام موصوف آغا خان کے اسٹیٹ منیجر کیپٹن مجید خان کے حسب ہدایت انجام دے رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ کیپٹن صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں وہ ترجمہ کے بارے میں کچھ گفتگو کریں گے، میں نے کہا چلیے۔ انہوں نے ٹیکسی لی اور ہم دونوں مالا بار ہل پر آغا خان کے بنگلہ "لینڈس انڈ" کی طرف چل دیئے، جب ہم بنگلہ میں پہنچے تو کیپٹن مجید خاں اپنی موٹر میں بیٹھ رہے تھے، وہ اُتر آئے اور بڑے تپاک سے ملاقات کی پھر اپنی موٹر میں بٹھا کر ہم دونوں کو فورٹ لاتے جہاں آغا خان

اسٹیٹ آفس تھا۔

راستہ بھر سیاسیات حاضرہ پر باتیں ہوتی رہیں دوران گفتگو میں معلوم ہوا آغا خان کی طرح خود بھی ایرانی نژاد ہیں۔ ہز ہائی نس سے شرف قرابت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن مذہباً شیعہ ہیں آغا خانی نہیں، امیر امان اللہ خاں سابق فرمانروائے افغانستان سے بھی خاندانی تعلقات ہیں موصوف کی دونوں بہنیں انہی کے خاندان میں بیاہی گئی ہیں مسٹر جناح کی اصابت فکر، تدبر اور فہم سیاسی کے بیحد قائل ہیں اور ہندوستان کے مسائل کا واحد حل پاکستان کو سمجھتے ہیں مالابار ہل سے لیکر فورٹ تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔

اب ہم اسٹیٹ منیجر کے شاندار آفس میں تھے، یہاں کتاب کے ترجمہ و طباعت پہ گفتگو شروع ہوئی کہنے لگے، پچھلے صاحب اردو نہیں جانتے اس سے قبل کئی غلط ترجمے یہ کرا چکے ہیں اس لئے میں ترجمہ بذات خود سنکر مطمئن ہونا چاہتا ہوں اگر زحمت نہ ہو تو سنایئے، میں نے سنایا۔ پہلا باب سننے کے بعد کہا: بس اب ضرورت نہیں مطمئن ہوگیا، ماشاءاللہ (بحمدہ) بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے آپ نے، اب اس کے چھاپنے کا جلد از جلد بندوبست کیجئے اور بڑی نوازش ہو اگر اس کام کے ختم ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے، میں آپ سے بہت متاثر ہوا، میں نے شکریہ ادا کیا اس کرم گستری کا اور وعدہ کر لیا کہ ضرور حاضر ہوا کروں گا۔

ارباب دولت وثروت کے ساتھ مجلس آرائی میں مجھے لطف نہیں آتا، کیپٹن مجید خاں نے بغیر میری فرمائش کے وعدہ کیا کہ ہز ہائی نس جب بمبئی آئیں گے میں آپ کو ضرور ملاؤں گا اور وہ آپ کے کام اور میری سفارش کی بناء پہ ضرور آپ کا دو ماہہ مقرر کردیں گے میں خاموش ہو گیا، لیکن جس دن میں نے یہ خبر سنی کہ اپنی ڈائمنڈ جوبلی کے سلسلہ میں آغا خان بمبئی تشریف لارہے ہیں اس دن سے آج تک میں کیپٹن صاحب سے نہیں ملا۔ آغا خان کے دوران قیام میں اس لئے نہیں کہ وہ یہ وجہ نہ سمجھیں میں ان کا وعدہ یاد دلانے آیا ہوں اور اس کے بعد اس لئے نہیں کہ وہ خفا نہ ہوں کہ میں نے بلایا اور تم نہیں آئے، لیکن آغا خان کے بمبئی آنے سے پہلے پہلے میں بارہا کیپٹن صاحب سے ملا اور میں نے اندازہ کیا کہ دولت کے انبار میں رہنے کے باوجود مجید خان کا دل ایک مسلمان کا دل ہے، نہ غرور نہ تمکنت نہ دقار کی غلط نمائش نہ کروفر اور رعب داب کے مظاہرے۔

مجید خان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں آغا خان.

کی عدم موجودگی میں بادشاہت کرسکتے ہیں لیکن ایک مردِ مومن کی طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں اور پوری وفاداری اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں نہ غریبوں کا دل دکھاتے ہیں نہ امیروں کا دل رکھتے ہیں، سب سے مساویانہ برتاؤ اور سلوک کیا ہے ایسے دولت مند کو شاید اشتراکی حکومت بھی گوارا کرلے۔

مہاراجہ گوالیار

سادگی و پرکاری، بےخودی و ہشیاری

بمبئی میں ڈاکٹر اسحٰق، امراض دنداں کے بہترین معالج ہیں، وہ دانت اس خوبی سے نکالتے ہیں کہ چیخنے اور رونے کا موقع نہیں ملتا، اور مصنوعی دانت اس کمال سے آویزاں کرتے ہیں کہ دُرِ دنداں کی جھلک پر، بجلی کی چمک کا شبہ ہو۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی اور متعدد راہنمایانِ ملت کے دانت انہوں نے بنائے اور بہت جلد شہرت، ہر دلعزیزی اور ناموری کے اوج کمال تک پہنچ گئے، یہ جس کے دانت نکالتے ہیں، اسے ایسے مضبوط اور توانا دانت بنا کے دیتے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو ان سے "دندان آز" کا کام لے سکتا ہے۔

مجھے پائریا کی شکایت ہوئی، کئی برس تک رہی، کوئی فکر نہ کی۔ ایک مرتبہ کسی رسالہ میں پائریا کے خلاف ایک زہریلا مضمون دیکھا، رونگٹے کھڑے ہو گئے، فوراً ڈاکٹر صاحب کے مطب پہنچا انہوں نے کچھ دوائیں لکھ کر دیں۔ اور فرمایا انہیں ایک ہفتہ تک استعمال کرو، پھر پانچ اوپر کے اور چھ نیچے کے دانت نکال دیئے جائیں گے۔

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

بارہا سنا تھا، آج معلوم ہوا۔ ان سیدھے سادے الفاظ کا مفہوم کتنا ہولناک اور لرزہ خیز ہے، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، کہ بڑے خطرہ کے مقابلہ میں چھوٹے خطرہ کو قبول کر لیا جائے، پائریا کے مقابلہ میں چند دانتوں کا نکلوا دینا ہی تقاضائے دانش تھا۔

ایک ہفتہ کے بعد یہ مرحلہ گزر گیا، اس کے بعد ڈریسنگ کے لئے روزانہ مطب میں جانا پڑتا تھا، ایک روز میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا، چند اور مریض بھی تشریف فرما تھے، باری باری سے ہر مریض ڈاکٹر صاحب کے "معمل" میں جا رہا تھا، میری باری آنے میں ابھی کافی دیر تھی، اتنے میں گداز بدن کے ایک صاحب پتلون اور اس پر قمیض پہنے تشریف لائے، اور بالکل میرے

سامنے بیٹھ گئے، موٹا بدن، سانولا رنگ، چہرہ پر سنجیدگی اور متانت، میز پر سے انہوں نے اسٹر ٹیڈ
ویکلی اٹھایا، اور اسے بالکل منہ کے سامنے رکھ کر پڑھنے لگے اس صفت کے ساتھ کہ خود تو
ہر شخص کو نظر آئیں، لیکن چہرہ نہ دکھائی دے، گویا یہ اخبار نقاب کا کام دے رہا تھا مطب
میں ہر قسم کے لوگ آتے رہتے تھے، لیکن ایسی دلچسپ مخلوق آج تک نظر سے نہیں گزری تھی

اتنے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا، مطلب یہ کہ اب ہم آمادہ عمل ہیں جس
کی باری ہو وہ آئے، دفعتًا وہ بے تابی کے ساتھ یور ہائی نس، کہتے ہوئے آگے بڑھے اور جو صاحب
میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، انہیں اپنے ساتھ اندر لے گئے، پھر بڑے اعزاز و کرام
کے ساتھ انہیں رخصت کرنے نیچے تک گئے۔ جب میری باری آئی، اور میں اندر گیا تو معلوم
ہوا یہ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب گوالیار تھے۔

ڈاکٹر صاحب ان کی سادگی کی تعریف فرمارہے تھے، اور میں ان کی کفایت شعاری کی
داد دے رہا تھا، ڈاکٹر کو گوالیار پیلیس میں بلوانا، یا خود اس کے مطب میں آجانا، نتیجہ
دونوں کا ایک ہے، لیکن پہلی صورت اسراف کی حد میں آتی ہے اور دوسری کفایت کی حد میں!

احد حسین قدوائی

فرنگی محل کا ایک دلچسپ واقعہ!

لکھنؤ میں خلافت کے کسی میلہ کی جب تیاریاں ہوتیں، تو ایک صاحب موٹر سائیکل پر پھٹا پھٹ پھٹا پھٹ کرتے ہوئے اور اسے بے تحاشہ بھگاتے ہوئے ندوہ تشریف لاتے اور بورڈنگ میں آکر رضا کاروں کی دریوزہ گری شروع کر دیتے، ننھا سا قد، دبلا بدن، چہرہ پر چیچک کے "باقیات الصالحات" شیروانی اور پاجامے پر ہیٹ لگائے ہوئے آتے، اور طلب و تقاضا شروع کر دیتے، جس طرح دیہاتوں میں حکومت کے آوردے، نوجوان اور تندرست دیہاتیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی مہم شروع کرتے ہیں، بس بالکل وہی انداز تھا، ہمارے ہیرو احد حسین قدوائی کا، جو ٹینس کے اپنے وقت میں بہترین کھلاڑی مانے جاتے تھے، اور جن کی شہرت لکھنؤ سے اُڑ کر نینی تال اور منصوری کی سیر کرتی ہوئی بہت آگے نکل گئی تھی۔

ایک مرتبہ نگاہِ انتخاب مجھ پر بھی پڑ گئی، فرمایا آپ رضا کار کیوں نہیں بنتے؟ میں نے کہا "آپ بنا کے تو دیکھئے!" ہنسے اور میرا نام بھی فہرست میں لکھ لیا۔

ہم ندوہ کے طالب علموں کی ڈیوٹی جلسہ ائے فرنگی محل میں لگائی گئی، مہمانوں کی خاطر و مدارات اور دیکھ بھال ہمارے فرائض میں داخل تھی، مولانا شوکت علی نے ایک دعوت نامہ جاری کیا تھا جو کئی سو معززین شہر کو، ایک فوری جلسۂ عام کی شرکت کے سلسلہ میں بھیجا جانے والا تھا، نام اور پتہ کی فہرست مولانا احد صاحب کے حوالہ کی، اور احد صاحب نے وہ فہرست، دعوت ناموں کا بنڈل، اور بہت سے لفافے لاکر میرے سامنے رکھ دیئے، جیش رضا کاراں کے سالار وہی تھے، میں نے فوراً تعمیلِ ارشاد شروع کر دی

چائے کا وقت گذرا جا رہا تھا، اور باورچی کے ہاں سے دودھ میں پکی ہوئی کاغذی شیرمالیں ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ احد صاحب کئی رضا کاروں سے فرمائش کر چکے تھے، اور وہ ٹال گئے آخر۔

نزلہ بر عضوِ ضعیف می ریزد

اُنہوں نے مجھے حکم دیا، جائیے شیروالیں لے آئیے۔ میں اپنے کام میں منہمک تھا میں نے کہا، میں کام کر رہا ہوں، فرمایا، یہ بھی تو کام ہے، میں نے عرض کیا کسی اور کو بھیج دیجئے، ارشاد ہوا، یہ میرا کام ہے کسے بھیجوں اور کسے نہ بھیجوں، میں نے کہا۔ میں نہیں جاؤں گا، حکم ہوا، آپ واپس تشریف لے جائیے، اب آپ رضاکار نہیں رہے، میں نے تمام لفافے اور دعوت نامے، ہاتھ مار کر نیچے پھینک دیئے، اور کہا، آپ سمجھتے کیا ہیں؟ میں جاتا ہوں ، ابراہیم ہیوبالی صاحب کی حمیت جوش میں آگئی، اُنہوں نے کہا لعنت اس رضاکاری پر، میں بھی چلتا ہوں۔ چند اور دوست سن گن پاکر آگئے، انہوں نے کہا، ہم بھی جاتے ہیں سنبھالیئے، اپنی سالاری، ان اعلانات کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ تھا کہ محلسرا رضاکاروں سے خالی ہوتی جارہی ہے، اور جتنا کریڈٹ مولانا شوکت علی کی طرف سے اب تک مل چکا تھا، سب چھن جانے والا ہے۔ لہٰذا تمتمایا ہوا چہرہ مسکرانے لگا اور ایک کامیاب کھلاڑی کی طرح جارحانہ حملہ ترک کرکے شاندار پسپائی اختیار فرمائی، میں پھر پتے لکھنے لگا، ابراہیم پھر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑنے لگے، دوسرے ساتھی، پھر ڈیوٹی پر حاضر ہوگئے، تین دن تک میں فرنگی محل میں رہا، لیکن احمد صاحب نے مڑکر بھی پھر کبھی میری طرف نہیں دیکھا۔

مسٹر علی حسن!

ہندوستان کا مشہور کرکٹر

مسٹر علی حسن علی گڑھ کے دورِ اوّل کے مانے ہوئے کرکٹر تھے، مولانا شوکت علی کے زمانۂ طالب علمی کے رفیق، ان دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے، جو زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کی قیام گاہ پر دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی، یہ واقعہ اپریل ۱۹۳۸ء کا ہے، اور اس کی یاد اب تک قائم ہے۔

مولانا شوکت علی کے ساتھ میں مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا، لنچ کے لئے جب اجلاس برخاست ہوا، اس وقت مسٹر علی حسن (علیگ) انسپکٹر جنرل پولیس (گوالیار) اور خان بہادر مصباح العثمان پنشنر ڈپٹی کمشنر مولانا سے ملنے تشریف لائے، مسٹر علی حسن علی گڑھ کے مشہور کرکٹر ہیں، طالبعلمی کے زمانہ سے ان میں اور شوکت صاحب میں بے تکلفانہ اور عزیزانہ تعلقات قائم تھے، جب مسٹر علی حسن علی گڑھ کے ایک ہونہار طالب علم تھے، جب وہ ہند کے محکمۂ پولیس میں ایک اعلیٰ منصب پر مامور تھے، جب وہ پنشن یاب ہوئے اور ریاست گوالیار کا محکمۂ پولیس انہیں تفویض ہوا، اسی طرح جب مولانا شوکت علی علی گڑھ کے مشہور کرکٹر تھے، جب اُنہوں نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو بامِ فلک پر پہنچایا، جب وہ محکمۂ افیون کے افسرِ اعلیٰ تھے، جب وہ خلافت کے مشہور زعیم اور ہندوستان کے مسلمہ قائد تھے، جب وہ بیتول جیل کے قیدی، اور چھندواڑہ کے نظر بند تھے، جب وہ کراچی کے سزایاب اور سرفروشانِ ہند کے سردار تھے، ان دونوں کے تعلقات یوماً فیوماً ترقی ہی کرتے رہے، اب کہ دونوں عہدِ شباب ختم کر کے زمانۂ پیری میں قدم رکھ چکے تھے۔ دونوں کے درمیان وہی بے تکلفی، وہی عزیزانہ مراسم اور وہی خلوص و محبت کارفرما تھی، جو آج سے ۴۰ سال پہلے تھی۔

مسٹر علی حسن اگرچہ شوکت صاحب سے بہت بے تکلف تھے، لیکن بے تکلفی میں
بھی سنجیدگی اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک کرکٹر اور علی گڑھ کرکٹ ٹیم
کے کپتان کی حیثیت سے مسٹر علی حسن کے متعدد گروپ فوٹو مولانا شوکت علی کے کمرہ ——
خلافت ہاؤس اور رامپور —— میں آویزاں رہتے تھے، عہد شباب اور عہد پیری کی تصویر
میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں، اگرچہ:

عہدِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

غوث محمد

ٹینس کا بہترین کھلاڑی

ایک زمانہ تھا کہ لوگ شمشیر زنی، شہسواری، تیر اندازی، کشتی، بنوٹ جیسے کھیلوں کو بازی گاہ حیات میں سب پر فوقیت دیتے تھے، لیکن وہ زمانہ ختم ہوگیا اب ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، بیڈ منٹن اور ٹینس وغیرہ کا دور دورہ ہے۔

دور مجنوں گزشت نوبت ماست!

ان فنونِ عالیہ میں لوگ دسترس حاصل کرتے ہیں، اور چیمپئن بن جاتے ہیں۔

غوث محمد ملیح آباد کے رہنے والے ہیں، خوب رو اور خوش اندام ہیں۔ ہندوستان میں ٹینس کے چیمپئن مانے جاتے ہیں، ان کا کھیل دیکھنے کے لئے دور دور سے قدر دانانِ فن آتے ہیں، دیکھتے ہیں اور بے خود ہو ہو کر داد دیتے ہیں، یہ معلوم ہو جائے کہ آج کے میچ میں غوث محمد حصہ لے رہے ہیں، تو عجیب منظر ہوتا ہے۔

خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

کہتے ہیں، کہ قدرت نے ان کے دستِ نازک کو کچھ ایسی لوچ اور لچک دی ہے، کہ گیند ان کی زد سے بچ ہی نہیں پاتا، یہ لپک کر، بڑھ کر، پیچھے ہٹ کر، جھول کھا کر، مڑ کر، اچک کر، جھک کر، اچھل کر، پلٹ کر ایسے ایسے ہاتھ دکھاتے ہیں کہ گیند کے لئے سوائے تسلیم خم کر دینے کے کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا۔ تماشائی دنگ رہ جاتے ہیں، حریف ششدر، ان کی مرجعیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بمبئی کی ایک بہت بڑی ٹینس کی دوکان پر بورڈ لگا ہے، جس پر لکھا ہے "اگر غوث محمد کی طرح کھیلنا چاہتے ہو، تو اس دکان سے مال خریدو۔"

وکٹوریہ ٹرمینس پر ایک مرتبہ میں ایک دوست کو رخصت کرنے گیا، اسی گاڑی سے غوث محمد بھی جا رہے تھے، ایک اور دوست نے لپک کر ان سے مصافحہ کیا اور ہاتھ پکڑے پکڑے میرے سامنے گھسیٹ لائے، آپ سے ملیے، یہ ہیں مسٹر غوث محمد، ایک وجیہہ اور

خوش شمائل نوجوان سامنے کھڑا تھا۔

جب تک گاڑی چھوٹ نہیں گئی پلیٹ فارم پر گفتگو ہوتی رہی۔ کھلاڑی بھی عام طور پر فوجیوں کی طرح اکھڑ ہوتے ہیں، لیکن غوث محمد کو میں نے بہت شائستہ بااخلاق اور نستعلیق پایا، ایسا معلوم ہوتا ہے اسے احساس ہی نہیں ہے کہ وہ کھیل کے اسٹیج کا ہیرو ہے، اور اس کا "پارٹ" خلقت سے خراج تحسین حاصل کرتا رہتا ہے۔ نہ تمکنت نہ تعلی نہ غرور نہ نمائش، سادگی، شائستگی، متانت، حسنِ اخلاق جن لوگوں کے اوصاف ہوتے ہیں وہ بدرجۂ اتم اس شخص میں موجود تھے، جو اپنی دنیا کے "اکابر" میں شمار ہوتا ہے، یہ چیز واقعی حیرت انگیز تھی، اور ناقابلِ فراموش بھی۔

شہزادی سلمیٰ

ایک لٹے ہوئے قافلہ کی گرد راہ!

مولانا شوکت علی مغفور خلافتِ اسلامیہ کے پرستار تھے، ان کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ عزل خلافت عثمانیہ کے بعد بھی منہاج خلافت راشدہ پر ایک نظام ہندوستان اور عالم اسلام میں قائم ہو، اسی مقصد عزیز کی خاطر، انہوں نے تحریک خلافت کا آغاز کیا، مجلس خلافت قائم کی، اور اس ادارہ اور اس تحریک کو انہوں نے اپنی بے پناہ قربِ عمل سے ایک زندہ فعال اور دہشت انگیز انسٹی ٹیوشن کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

خلافت کا نام ان کی بالیدگی روح کا سبب تھا، معزول خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید سے بھی انہیں والہانہ شیفتگی تھی، اور یہ اسی تعلق خاطر، اور شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انہوں نے ۱۹۳۰ء میں جب لندن کا سفر اختیار کیا، تو یہ پیرس بھی گئے خلیفۃ المسلمین سے بھی ملے، تو ان کے عاشق جانباز بن گئے، اور انہیں اپنا گرویدہ اور مفتون بنا لیا، اور پھر بیچ میں پڑ کر ہر طرح کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو آسان بنا کے خانوادۂ آصفی کے دو نوجوان (پرنس اعظم جاہ) ـــــ اب پرنس آف برار ـــــ اور پرنس معظم جاہ) سے خلیفۃ المسلمین کی دختر بلند اختر شہزادی درشہوار اور بھانجی شہزادی نیلوفر کی شادی کرا دی اور اس طرح انہوں نے ایک بڑی شریفانہ اور یادگار خدمت انجام دی، جس پر خود انہیں بھی فخر تھا، اور بجا فخر تھا۔

۱۹۳۵ء میں اسی خاندان کی ایک فرد شہزادی سلمیٰ، زمانہ کے دکھ سہتے سہتے عسرت اور فلاکت کے عالم میں تشریف لائیں، سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، موتی کے سے سفید دانت، وضع و لباس و معاشرت، انگریزی، لیکن دل مسلمان، دماغ مسلمان کوئی اجنبی دیکھے تو یہ سمجھے، کوئی فرنگن سامنے کھڑی ہے باتوں کا موقع ملے تو معلوم ہو

ایمان اور اسلام، وضع و لباس کا قطعاً پابند نہیں ہے یہ آتے ہی مولانا شوکت علی سے ملیں اور انہوں نے دیکھتے ہی اپنی چہیتی بیٹی بنا لیا تھا یہ کہ ایک انگریز خاندان میں جو پاس ہو کہ ہوٹل میں رکھا کرتا تھا ان کے قیام کا بندوبست کیا، اور اس فکر میں پریشان ہونے لگے، کہ کاروان خلافت کی یہ گرد راہ جو باد حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہوئی ہندوستان پہنچی ہے، کہیں مٹ نہ جائے چمن خلافت کا یہ خزاں رسیدہ پھول کہیں ایسا نہ ہو، کملا جائے، مرجھا جائے وہ چاہتے تھے، شہزادی سلمیٰ کا کوئی ایسا بندوبست ہو جائے کہ وہ اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے لگیں، کسی مزید اقدام سے پہلے مقدم ضرورت یہ تھی کہ ان کی مالی حالت درست کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے مخصوص احباب سے تحریک کی۔ راجہ صاحب نانپارہ اس زمانہ میں بمبئی آئے ہوئے تھے، انہوں نے ایک معقول رقم نذر کی، راجہ صاحب محمود آباد نے بھی اپنی حیثیت کو فراموش کر کے، اور شہزادی کی موجودہ حیثیت کو مدنظر رکھ کر کچھ مدد کی۔ بہرحال خطوط کے ذریعہ شوکت صاحب نے یہ مہم شروع کی اور اسے بڑی سرگرمی اور مستعدی سے جاری رکھا۔

شدہ شدہ، یہ خبر بمبئی کے مشہور اور مرحوم تاجر عبدالقادر باڑلا کی والدہ کو ہوئی، انہوں نے ایک روز شہزادی کو اپنے ہاں مدعو کیا، اور ان سے ملاقات کرنے کے لئے شہر کی دوسری معزز اور متمول خواتین کو بھی دعوت دی، وقت مقررہ پر شہزادی وہاں پہنچ گئیں، باڑلا کی والدہ نے ان کا پرجوش خیرمقدم کیا، گلے ملتے وقت ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں، شاید وہ سوچ رہی تھیں، زمانہ کو بدلتے، پھولوں کی سیج پر سونے والوں کو، کانٹوں کا تاج پہنتے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی، ابھی چند سال پہلے یہ شہزادی خواصوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں چاند کو شرماتی ہوئی اور کہکشاں کو سکتہ میں ڈالتی ہوئی، نگاہ روبرو، اور باادب، باملاحظہ ہوشیار کے نعروں سے کھیلتی ہوئی بادِ نسیم کی طرح اٹکھیلیاں کرتی اور موج دریا کی طرح بل کھاتی، ہیرے جواہرات میں غرق، اور سونے چاندی کے پھولوں سے لدی ہوئی یکسر باغ و بہار بن کر نکلتی ہو گی، اور آج وہ ایک بے نوا خاتون ہے۔ جس کا کوئی سہارا نہیں، جس کی جیب میں زرِ نقد نہیں۔ جس کی صراحی دار گردن، جس کے خوبصورت ہاتھ، جس کے نازک پاؤں زیور سے محروم ہیں۔ جو ہر وقت پھول کی طرح کھلی رہتی ہو گی، وہ آج ایک مرجھائی ہوئی کلی کی طرح یکسر افسردگی و حسرت بنی

ہوئی ہے۔

مہمان خواتین آنا شروع ہوئیں، سب نے شہزادی کو دیکھا۔ دعوت کے بعد باڈلا کی والدہ صاحبہ نے شہزادی کی خدمت میں کیٹہ زر پیش کرنے کے لئے چندہ کی تحریک کی، موقع یقیناً اچھا تھا، ہزاروں روپے بڑی آسانی سے جمع ہو جاتے، لیکن غیور اور خوددار شہزادی کی چڑھی ہوئی تیوریوں نے یہ اسکیم درہم برہم کردی، اس نے کہا، میں اپنے بعض ہمدردوں کے عطایا قبول کرلیتی ہوں لیکن چندے کی آمدنی پر جو زندگی بسر ہو، اس پر میں موت کو ترجیح دیتی ہوں، میزبانوں کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں اور غریب مہمان دبدبۂ شاہی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا، اور روانہ ہوگیا ــــــ میں نے پہلے پہل جب شوکت صاحب کے پاس شہزادی سلمیٰ کو دیکھا تھا، تو ان کی وضع و تراش دیکھ کر میں نے قطعاً کوئی اچھی رائے ان کے بارے میں نہیں قائم کی تھی، لیکن اس واقعہ نے میرے دل میں ان کی عزت پیدا کردی۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ میرے علم میں آیا، اور اس نے شہزادی کی عزت کو عظمت میں بدل دیا۔

خلافیہ کی مہمان سرا میں، ایک قبول صورت، دولت مند، با اخلاق، اور مجلس آرا انگریز تاجر آیا کرتا تھا، وہ شہزادی کی طرف متوجہ ہوا، اکثر آنے لگا، اکثر ملنے لگا بیٹھتا تو اٹھنے کا نام نہ لیتا، باتیں کرتا، تو زبان چلتی ہی رہتی، اور کہہ دیا اگر تم میری بن جاؤ، تو میں سمجھ لوں دنیا کی سب سے بڑی نعمت مجھے مل گئی۔

شہزادی نے اس کی باتیں سنیں اور کہا، اس خیالِ خام کو دل سے نکال دو، اس جرأت بیجا کا مظاہرہ آئندہ کبھی نہیں ہونا چاہیے، میں مسلمان ہوں اور اسلام اسے ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ ایک مسلمہ کسی غیر مسلم سے عقد کرلے، صرف ایک مسلمان ہی میری تمنا کرسکتا ہے، تم اگر مسلمان ہوتے تو تمہیں حق تھا کہ مجھے کنوینس کرنے کی کوشش کرتے، پھر بھی میں کہہ نہیں سکتی میرا جواب کیا ہوتا؟ ــــــ یہ دوٹوک بات شہزادی کر رہی تھی، اور اس دولت فراواں کو، وہ ٹھکرا رہی تھی جس کی جھولی سیم و زر کے سکوں سے خالی تھی، لیکن جس کا دل دولت ایمان سے معمور تھا، جو غربت کی زندگی اور تاریک مستقبل پر دولت و ثروت کی زندگی اور رنگین و روشن مستقبل کو قربان کر

رہی تھی، کیا یہ واقعہ اسے باعظمت بنا دینے کے لیئے کافی نہ تھا!

اب مولانا شوکت علی مرکزی اسمبلی کے ممبر ہو چکے تھے، اور دہلی میں مسلسل اس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ چنانچہ وہ بمبئی سے دہلی چلے گئے، اور کچھ روز بعد شہزادی سلمٰی بھی اپنے شفیق اور کرم گستر "باپ" کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کے لیئے دہلی پہنچ گیئں۔

دہلی میں راجہ سید ساجد حسین تعلقدار کٹوارہ بھی پہنچے ہوئے تھے، ابھی نابالغ تھے کہ والدین کا انتقال ہو گیا، تعلقہ کورٹ ہو گیا، خود تکمیل تعلیم کے لیئے انگلستان چلے گئے، اور چھوٹی بہن ڈیرہ دون کے کیمبرج اسکول میں بھیج دی گیئں۔ کئی سال بعد انگلستان سے واپس آئے، تعلقہ کا چارج لیا، اور اب سیر و سیاحت کیلئے دہلی آئے ہوئے تھے۔

مولانا شوکت علی نے شہزادی سلمٰی سے انہیں ملایا، وہ ملے، آنکھیں ملیں اور دل بھی مل گیا۔ وہ اب شہزادی کے پرستار تھے، اور ان کی تمنا یہ تھی کہ شہزادی ان کے حبالۂ عقد میں آ جائیں، تاکہ ان کا اُجڑا ہوا گھر آباد ہو سکے، ان کا محبت زدہ دل تسکین پا سکے، ان کی بیتاب آرزوئیں سکون و قرار سے ہم آغوش ہوں۔

مولانا شوکت علی نے اپنی سفارش کے ساتھ راجہ صاحب کی یہ درخواست شہزادی کے حضور میں پیش کر دی۔ انہوں نے کچھ روز کے فکر و تامل کے بعد یہ رشتہ منظور کر لیا، اب دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، راجہ صاحب شیعی عقائد رکھتے تھے، مولانا شوکت علی اس سے واقف تھے، لیکن اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، شہزادی ناواقف تھیں، اور اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھی گئی، کہ اس طرف انہیں متوجہ کیا جائے۔

شادی سے کچھ پہلے یہ واقعہ شہزادی کو معلوم ہو گیا، اور انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا، لوگوں نے لاکھ سمجھایا، "مقدس باپ" (مولانا شوکت علی) نے لاکھ زور مارا، لیکن شہزادی کی نہیں کو ہاں سے کوئی نہ بدل سکا، دفعتہً راجہ صاحب نمودار ہوئے، اور انہوں نے اعلان کیا، میں عقائد اہلسنت کو قبول کرتا ہوں، اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی، شہزادی نے منظوری دی، اور نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ دہلی کے معززین، اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ممبروں، ہندوستان کے ہماڈل اور لیڈروں کی موجودگی میں

یہ مبارک رسم انجام پائی۔

عشق از یں بسیار کردست و کند!

کچھ روز بعد، یہ جوڑا ماہ عسل منانے کے لیے ملک شام کے سفر پر روانہ ہوا، بمبئی کے خلافت ہاؤس میں اس قافلہ نے منزل کی ـــــ میں نے دیکھا، دونوں بہت خوش تھے، اور چند روز بعد بیروت روانہ ہو گئے!

میں آج نہ کوئی رعنائی ہے نہ زیبائی نہ دلکشی ہے، نہ سحر طرازی، اپنے زمانہ میں کیا کچھ نہ تھا یہ سے رس آنکھیں جس طرف اٹھ جاتی تھیں قتل عام شروع ہو جاتا تھا ـــــ میں اپنے حافظہ میں تاریخ ماضی کے یہ اوراق اُلٹ رہا تھا، کہ عطیہ بیگم نے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا" آپ تو آج پہلی بار ہمارے ہاں آئے ہیں، آیئے میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔"

میں ساتھ ہولیا، اور عطیہ بیگم نے اپنے شاندار اور یادگار محل کی سیر کرانا شروع کی، سنگ مرمر کی خوشنما جالیاں، نقرئی وطلائی ظروف، بیش قیمت قالین، نظروں کو تازگی بخشنے والا ساز وسامان اس نظارہ سے فارغ ہو کر وہ اپنی آرٹ گیلری میں ہمیں لے گئیں، یہاں ان کے شوہر نامدار سابق یہودی اور حال مسلمان مسٹر رحمین فیضی کے موقلم کے شاہکار موجود تھے، میں کوئی آرٹسٹ نہیں ہوں لیکن ان کے کمال فن کو دیکھ کر دل ہی دل میں عش عش کر رہا تھا، یہ وہی مسٹر رحمین فیضی ہیں جن کے بارے میں علامہ شبلی مرحوم نے کہا تھا۔

بتان ہند کافر کو لیا کرتے تھے مسلم کو

عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

نگاہ شوق کی رہنمائی میں ہم اور آگے بڑھے، سامنے ایک قدِ آدم تصویر آویزاں تھی، تصویر کیا تھی، حسن وجمال اور رعنائی وزیبائی، دلکشی وفسوں طرازی کا ایک پیکر خاموش تھی۔

بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

نرگس شہلا کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، گل تر کی طرح شگفتہ اور رنگین چہرہ، مار سیاہ کی طرح بڑی بڑی ـــــ اور بڑے بڑے دلوں کو اسیر کر لینے والی ـــــ زلفیں، جوانی تھی کہ بھٹی پڑ رہی تھی، شباب تھا کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا، نشہ تھا، کہ سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی، یہ تصویر کسی فانی ہستی کی نہ تھی یہ تصویر تھی، حسن کی، شباب کی، ـــــ حسن عالم آشوب کی، شباب لازوال کی! ـــــ

عطیہ بیگم چلتے چلتے ٹھٹکیں، مسکرائیں، اور تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولیں، پہچانئے یہ تصویر کس کی ہے؟"

میں ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا، کہ مولانا عرفان نے لقمہ دیا" آپ کے سوا کس کی ہو سکتی ہے" وہ مسکرائیں اور

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!

کھنچی ہوئی آگے بڑھ گئیں! اور بس سوچتا رہ گیا کہ کون یقین کرے گا، کہ یہ جھُریاں پڑا ہوا بے آب و رنگ چہرہ، خمیدہ کمر، بے رس آنکھیں، یہ ضعیف اور کہنہ جسم کبھی یکسر شراب تھا!

آرٹ گیلری سے ہم باہر نکلے، تو عطیہ بیگم نے کہا: چلئے دیر ہو رہی ہے۔ جلسہ کا وقت ہو گیا!" آج عطیہ بیگم کے قائم کئے ہوتے "تھری آرٹ سرکل" کا جلسہ تھا، جس کے اجزا تھے ـــــ رقص، موسیقی اور نغمہ ـــــ

ہم لوگ کوٹھی کے عقب میں پہنچے، تو یہاں ایک نئی دُنیا نظر آئی۔ ایک نہایت وسیع اور سرسبز و شاداب لان تھا جس پر میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، اور حدِ نظر تک سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا!

اس جلسہ میں بڑے بڑے گھرانوں کی ہندو، مسلم، پارسی خواتین اور دوشیزائیں رونق افروز تھیں، وہ ان کا آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا حسن، وہ ان کی دل کو لبھا لینے والی ادائیں، وہ ان کی زلفِ دوتا، وہ ان کی ساقِ بلوریں، وہ ان کی ساعدِ سیمیں، وہ ان کے لال لال ہونٹ، وہ ان کی مدبھری آنکھیں، وہ ان کا جاں نواز تبسم، وہ ان کی طرح دار ادائیں، وہ ان کا بننا اور بیٹھنا، وہ ان کا ہنسنا اور بولنا، وہ ان کی حجاب آمیز بیباکی، وہ ان کا بیباک حجاب ـــــ ایک ایسا منظر تھا، جسے چشمِ تماشائی نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آج کی مجلس میں نغمہ و موسیقی کے چند اساتذہ اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرنے والے تھے۔ ابھی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک دبلی پتلی خاتون تشریف لائیں، رنگ سانولا ریشمی ساڑی میں ملبوس، ان کے پیچھے پیچھے ایک خوش پوش نوجوان، زنجیر ہاتھ میں اور کُتّا ساتھ ساتھ، سارا مجمع سروقد تعظیم کو کھڑا ہو گیا، معلوم ہوا یہ صاحبزادی نواب بھوپال کی دختر بلند اختر ہیں، اور یہ نوجوان نواب صاحب کے بھتیجے اور داماد۔

اب کمالاتِ موسیقی کا مظاہرہ شروع ہوا، میرے پاس مولانا عرفان تھے اور ان کے پاس اٹالیہ کا قونصل، مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے، وہ اُردو نہیں جانتا تھا، لیکن مولانا کو ضد تھی کہ انگریزی میں باتیں کریں گے، اور اسے اصرار تھا کہ اردو میں اپنا مافی الضمیر ادا کرے گا، دونوں ناکام ہوتے لیکن ہار ماننے پر کوئی بھی تیار نہیں تھا، اتنے میں عطیہ بیگم اُٹھیں اور انہوں نے چٹکی بجا کر کہا تماشا ختم، بس پھر ـــــ ایک فلک شگاف قہقہہ کے ساتھ جلسہ برخاست ہو گیا۔